فکشن ہاؤس
18- مزنگ روڈ' لاہور

مجلّہ ''تاریخ'' کی سال میں چار اشاعتیں ہوں گی

خط و کتابت (برائے مضامین)

بلاک 1، اپارٹمنٹ ایف - برج کالونی، لاہور کینٹ
فون :6665997
ای میل : .lena@brain.net.pk

خط و کتابت (برائے سرکیولیشن)

فکشن ہاؤس
18- مزنگ روڈ، لاہور
فون ☜ 7249218-7237430

قیمت فی شمارہ ☜ 100روپے
سالانہ ☜ 400روپے
قیمت مجلد شمارہ ☜ 150روپے
بیرون ممالک ☜ 2000روپے (سالانہ معہ ڈاک خرچ)
رقم بذریعہ بنک ڈرافٹ بنام فکشن ہاؤس لاہور، پاکستان

اہتمام ☜ ظہور احمد خاں
کمپوزنگ ☜ فکشن کمپوزنگ سنٹر، لاہور
پرنٹرز ☜ زاہد بشیر پرنٹرز، لاہور
تاریخ اشاعت ☜ جولائی 2002ء

فہرست

رنجیت سنگھ

سر لیپل گرفن

ترجمہ : مولوی نظیر حسین فاروقی

ابتدائیہ

سہ ماہی مجلہ "تاریخ" کی جانب سے 17 مارچ 2002ء میں نیشنل کالج آف آرٹس لاہور میں "پنجاب اور سکھ تاریخ" پر ایک روزہ کانفرنس ہوئی۔ اس میں پڑھے جانے والے مقالات اس شمارہ میں شامل ہیں۔ ان کے علاوہ سکھ تاریخ سے متعلق دوسرے مضامین کا ترجمہ بھی کرایا گیا تاکہ اس دور کی واضح تصویر سامنے آ سکے۔

سہ ماہی "تاریخ" ان تمام مصنّفین کا مشکور ہے کہ جنہوں نے کانفرنس میں مقالات پڑھے اور ان دوستوں کا بھی کہ جنہوں نے مضامین کے ترجمے کیے۔ ہم نیشنل کالج آف آرٹس کے بھی مشکور ہیں کہ انہوں نے اس کانفرنس میں ہمارے ساتھ تعاون کیا۔

ڈاکٹر مبارک علی

جولائی 2002ء

لاہور

سکھ مذہب اور تاریخ پر ایک نظر

ڈاکٹر مبارک علی

خواتین و حضرات!

پنجاب اور سکھ تاریخ پر اس کانفرنس کا مقصد یہ ہے کہ سکھ مذہب اور تاریخ کے بارے میں ہمارے ہاں جو بے اعتنائی اور خاموشی ہے اسے توڑا جائے کیونکہ یہ عہد ہماری تاریخ کا حصہ ہے۔ اس لیے ضروری ہے کہ اس بارے میں پوری آگہی ہو۔ چونکہ سکھ دور حکومت کے بارے میں ہماری معلومات محدود ہیں۔ یہ نہ تو نصاب میں پڑھایا جاتا ہے اور نہ ہی اس پر ہمارے ہاں کوئی تحقیق ہوئی ہے۔ اس لیے بہت سی غلط فہمیاں مسلمانوں اور سکھوں میں پائی جاتی ہیں۔

چونکہ ہم سکھوں کی مذہبی و سیاسی سرگرمیوں کو دہلی سلطنت کے مرکزی نقطہ نظر سے پڑھتے اور سمجھتے ہیں اس لیے ہماری نظروں میں سکھ باغی' سرکش' انتشار پھیلانے والے، اور سیاسی مجرم ہیں جنھوں نے دہلی کی مرکزی حکومت کے خلاف بغاوت کر کے پنجاب، کو سیاسی ابتری اور اقتصادی بدحالی میں مبتلا کر دیا تھا اگر اس تاریخ کو سکھوں کے نقطہ نظر سے دیکھا جائے تو ان کی بغاوتیں مرکز کے جبر و تشدد کے خلاف ان کا ردعمل تھیں۔ بحیثیت ایک جماعت کہ ان کی خواہشات ان بغاوتوں میں ابھریں کہ جن کے تحت وہ سیاسی اقتدار حاصل کر کے خود مختار ہونا چاہتے تھے۔ اس سیاسی اقتدار کی جنگ میں مذہب اور سیاست کا باہم اشتراک ہو جاتا ہے۔

پنجاب کے مسلمانوں کے نقطہ نظر سے سکھ دور حکومت میں ان پر مذہبی پابندیاں عائد کی گئیں اور انہیں پس ماندہ رکھا گیا تھا جب کہ سکھوں کی نظر میں ان کی حکومت

رواداری کی حامل تھی۔ لیکن رنجیت سنگھ کی وفات کے بعد جو دور انتشار آیا' اس نے سکھوں کی حکومت اور ان کے انتظام سے لوگوں کو اس قدر بددل کر دیا تھا کہ جب یہاں انگریز حکومت قائم ہوئی تو عام طور سے اس کا خیر مقدم کیا گیا۔

(1)

اس کے بعد میں سکھ مذہب اور تاریخ کے بارے میں کچھ کہوں گا۔ سکھ مذہب اور اس کی تاریخ و ارتقاء کو سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ ان حالات و ماحول کا جائزہ لیا جائے کہ جن میں اس کی ابتداء ہوئی' تیرہویں صدی کا ہندوستان اس لحاظ سے قابل ذکر ہے کہ اس دور میں یہاں ترکوں نے اپنی سلطنت قائم کی۔ ترک سلطنت کے قیام نے ہندوستان کی سیاست اور سماجی ساخت کو انقلابی طور پر بدلا۔ دہلی کی مرکزی سلطنت کے قیام اور اس کی فتوحات نے چھوٹی چھوٹی سلطنتوں کا خاتمہ کر دیا' جس کی وجہ سے راجاؤں اور چھوٹے حکمرانوں کی خانہ جنگیوں سے ملک کو نجات ملی۔

نئی سلطنت کے قیام نے ایک ایسے معاشرے کی بنیاد ڈالی کہ جس میں کئی کلچر اور ثقافتیں تھیں' ان میں جہاں باہمی کش مکش و تصادم تھا' وہیں اشتراک و ملاپ بھی ہوا کہ جس نے رواداری اور عدم تشدد کو پیدا کیا' ہندوستان کے سماجی ڈھانچہ میں اس وقت تبدیلی آئی کہ جب برہمنوں کی ریاستی سرپرستی نہیں رہی' اور کشتری ذات کے علاوہ دوسری ذات کے لوگوں نے فوج میں شامل ہو کر ذات کی ان پابندیوں کو توڑ دیا کہ جس کے تحت صرف کشتری جنگ کے قابل تھے ترکوں کے اقتدار اور کابل و غزنہ و وسط ایشیا سے ان کے تعلقات نے تجارتی راستوں کو محفوظ بنا دیا' جس نے تجارت کو فروغ دیا' تاجر طبقہ کو خوش حال بنایا۔ ترک حکمراں طبقوں نے شہروں کی ترقی میں خصوصی دلچسپی لی' جس کی وجہ سے ایک ایسا شہری کلچر پیدا ہوا کہ جس میں ہنرمندوں' کاریگروں اور دست کاروں کی اہمیت بڑھ گئی۔

ترک سیاسی و سماجی اداروں کے ساتھ ساتھ ٹکنالوجی بھی لے کر آئے۔ اس کی وجہ سے نہ صرف دستکاروں کو نئے اوزار اور آلات سے اپنے پیشوں میں فائدہ ہوا جس

کی وجہ سے انہوں نے ترقی کی' کاشتکاروں کو بھی ایرانی طرز کے رہٹ سے فائدہ ہوا' اور زراعتی پیداوار میں اضافہ ہوا۔ اب دیہاتوں میں جاگیرداروں کے ساتھ دولت مند کاشت کار بھی تھے۔ بادشاہ و امراء کے کارخانہ جات نے جولاہوں' سناروں' اسلحہ بنانے والوں' رنگریزوں اور دوسری نچلی ذات کے لوگوں کا سماجی رتبہ بڑھا دیا۔ جب فارسی دربار اور انتظامیہ کی زبان ہوئی تو اس نے سنسکرت کے اثر کو کم کر دیا' اس کی وجہ سے مقامی زبانوں کو ترقی ہوئی۔

سماجی ساخت میں تبدیلی کا نتیجہ تھا کہ یہاں تیرہویں صدی میں پھیلنے والی بھگتی تحریک دست کاروں' ہنرمندوں' اور نچلی ذات کے لوگوں میں مقبول ہوئی' انہوں نے طبقہ اعلیٰ کے کلچر اور ان کے مذہب پر ردعمل کا اظہار کرتے ہوئے ان سے انحراف کیا۔ کیونکہ اس تحریک میں اکثریت دکانداروں' مزدوروں اور مختلف پیشوں سے تعلق رکھنے والی تھی' اس لیے انہوں نے کتابی علم کا مذاق اڑایا۔ مولوی اور برہمن کے اختیارات سے انکار کیا اور عام لوگوں میں اعتماد کا جذبہ پیدا کیا۔

بھگتی تحریک کے اثرات ہندوستان کے مختلف علاقوں میں علیحدہ علیحدہ طور پر ہوئے' مثلاً مہاراشٹر میں بھگتی تحریک کے ایک رہنما رام داس نے مغلوں کے خلاف آزادی کی جدوجہد شروع کی۔ جس کی حمایت مہاراشٹر کے جاگیردار' زمیندار اور سماجی و معاشی طور پر طاقتور طبقوں نے کی جو کہ بالاخر شیواجی کی بغاوت اور مرہٹہ ریاست کے قیام کا باعث بنی۔

پنجاب میں گرو نانک (وفات : 1539) کی تعلیمات اقتدار کے جدوجہد یا حصول کے لیے نہیں تھیں۔ وہ حکومت اور حکمراں طبقوں سے ناخوش تھے' پنجاب میں سیاسی طور پر جو بدامنی تھی' اس کا شکار یہاں کے عام لوگ ہو رہے تھے' غیر مسلمانوں سے جزیہ لینا' زیارت گاہوں پر ٹیکس لگانا' زمیندار اور مقدموں کا اپنی رعیت کا استحصال کرنا' اس نے سیاسی طور پر اس عہد کو "کلیوگ" بنا دیا تھا' لہٰذا ان کی تعلیمات سے جو متاثر ہوئے ان میں کھتری ذات کے لوگ تھے کہ جو تجارت و کاروبار کے پیشوں کو اپنائے ہوئے تھے' اس کے بعد دست کار و ہنرمند و کاریگر تھے' اور پھر جاٹ لوگ کہ جو

کاشتکاری و زراعت میں مشغول تھے۔ مہاراشٹر کے برعکس کہ جہاں دولت مند اور طاقت ور طبقوں نے بھگتی تحریک کو اپنے سیاسی مقاصد کے لیے استعمال کیا' پنجاب میں نانک کے ماننے والے کمزور طبقات سے تھے' اس لیے انہوں نے مسلح جدوجہد کے بجائے امن و آشتی اور رواداری کی بات کی کہ جس کے سہارے یہ لوگ ظلم و استحصال کو برداشت کر سکیں۔ لیکن یہ ضرور کیا کہ ذات پات کی قیود توڑ کر اور مہنگی رسومات سے ان کو جھٹکارا دلایا تاکہ وہ سماجی اور معاشی طور پر آزاد ہو سکیں اور ان میں مساوات بھی قائم ہو سکے۔

سکھ مذہب جس کی ابتداء عدم تشدد اور رواداری کے اصولوں سے ہوئی تھی' حالات کے ساتھ اس کی ساخت میں تبدیلی آتی چلی گئی' اور جب گرو گوبند سنگھ (وفات : 1708) کی وفات ہوئی ہے تو اس وقت تک مذہب کی تشکیل مکمل ہو گئی تھی۔ اس مرحلہ پر آ کر گرو' کتاب' مذہبی زیارت گاہیں' تہوار' رسومات' سکھوں کی مذہبی علامتیں اور ان کی جماعت کے اتحاد کے تمام مراحل طے ہو چکے تھے۔ مثلاً لنگر کا رواج کہ جس میں ہر ذات پات اور طبقہ کے لوگوں کو مل کر کھانا ہوتا تھا۔ جماعت کو متحد کرنے کے لیے مسند کا قیام' زبان کے لیے گرمکھی رسم الخط اختیار کرنا' امرتسر میں مندر کی تعمیر جو کہ سکھوں کے لیے مقدس زیارت گاہ بن گیا۔ گرنتھ صاحب مقدس کتاب کی شکل اختیار کر گئی' اور 1699 میں گرو گوبند سنگھ نے "خالصہ" کے قیام کا اعلان کرتے ہوئے گروؤں کے سلسلہ کو ختم کر دیا۔

اس پورے عمل سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ کس طرح مذہب وقت اور تقاضوں کے تحت بدلتا رہتا ہے' جب سکھ جماعت میں کھتریوں کے ساتھ ساتھ جاٹوں کی ایک بڑی تعداد شامل ہوئی تو نہ صرف ان کی انفرادی قوت بڑھی' بلکہ انہیں جنگ کرنے والے لوگ بھی ملے۔ چنانچہ جیسے جیسے مذہب کی تشکیل ہوتی چلی گئی۔ اسی طرح سے سیاسی اقتدار حاصل کرنے کی خواہش بھی بڑھتی رہی۔ کیونکہ ہر مذہب کی یہ خواہش ہوتی ہے کہ اس کے پاس سیاسی اداروں کے اختیارات ہوں کہ جن کو استعمال کر کے نہ صرف اپنا تحفظ کر سکے بلکہ اپنے عقیدے کی تبلیغ بھی کرے۔

انہیں خواہشات نے سکھوں میں مذہب اور سیاست کو آپس میں ملا دیا' اور اس کا نتیجہ تھا کہ اس کا مغل حکومت سے تصادم ہوا' اس تصادم میں ان کے گرو شہید ہوئے' جس نے انہیں ان شہید گروؤں کو ہیروز کا درجہ دے کر ان کی تقلید میں قربانی کی روایت شروع ہوئی' گرو گوبند کی وفات کے بعد بندہ بہادر نے مغل حکومت کے خلاف بغاوت کی' مغل حکومت' اورنگ زیب کے بعد زوال کی حالت میں بھی ابھی اس قابل تھی کہ اس بغاوت کا خاتمہ کر سکے' اس لیے 1617 میں بندہ بہادر کے قتل پر یہ بغاوت ناکام ہوئی۔

لیکن سکھوں میں اقتدار کی یہ خواہش باقی رہی اور جیسے جیسے مغل حکومت زوال پذیر ہوتی گئی' اس طرح سے سکھوں کی طاقت میں اضافہ ہوتا چلا گیا' یہاں تک کہ 1799 میں رنجیت سنگھ نے پنجاب میں سکھ حکومت قائم کر لی۔ لیکن مذہب اور سیاست کے تقاضے کبھی ایک دوسرے کی مدد کرتے ہیں' اور کبھی اس سے علیحدہ ہو جاتے ہیں۔ رنجیت سنگھ کو جب ایک مرتبہ اقتدار مل گیا' تو 1801 میں اس نے مہاراجہ کا خطاب اختیار کر کے حکومت خود سنبھال لی اور خالصہ راج کی جگہ شخصی راج قائم کر لیا۔ اس نے سکھ مذہب سے اپنی عقیدت کو تو باقی رکھا' مگر سیاسی معاملات میں حالات و تقاضوں کے تحت حکومت کی۔

بابا نانک: شخصیت اور خیالات کا ایک جائزہ

قاضی جاوید

پنجاب نے اپنے جغرافیائی محل وقوع کی قیمت دائمی سماجی' معاشی اور سیاسی ہلچل کی صورت میں ادا کی ہے۔ لیکن پندرہویں صدی عیسوی میں یہ علاقہ ایک ہنگامہ خیز ذہنی اور ثقافتی ہلچل کی زد میں بھی آ گیا۔ دنیا کے دو اہم مذاہب' ہندو مت اور اسلام کے ماننے والوں کو اس خطے میں ایک ساتھ رہتے ہوئے صدیاں بیت گئی تھیں۔ یوں ان کی ابتدائی اجنبیت' مغائرت اور باہمی خوف کسی حد تک کم ہو گیا تھا۔ وہ ایک دوسرے کو جاننے' سمجھنے اور ایک دوسرے کے ساتھ ثقافتی لین دین کے لئے آمادہ ہو گئے تھے۔ اس آمادگی نے بھگتی تحریک کو یہاں قدم جمانے کا موقع دیا۔

بھگتی تحریک کے متعلق بہت سا کنفیوژن پایا جاتا ہے۔ (جب میں یہ کہتا ہوں تو اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ میں اس کنفیوژن کو ختم کرنے کی اہلیت رکھتا ہوں۔ نہیں۔ ایسا نہیں ہے۔ بات یہ ہے کہ اس تحریک کی نئی توجیہہ کنفیوژن میں اضافہ کا باعث بن جاتی ہے۔) لیکن بابا نانک سے آشنائی کے لئے ہم بھگتی تحریک سے دامن نہیں بچا سکتے۔ وہ اس تحریک کی تجسیم ہیں۔ یوں کہہ لیجئے کہ انہوں نے اس تحریک کے اساسی مقاصد کو اپنے نظام کی صورت دی تھی اور تاریخی معاملہ تو یہ ہے کہ وہ اس معاملے میں عظیم الشان بھگت کبیر سے بھی زیادہ طاقتور اور موثر ثابت ہوئے ہیں۔

عمومی تاثر یہ ہے کہ بھگتی تحریک شمالی ہندوستان میں ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان تعامل یعنی انٹرایکشن سے پیدا ہوئی۔ دونوں جانب ایسے گروپ موجود تھے جو ان دونوں گروہوں کو نزدیک لانے کے لئے ان کے مذہبی نظاموں میں پائے جانے والے کامن عناصر کو آگے لانا چاہ رہے تھے۔ پہل مسلمانوں نے کی۔ ان کے تصوف کے

چشتیہ اور دوسرے انسان دوست سلسلوں نے اس مہم کا آغاز کیا تھا۔ پندرہویں صدی تک یہ سلسلے شمالی ہند میں خاصے مضبوط ہو چکے تھے۔ ہندوؤں کی جانب سے اس پیش رفت کا جو جواب آیا' اس نے بھگتی تحریک کا روپ لیا۔

آج سے پچاس ساٹھ سال پہلے تک بھگتی تحریک کی یہی توجیہ مقبول تھی۔ چنانچہ ڈاکٹر تارا چند' پروفیسر ہمایوں کبیر اور عزیز احمد کا موقف یہی ہے۔ لیکن آپ جانتے ہیں کہ وہ زمانہ بیت چکا ہے۔ اب ہم ہندو مسلم امتیاز کو محض مذہبی معاملہ نہیں سمجھتے بلکہ قومی بقا کا وسیلہ بھی جانتے ہیں اس لئے کسی ایسی تاریخی تحریک کا وجود تسلیم کرنے سے گریزاں ہیں جو اس امتیاز کو زد پہنچاتی ہو۔ چنانچہ نئے پاکستانی دانش ور یہ کہتے ہیں کہ بھگتی تحریک اصل میں ہندوؤں کی روایتی دھوکہ دہی کی مہم تھی' جس کا مقصد' مسلمانوں کے جداگانہ تشخص کا خاتمہ تھا۔ بھارتیوں کا موقف اب یہ ہے کہ بھگتی تحریک خالص ہندوانہ تھی جس کی روٹس ویدک زمانے تک پھیلی ہوئی ہیں۔ یہ ہندوؤں کی اصلاحی تحریک تھی جس میں اسلامی اثرات ڈھونڈنا مغالطہ آمیز رویہ ہے۔

اچھا دوستو' اس بات میں شبہ نہ ہونا چاہئے کہ بھگتی کی تاریخ ہندو مت کی Spiritualization کی تاریخ ہے۔ یہ ایک ایسی تحریک تھی جس نے مسلم تصوف کی طرح ہندو مت کی ظاہری رسوم پرستی کو زد پہنچا کر خدا اور انسان کے مابین شخصی تعلق قائم کرنا چاہا۔ اس لحاظ سے یہ واقعی ایک قدیم تحریک ہے۔ یہاں تک کہ ایک قدیم مقدس صحیفے بھگوت پران' میں اس کی وضاحت بھی ملتی ہے۔ اس میں بھگوان کپل دیو اپنی ماں دیو ہٹی سے کہتا ہے کہ جب کوئی انسان اپنا دل و دماغ بھگوان کے لئے وقف کر دیتا ہے تو اس کی لگن کو بھگتی کہا جاتا ہے۔ گویا یہ خدا اور دیوتاؤں سے مکمل وابستگی کا شخصی تعلق ہے جو بھگت کے وجود میں سمجھا جاتا ہے۔ اس راہ پر چلتے ہوئے وہ آواگون سے نکل جاتا ہے اور مکتی پالیتا ہے۔

اس قدیم بھگتی طرز احساس کی بحالی کا کام نویں صدی کے اوائل سے تعلق رکھنے والے جنوبی ہند کے شاعر اور فلسفی سنکارا نے کیا۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ جب ہندوستان ایک روحانی بحران میں الجھا ہوا تھا۔ دانش ور بدھسٹ جدلیات اور الحاد کے جال میں پھنسے

ہوئے تھے۔ اور عوام رسوم سے آگے نہیں جاتے تھے۔ 32 سال کی عمر میں اس دنیا سے رخصت ہو جانے والے سنکارا نے اس صورت حال کے خلاف بغاوت کی۔ اس نے تجریدات اور مابعدالطبیعیاتی بھول .بھلیوں سے نکلنے اور خدا اور بندے کا تعلق بحال کرنے کو کہا۔ گیارہویں صدی کے اوائل میں پیدا ہونے والے رامانج نے اس تصور کو وسعت دی۔ اس نے شنکر اچاریہ کی مطلق احدیت کو رد کیا اور ویدانت کو آگے لایا۔

یہ دونوں صاحبان قدیم بھگتی احساسات کو ایک نئی زندگی دے رہے تھے اور انہوں نے یہ کام ہندوستان میں اسلام کے داخلے سے پہلے کیا۔ لہٰذا ان کی جدوجہد میں اسلامی اثرات کی تلاش فضول سی بات ہے۔ لیکن جب ان کے خیالات شمالی ہند تک پہنچے تو ایسے بھگت سامنے آئے جنہوں نے نہ صرف لاشعوری بلکہ شعوری لحاظ سے بھی مسلم اثرات قبول کئے ہوئے تھے۔ بھگتی سے ان کا مطلب رنگ و نسل یا عقیدے کے امتیاز کے بغیر تمام انسانوں سے یکساں محبت تھی۔ وہ محبت اور اتحاد کے گیت گاتے تھے۔ مختلف مذاہب میں فاصلے کم کرنا چاہتے تھے۔ پندرہویں اور سولہویں صدیوں میں شمالی ہند میں اس قسم کی کئی شخصیات نمایاں ہوئیں۔ ان کی مجموعی جدوجہدی کو بھگتی تحریک کا عنوان دیا جاتا ہے۔ انہوں نے رسوم و رواج کے خلاف بغاوت کی۔ مذہبی قانون کی اہمیت کو گھٹایا' ہندوؤں میں برہمنوں اور مسلمانوں میں قاضیوں کی بالادستی کی مذمت کی۔ ان کو منافقت کا نمائندہ ٹھہرایا ذات پات کے نظام کی مخالفت کی۔ انسانوں کی فطری مساوات کو نمایاں کیا۔ سنسکرت اور دوسری مقدس زبانوں کو انہوں نے نظر انداز کیا۔ عام لوگوں کی زبانوں اور بولیوں کو اولیت دی۔ یہ لوگ زیادہ تر نچلے طبقوں سے تعلق رکھتے تھے۔ مثلاً ان میں سے ایک نامدیو دھوبی تھے' رائے داس موچی اور بابا کبیر جولاہے تھے۔ انہوں نے تمام مذاہب کے احترام کا درس دیا۔ انسان دوستی کی تعلیم دی۔ لیکن نیکیوں کے بدلے جنت کا وعدہ نہ دیا۔ وہ بس یہ کہتے رہے کہ اچھے کاموں کے نتیجے میں اسی دنیا میں من کا سکھ ملتا ہے۔ اور یہی نجات ہے۔

ان صاحبان کے متعلق ہم وضاحت سے نہیں کہہ سکتے کہ وہ ہندو تھے یا مسلمان۔ راسخ الاعتقادی کے موقف کو بنیاد بنایا جائے تو وہ ہندو تھے اور نہ ہی مسلمان۔ بس

انسان تھے اور انسان ہی رہنا چاہتے تھے۔

شمالی ہند میں بھگتی خیالات کو سب سے زیادہ مقبولیت پنجاب میں حاصل ہوئی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ پنجاب کا ماحول ان خیالات کے لئے زیادہ موزوں تھا۔ پانچ دریاؤں کا یہ خطہ زمانہ قدیم سے مختلف عقیدوں اور ثقافتوں کے تصادم' تعامل اور ملاپ کا علاقہ چلا آ رہا تھا۔ یوں اس میں رواداری اور آزاد خیالی کے لئے زیادہ گنجائش موجود تھی۔ چنانچہ تاریخ کا کہنا یہ ہے کہ ان خیالات نے پنجاب میں ایک توانا تحریک کا روپ لیا۔ وہ زراعت پیشہ بستیوں تک پھیل گئے۔

یہ وہ ذہنی اور سماجی ماحول تھا جس میں لاہور سے تیس میل دور' دریائے راوی کے کنارے واقع تلونڈی نامی ایک چھوٹے قصبے میں 15 اپریل 1469 کو بابا نانک نے جنم لیا۔ وہ بھگتوں کی تعلیمات کو ایک باقاعدہ نظام کا روپ دینے والے تھے' جنھوں نے بعد کے زمانوں کے تاریخی حوادث کے سبب ایک نئے مذہب کی صورت اختیار کی۔ اس مذہب' یعنی سکھ مت کی بنیاد بلاشبہ بابا نانک کی تعلیمات ہیں۔ لیکن ان دونوں میں یعنی بابا کی تعلیمات اور سکھ مت میں فاصلے بھی ہیں۔ یوں کہہ لیجئے کہ سکھ مت بابا نانک کی تعلیمات کو بعد کی صدیوں کے پنجاب کے حالات میں ملنے والی صورت کا نام ہے۔

سکھوں کا مطلب طالبان ہے۔۔۔۔ یعنی طالب علم' سچائی کے ڈھونڈنے والے اور چیلے۔ ان کا موقف یہ ہے کہ ان کا مذہب ایک اور مذہبی گروپ نہیں بلکہ مذاہب کی دخلی اور ان سے ماورا عالمگیر سچائی کا ایک بیان ہے۔ ان کے بہت سے عقاید ہندو مسلم اور کئی اور مذہبی تقسیموں سے نجات کی روایت سے تعلق رکھتے ہیں۔ تاہم سکھ مت تو محض ہندو مسلم ملاپ کا نتیجہ نہ سمجھنا چاہئے۔ اس کا اپنا ایک تشخص' تاریخ اور روحانی عنصر ہے۔ بعد کے زمانوں میں سکھ مت اور سکھوں کی تاریخ نے جو روپ لیا' اس کے حوالے سے ہم کہہ سکتے ہیں کہ اصل میں کسی مذہب نے پنجابیوں کی آزادی کی خواہش سے جنم لیا تھا۔

عظیم بھگتوں کی طرح بابا نانک کا تعلق بھی نچلے طبقے سے تھا۔ وہ ایک چھوٹے' لیکن محنتی اور بہت سی امنگیں رکھنے والے کسان کے بیٹے تھے جس نے اپنے بچپن میں

پنجاب کی زندگی کو الٹ پلٹ دینے والے تیمور سمیت مغلوں کے کئی حملوں کو دیکھا تھا۔ بدامنی، قتل و غارت اور لوٹ مار کے زمانے میں زندگی گزارنے والا کالو نامی یہ کسان چاہتا تھا کہ اس کا اکلوتا بیٹا نانک زندگی میں مضبوط قدم جما سکے۔ لیکن نانک کا معاملہ اور ہی تھا۔ وہ ان تمام باتوں سے بھاگتا تھا۔ جو سماجی لحاظ سے معزز مقام دلانے میں مدد دیتی ہیں۔ اس نے باقاعدہ تعلیم حاصل نہ کی۔ اس کو سکول بھیجا جاتا اور وہ کہتا کہ میں نے وہ سب کچھ پہلے ہی پا لیا ہے جو کچھ اساتذہ مجھے دے سکتے ہیں۔ اس کو کام کاج پہ لگانا چاہا، لیکن وہ آزاد رہنا چاہتا تھا۔ کوئی پابندی اس کو قبول نہ تھی۔ غضب یہ ہوا کہ وہ شاعر بھی بن گیا تھا اور اپنے گیت گاتا رہتا تھا۔ اس کے باپ کا ایک مکالمہ تاریخ نے محفوظ کیا ہے جس میں اپنے اکلوتے بیٹے کی فلاح کے آرزومند اس محنتی کسان نے ملال کے ساتھ کہا تھا کہ اس کا بیٹا کاہل ہے اور فضول بھی۔ اس کو امید تھی کہ نانک پٹواری بنے گا اور خاندان کی عزت بن جائے گی۔ لیکن نانک نے اس کو بس مایوس ہی کیا تھا۔

بحران اس وقت شدید ہوا جب کالو نے مشکل سے بیس روپے جمع کئے اور بیٹے کو سوداگر بنانا چاہا۔ نوجوان نانک مان گیا اور دولت کمانے کے لئے قصبے سے نکلا۔ کہتے ہیں کہ اس نے واقعی کچھ پیسے کمائے۔ ستم بس یہ ہوا کہ واپس آتے ہوئے بھگتوں کی ایک ٹولی سے اس کا آمنا سامنا ہو گیا۔ بھگت بھوکے اور بدحال تھے۔ نوجوان کے پاس جو کچھ تھا وہ اس نے بھگتوں کو دے ڈالا۔ کماؤ پوت کے خواب دیکھنے والے کالو نے اس کو خالی ہاتھ آتے دیکھا تو وہ غصے سے بے قابو ہو گیا اور نانک کو پیٹنے لگا۔

نانک کے لوگوں نے جان لیا کہ تلونڈی میں اس کے لچھن نہ بدلیں گے۔ انہوں نے اس کو جالندھر کے ضلع میں سلطان پور کی ریاست میں اس کی بہن نانکی کے پاس بھیج دیا۔ جہاں اس نے اپنے بہنوئی جے رام کی وساطت سے نواب دولت خان کی ملازمت حاصل کی۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ جب نانک کی شادی ہو چکی تھی اور اس کے دو بیٹے بھی تھے۔ بیوی اس کے جانے پر خوش نہ تھی۔ لیکن عزیزوں کا خیال تھا کہ شاید وہاں وہ بدل جائے اور کام کاج میں اس کا جی لگ جائے۔ جانے کا وقت آیا تو بیوی

رونے لگی۔ اس نے کہا کہ پہلے ہی تم مجھ سے کھچے کھچے رہتے تھے۔ اب جا رہے ہو تو دل کہتا ہے کہ لوٹ کے نہ آؤ گے۔ نانک نے جواب دیا۔ "پگلی میں یہاں کونسا تو کس کام کا تھا۔ وہاں جاؤں گا تو کس کام کا ہوں گا۔" بیوی اس استدلال سے متاثر نہ ہوئی۔ اس نے کہا "تم یہاں تھے تو میں خود کو دنیا کی ملکہ سمجھتی تھی۔ اب جاتے ہو تو لگتا ہے کہ سبھی رنگ ساتھ لئے جاتے ہو۔ یہاں اداسیاں ہی رہ جائیں گی۔" نانک نے جواب دیا کہ "تم غم مت کھاؤ۔ کوئی دن جاتے ہیں کہ تم واقعی ملکہ بن جاؤ گی۔"

ہاں۔ وہ بدل گیا۔ نواب دولت خان کی ریاست میں سٹور کیپر بن کر اس نے بہت محنت سے کام کیا۔ سب ذمہ داریاں نبھائیں۔ لوگ اس کی محنت اور دیانت کے گن گانے لگے۔ وہیں تلونڈی کا گانے بجانے والا گویا آیا اور اس کے ساتھ رہنے لگا۔ وہ رباب بجاتا اور نانک گاتا۔ دونوں نے آنے جانے والے دنوں میں یونہی گاتے بجاتے اجنبی دیسوں کو جانا تھا۔

لیکن ان سیاحوں سے پہلے نانک کی زندگی میں ایک انقلاب آنا تھا۔ یہ واقعہ اس وقت رونما ہوا جب پندرہویں صدی کا آخری سال آیا اور نانک تیس سال کا ہونے کو تھا۔ وہ بستی کی ندی میں روزانہ نہانے جاتا تھا۔ لیکن اب کے گیا تو لوٹ کے نہ آیا۔ نہ ہی اس کا کوئی نشان ملا۔ لوگوں نے بہت ڈھونڈا لیکن وہ کہیں نہیں تھا۔ مگر تیسرے روز وہ خود ہی لوٹ آیا۔ کہنے والے کہتے ہیں کہ وہ تین دن اس نے خدا کے ہاں گزارے تھے۔ جس نے بابا کو امرت پینے کو دیا تھا اور اپنا مشن بھی اس کو سونپا تھا۔ چنانچہ اب وہ واپس آیا تو پہلے سا نہ تھا۔ اب اس کے پاس خدائی مشن تھا۔ اس نے دنیا اور دنیا والوں کو کالی جگ سے' تاریخ کے بدترین زمانے سے نجات دلانی تھی۔ اس کی زندگی جو پہلے ہی غیر معمولی تھی' بالکل بدل گئی۔ وہ بھگتوں اور درویشوں کی صحبت میں رہنے لگا۔ آپ جانتے ہیں بھگتوں اور درویشوں کے بھی حاسد بھی ہوا کرتے ہیں۔ چنانچہ بعض لوگوں نے نواب دولت خان سے شکایت کی کہ اس کا یہ غلام نواب کے مال و متاع میں غبن کرتا ہے اور بھگتوں پہ لٹا دیتا ہے۔ اس الزام کی چھان بین ہوئی۔ لیکن تمام حساب کتاب بالکل ٹھیک نکلا نانک کو البتہ دھچکا لگا۔ اس نے ملازمت سے استعفیٰ دیا' مردانے

کو ساتھ لیا اور سالہا سال تک چلنے والی سیاحتوں پہ نکل گیا۔ یہ سیاحتیں اس کو کئی ملکوں کو لے گئیں۔ اس نے ہندوستان گھوما۔ لنکا کو گیا۔ تبت میں دن گزارے۔ افغانستان' ایران' عراق اور یہاں تک کہ مکہ اور مدینہ کے مقدس شہروں کی زیارت بھی کی۔ سبھی جگہوں پہ اس نے خدا کی وحدت اور انسانوں کی مساوات کا درس دیا۔ اور ایک دن جالندھر کے گاؤں کرتار پور میں اپنے خاندان کے پاس لوٹ آیا۔

اس کے آخری سال اسی گاؤں میں گزرے۔ بہت سے چیلے وہاں اکٹھے ہو گئے تھے اور ملکوں ملکوں سے دانش جو اس کے پاس فیض لینے آتے۔ وہ سب مل کر رہتے۔ ہل چلاتے۔ فصلیں اگاتے اور اجتماعی زندگی سے لطف اٹھاتے۔ اکتوبر 1538 میں اس نے اس جہان فانی سے کوچ کیا۔

بابا نانک کی زندگی کا یہ مختصر خاکہ ان کی جنم ساکھیوں سے اخذ کیا گیا ہے۔ یہ جنم ساکھیاں وہ چھوٹی کتابیں ہیں جو ان کی وفات کے بعد ان کے چاہنے والوں نے لکھیں اور اب وہ سکھوں کے مقدس ادب کا حصہ ہیں۔ جنم ساکھیاں بابا نانک کی بائیوگرافیز ہیں۔ یہاں میں یہ بات کہنا چاہتا ہوں کہ اگرچہ بابا نانک نے تاریخ کی روشنی کے زمانے میں جنم لیا لیکن ان کے چاہنے والوں نے ان کی زندگی کے حالات کو افسانہ بنا دیا ہے۔ ان جنم ساکھیوں میں حالات واقعات کم ہیں' لیکن معجزے' مافوق الفطرت واقعات اور کہانیاں بہت زیادہ ہیں' ان حالات و واقعات کو ماورائے فطرت امور سے یوں گڈ مڈ کیا گیا ہے کہ حقیقت اور افسانہ میں' شخصیت اور متھ میں کوئی امتیاز نہیں رہنے دیا گیا' آج ان کو الگ کرنا آسان نہیں ہے۔

ہاں' گرنتھ صاحب کا معاملہ اور ہے۔ خوش قسمتی سے وہ محفوظ رہ گئی ہے۔ "گرنتھ" کا مطلب "کتاب" ہے اور گرنتھ صاحب سکھوں کی مقدس کتاب ہے۔ اس میں بابا نانک کا کلام اور تعلیمات محفوظ ہیں۔ ان کے علاوہ کئی اور بزرگوں کا کلام بھی اس میں شامل ہے۔ ان میں بابا فرید اور بھگت کبیر بھی شامل ہیں۔ یہ کتاب 1604 میں مرتب ہوئی اور ایک لحاظ سے اس میں دو تین صدیوں کے شمالی ہند اور خصوصاً پنجاب کے مذہبی خیالات کے ارتقاء کی تاریخ مل جاتی ہے۔ پندرھویں صدی کے اصلاحی

خیالات اس کتاب میں محفوظ نہ کئے جاتے تو شاید ہم ان سے محروم ہی رہتے۔ اور وہ صدی اصلاح کی صدی تھی۔ یورپ میں تحریک اصلاح کا قائد مارٹن لوتھر ہمارے ان دونوں بزرگوں یعنی بابا نانک اور بھگت کبیر کا معاصر تھا اور ان دونوں بزرگوں جیسا ہی اس نے بنیادی نکتہ پیش کیا تھا۔۔۔۔ یعنی یہ کہ انسان پوپ یا کلیسا کے آگے ذمہ دار نہیں' وہ خدا کے آگے ذمہ دار ہے۔ پوپ اور کلیسا انسان اور خدا کے درمیان رکاوٹ ہیں۔ لوتھر بابا نانک سے آٹھ سال پہلے فوت ہوا تھا۔

بابا نانک اور اس مصلح کے خیالات میں مشابہتیں تلاش کرنا ایک دلچسپ اور اہم کام ہو سکتا ہے۔ لیکن آج کی مجلس میں ہم نے بابا نانک کے خیالات اور تعلیمات کو موضوع توجہ بنانا ہے۔ تو آیئے ان کے خیالات و تعلیمات کی جانب قدم اٹھاتے ہوئے پہلے ہم یہ دیکھ لیں کہ بابا نانک کس قسم کا اپنا امیج دے گئے ہیں۔ یعنی ہم یہ دیکھیں کہ وہ لوگ جو ان کی تعلیمات کو مانتے ہیں یا ان کو ماننے کا دعویٰ رکھتے ہیں' انہوں نے ان تعلیمات کی بنیاد پہ اپنے اس عظیم ممدوح کا کیا امیج بنایا ہے۔ اس سوال کے جواب سے ہم کو یہ بنیادی نکتہ ہاتھ آ جائے گا کہ ان کی تعلیمات کا جوہر (essence) کیا ہے۔ اس سوال کا ایک سادہ سا اور واضح جواب ہے اور یہاں ہم اسی پہ اکتفا کریں گے۔ وہ یہ ہے کہ بابا نانک کی جتنی بھی تصاویر بنائی گئی ہیں' ان سب میں ان کو ایک سفید ریش بزرگ دکھایا گیا ہے جس کے ہونٹوں پہ ہلکی سی مسکراہٹ ہے۔ گویا وہ عظیم دانائی' شانتی' محبت اور بزرگی کی علامت ہیں۔

یہ تصویر کشی کسی غلط فہمی یا ناواجب عقیدت کا نتیجہ نہیں۔ ان کی تعلیمات کی تجسیم یا تصویر اسی انداز سے پیش کی جا سکتی تھی۔ تین نکات ایسے ہیں کہ جن کو ہم ان کا بنیادی پیغام کہہ سکتے ہیں:

1- خدا کو ایک پل کے لئے بھی نہ بھولو۔ ہر لمحہ اس کو یاد رکھو۔ وہ مالک ہے' خالق ہے اور پالنے والا ہے۔

2- محنت اور مشقت سے کام لو۔ رزق حلال' یعنی محنت و مشقت سے حاصل ہونے والا جائز رزق کماؤ۔ اس کا مطلب زندگی کے عمل میں مکمل حصہ لینا ہے۔

رہبانیت سے اور بھیک سے دور رہنا ہے۔ ہندوستان کے پس منظر میں یہ بلاشبہ زیادہ ہی اہم نکتہ ہے کیونکہ ہندوستانی فلسفے اور مذاہب عموماً رہبانیت کی' زندگی کی نفی کی طرف مائل رہے ہیں۔

3- اپنے سے کم نصیب لوگوں کا خیال رکھو۔ جو کچھ آپ کے پاس ہے' وہ ان کے مصائب کے خاتمے کے لئے دے دو۔

یہ تینوں وہ بنیادی نکات ہیں جو بابا نانک کے فلسفے سے اخذ ہوتے ہیں۔ لیکن خود وہ فلسفہ کیا ہے۔ ہم دو تین جملوں میں اس فلسفے کو بیان کرنا چاہیں تو یہ محال نہیں ہے۔ اصل میں تو ایک ہی نکتہ ہے جو ان کے فلسفے کو گرفت میں لئے ہوئے ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ خدا کے بغیر انسان زندگی میں دکھ اٹھاتا ہے۔ خدا سے جدائی دکھ ہے اور اس سے ملاپ خوشی۔ جو کوئی خدا کی راہ پہ چلتا ہے وہ بالاخر اس کو پا لیتا ہے۔ اس کی زندگی مکمل ہو جاتی ہے اور وہ مسلسل زندگی اور موت کے پراسس سے نجات پا لیتا ہے۔ عظیم اور ابدی مسرت سے ہمکنار ہو جاتا ہے۔

سوال اب یہ ہے کہ یہ خدا ہے کیا جس کے ساتھ ملاپ زندگی کا سچا نصب العین ہے۔ اس سوال کا جواب بابا نانک کے حقیقت مطلقہ (absolute reality) کے تصور کو سامنے لاتا ہے اور ان کی تھیالوجی یعنی الٰہیات کی تشکیل کرتا ہے۔ یہ تھیالوجی فلسفیانہ تعصبات اور نظام بندی کی منطق کے ان تقاضوں کے مطابق پیش نہیں کی گئی جن کا تقاضا آج کا ذہن کرتا ہے۔ اصل میں یہ ایک ویسٹرن تقاضا ہے۔ دنیا کے ہمارے حصے میں فلسفے منطقی اصولوں کے مطابق پیش نہیں ہوا کرتے تھے' بلکہ نظموں اور گیتوں میں' کہانیوں اور قصوں اور حکایتوں میں پیش کئے جاتے تھے۔ بابا نانک نے بھی یہی کچھ کہا ہے۔ آج کے ذہن کے تقاضے مختلف ہیں تو ان کی تکمیل سکالرز کا کام ہے اور یہ کام ان کو نبھانا چاہئے۔ خیر' جہاں تک بابا نانک کا تعلق ہے' انہوں نے اپنے خیالات دل اور ذہن دونوں کو موہ لینے والے پنجابی زبان کی نظموں میں پیش کی ہیں۔ لیکن ان سے پیغام اخذ کرنا مشکل نہیں ہے۔ گورو ارجن نے گرنتھ صاحب کو مرتب کرتے ہوئے اس پیغام کو ایک منطقی تسلسل دینا چاہا تھا۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ خود بابا نانک کے کلام

میں داخلی ہم آہنگی نہ تھی۔ نہیں۔ یہ ہم آہنگی پہلے سے موجود تھی۔ ان کے پاس خاص موضوعات تھے جن کو وہ اہم جانتے تھے اور ان موضوعات پر ان کے خیالات ہیں جو کبھی شاعری کے روپ میں اور کبھی کہاوتوں کے انداز میں بیان ہوئے ہیں۔

بعض بے رحم قسم کے نقادوں نے، جن میں ارنسٹ ٹرمپ، جے این فرکوہر، جے ای کارپینٹر اور نکول میک نی کول شامل ہیں، ان کے پیغام میں ہم آہنگی کے فقدان کا حوالہ دیا ہے۔ بس یہ کہنے کی اجازت چاہتا ہوں کہ یہ الزام کلیت یعنی (Totality)، نانک کے ماحول، ان تک پہنچنے والی روایت اور ان کی شاعرانہ اصطلاحوں اور علامتوں کے خام فہم سے پیدا ہوا ہے۔ ہاں، چند مسائل ہیں جن میں وہ ہم آہنگی قائم نہ رکھ سکے۔ ان میں سب سے اہم خدا کے خالق اور قادر مطلق ہونے کے ساتھ ساتھ انسان کی آزادی کو بچانے کا مسئلہ ہے۔ یعنی نانک خدا کو مالک مطلق ٹھہراتے ہیں اور ساتھ ہی ساتھ انسان کو خدا کے اشارے پہ چلنے والی مشین میں نہیں بدلتے۔ بلکہ اس کو آزادی کا، نیکی اور بدی میں سے کسی ایک کا انتخاب کرنے کی اہلیت کا مالک بھی کہتے ہیں۔ عام زندگی میں یہ دونوں تصورات ایک ساتھ چلتے ہیں لیکن بے لچک منطقی حوالے سے دیکھا جائے تو یہ دونوں تصورات، یعنی خدا کا قادر مطلق ہونا اور انسان کا آزاد ہونا، ایک دوسرے کی ضد ہیں۔ وہ دونوں ساتھ ساتھ نہیں چل سکتے۔ لیکن ہم کو یاد رکھنا ہو گا کہ نانکی فلسفے یا الہیات میں جو یہ تضاد پایا جاتا ہے تو یہ کوئی انوکھی بات نہیں۔ دنیا کے اور مذاہب بھی اس تضاد کو حل نہیں کر سکے۔ یہ ایک ایسی الہیاتی الجھن ہے جس کا کوئی حل نہیں۔ لیکن یہاں ہم اس الجھن میں نہ الجھیں گے۔ کیونکہ ہم کو معلوم ہے کہ دنیا کے بہترین مذہبی ذہن صدیوں سے اس میں الجھے ہوئے ہیں۔

آیئے اس سے دامن بچاتے ہوئے ہم آگے چلیں۔ نانکی فکر کو سمجھنے کے لئے ہم اس کے رجحان، طرز احساس، یعنی sensibility کو دیکھیں۔ اس کا اساسی رجحان اس بنیادی خیال سے پیدا ہوا ہے کہ انسان کا نصب العین خدا کے ساتھ شخصی ملاپ ہے۔ اس کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ وہ مذہب کے ظواہر کی، یعنی اس کی رسوم و رواج اور عبادات کی نفی کرتا ہے۔ "کوئی ہندو ہے نہ کوئی مسلمان۔" یہ بابا کا بنیادی جملہ تھا۔ یہ

روحانی تجربے سے لوٹنے والے نانک کا پہلا جملہ ہی تھا۔ جب وہ ندی میں تین دنوں تک غائب رہنے کے بعد بستی میں آیا تو چپ تھا۔ جب اس نے زبان کھولی تو پہلا جملہ یہی کہا تھا۔ سکھ مت کا جائزہ لینے والے بہت سے تجزیہ کار اس جملے کو نانک کا ماٹو کہتے ہیں۔

اس ماٹو کا مطلب ذاتی نیکی اور راست بازی کو تعلیم دینا ہے اور یہ جتلانا ہے کہ محض کسی عقیدے کو قبول کر لینے سے نجات نہیں مل سکتی۔ آپ ہندو ہوں یا مسلمان یا کسی اور عقیدے سے تعلق رکھتے ہوں' جب تک آپ نیکی اور راست بازی سے کام نہ لیں گے' اس وقت تک محض لیبل سے آپ کو نجات نہ مل سکے گی۔ گویا ہم سب اپنے اعمال کے ذمہ دار ہیں اور محض اعمال ہی سے ہمارے مقدر کا فیصلہ ہو گا۔ وہ سب لوگ جو محض عقیدہ' رسوم اور عبادات کے پابند ہیں' وہ سچائی کی راہ سے ہٹے ہوئے ہیں۔ برہمن اور قاضی دونوں مذہب کے ظواہر کے نمائندے ہیں اور یہ وہ طبقے ہیں جن سے دور رہنے کا اشارہ دینے سے بابا نانک کبھی نہیں چوکتے۔

یہ انداز فکر بابا کو بھگتوں اور صوفیوں کے نزدیک لے جاتا ہے۔ جیسا کہ ہم پہلے ہی حوالہ دے چکے ہیں' پندرھویں صدی کے پنجاب کے ذہنی افق پہ یہی دو تحریکیں چھائی ہوئی تھیں۔ لیکن' یہاں ایک اور روایت کا حوالہ دینا بھی لازم ہے۔ یہ تانتری یوگا کی قدیم روایت ہے جو بابا کے زمانے کے پنجاب میں کمزور تو ہو چکی تھی' لیکن ختم نہ ہوئی تھی۔ ناتھ جوگی اس کے نمائندگی کے لئے موجود تھے۔ وہ کئی گروہوں میں تقسیم ہو چکے تھے' لیکن سب کے سب اپنا سلسلہ گورکھ ناتھ سے ملاتے تھے۔ گورکھ ناتھ ایک صمیاتی شخصیت بن چکا ہے۔ بہت سی کہانیاں' قصے اور متھ اس کے متعلق مشہور ہیں۔ لیکن حقائق کیا ہیں۔ اس سوال کا یقین کے ساتھ کوئی جواب نہیں دیا جا سکتا۔ جی ڈبلیو برگس نے البتہ بہت سی تحقیق کے بعد اپنی کتاب "گورکھ ناتھ اینڈ دی کن پھٹ یوگیز" میں دعویٰ کیا ہے کہ گورکھ ناتھ کا تعلق نویں سے بارہویں صدی کے زمانے سے تھا۔

بھگتوں اور صوفیوں کی طرح ناتھ جوگی بھی اپنی آرتھوڈوکس یعنی اپنی بنیاد پرست

روایت سے بٹے ہوئے تھے اور وہ عبادتوں اور رسموں کے بجائے خدا کے ساتھ شخصی تعلق کو اہمیت دیتے تھے۔ بابا نانک نے اس روایت سے بھی فیض پایا ہے۔ اور کیوں نہ پاتا؟ یہ اس کے ذہنی ورثے کا حصہ تھی۔ ان تینوں روایات' یعنی بھگتی تحریک' تصوف اور تانتری یوگا نے جو راسخ الاعتقادی سے ہٹی ہوئی اور باغیانہ تحریکیں تھیں' رسوم و رواج' عبادات' ذات پات' اونچ نیچ' مقدس مقامات اور مقدس زبان اور اس قسم کے بہت سے مذہبی ظواہر کو رد کرنے پر اکسایا۔

مسلم روایت میں ہم کو اس روحانی بغاوت کے عناصر تصوف میں ملتے ہیں۔ بابا نانک نے بلاشبہ تصوف سے اور خود اسلام سے بہت کچھ سیکھا تھا۔ ابھی دو نسلیں پہلے تک سبھی بابا کی تعلیمات یا سکھ مت کی توجیہ کے لئے ایک ہی کلیہ بیان کرتے تھے اور وہ یہ تھا کہ یہ تعلیمات ہندو اور مسلم عقائد کے ملاپ سے وجود میں آئی ہیں۔ اب یہ سادہ سی بات سے بہت سے لوگ گریزاں رہتے ہیں تو اس کے اسباب سیاسی ہیں۔ بیسویں صدی کے ہندوستان کے حالات نے ہندو مسلم امتیاز میں شدت پیدا کی اور اس حوالے سے مسلم سکھ تضاد کو ایک نیا روپ دیا۔ اس لئے یہ سمجھا جانے لگا ہے کہ بابا نانک کو اسلام سے متاثر قرار دینا گویا ان کی اہمیت کو کم کرنا ہے۔ افسوس یہ ہے کہ اس موقف کی تائید ڈبلیو ایچ میکلوڈ نے بھی کی ہے' حالانکہ اس کی کتاب "گورو نانک اینڈ دی سکھ ریلیجن" بابا کی زندگی اور تعلیمات پر بہترین کتاب ہے۔ میکلوڈ جیسی اتھارٹی کی جانب سے نانکی تعلیمات پر اسلامی یا صوفیانہ اثرات کو کم کرنے کے رویے نے دوسرے مصنفین کو بھی متاثر کیا ہے۔ چنانچہ نیا رجحان یہ ہے کہ سکھ مت کی تشکیل میں اسلامی عامل کو منہا کیا جائے۔

یہ موقف مجھ سے قبول نہیں ہو سکا ہے۔ اس کی ایک سیدھی سی وجہ میرے تعصبات ہو سکتے ہیں۔ میں ایک مسلمان خاندان میں پیدا ہوا اور میری ذہنی تشکیل میں اسلامی عقائد نے لازمی حصہ لیا۔ اس لئے عین ممکن ہے کہ دوسرے عقیدوں پہ مجھ کو اپنے آبائی عقیدوں کا سایہ زیادہ صاف دکھائی دیتا ہو۔ اچھا یہ ایک ذاتی سا فیکٹر ہوا۔ لیکن میں صاف کہوں گا کہ اس موضوعی عامل (Subjective Factor) کے علاوہ معروضی (یعنی Objective) فیکٹر بھی بہرحال موجود ہیں۔ ان میں سے سب سے اہم یہ

ہے کہ بابا نانک نے جب پندرہویں صدی کے نصف آخر میں تلونڈی میں جنم لیا تو اس علاقے میں مسلمانوں کی حکمرانی اور آبادی کو صدیاں بیت چکی تھیں۔ خود نانک شاہ کی زندگی مسلمانوں کے درمیان گزری جن سے اس کا روزانہ کا تعلق واسطہ تھا۔ اس نے مسلم زبانیں عربی اور فارسی سیکھی تھیں۔ اس کے نزدیکی ساتھیوں میں مسلمان شامل تھے۔ جس شخص نے، یعنی مردانہ نے، سب سے زیادہ وقت اس کے ساتھ گزارا وہ بھی مسلمان تھا۔ اس لئے آپ مجھ سے زیادہ متعصب قسم کے ان مصنفین کو آسانی کے ساتھ نظر انداز کر سکتے ہیں جو بابا کی تعلیمات اور اسلام، تصوف یا مسلمانوں کے مابین کوئی تعلق دیکھنے کی صلاحیت سے محروم رہے۔

آیئے، اس لمبی بات کو چھوٹا کیا جائے اور میں یہ کہوں کہ بابا کے بعض بنیادی عقاید اسلام سے لئے گئے ہیں۔ مثلاً توحید، یعنی خدا کے ایک ہونے کا خیال بھی ایسا ہی ایک عقیدہ ہے۔ ہاں، یہ ماننے والی بات ہے کہ توحید کا تصور، محض اسلام تک محدود نہیں۔ کم و بیش سبھی مذاہب نے کسی نہ کسی انداز میں اس کا اثبات کیا ہے۔ لیکن ہمارے جو ہندوستانی مذاہب ہیں، ان میں خدا مخلوقات سے الگ تھلگ نہیں۔ وہ ایسا خالق ہے جو اپنی تخلیقات میں سمایا ہوا ہے۔ یہ وہی تصور ہے جس کو ہم وحدت الوجود کا نام دیتے ہیں۔ لیکن بابا نانک نے خدا کو مخلوقات سے الگ کیا، بالکل ویسے ہی جیسے اسلام نے کیا تھا۔ یہ تصور ہم کو بھگتی تحریک کے بہت سے نمائندوں میں بھی ملتا ہے۔ بابا نانک کے فوراً بعد شاہ حسین کی کافیوں اور میرا بائی کے گیتوں میں بھی اس کی صدا نے بازگشت سنائی دیتی ہے اور تاریخ کی ستم ظریفی یہ ہے کہ بہت سے مسلم صوفیا وحدت الوجود کی جانب میلان رکھتے تھے۔

بابا نانک کا خدا کی وحدت سے متعلق خیال "گرنتھ صاحب" کے بالکل آغاز کے منتر میں مل جاتا ہے جس میں وہ کہتا ہے کہ خدا ایک ہے۔ ابدی ہے۔ اس کو فنا نہیں۔ وہ تمام چیزوں کا خالق اور ان کو پالنے والا ہے۔ وہ زمان و مکان سے ماوراء ہے۔ پیدائش اور اموات سے ماوراء ہے۔ وہ اپنے تمام افعال کا خود ہی ذمہ دار ہے۔ وہی برہما، وشنو اور شیوا ہے۔ گویا وہ خالق ہے، پالنے والا ہے اور فنا بھی اسی کے ہاتھوں ہو گی۔ ایک اور گیت میں وہ کہتا ہے کہ دوئی کشتی ڈبو دیتی ہے۔ اس لئے خدا دوئی سے

پاک ہے۔ سب کچھ اس نے تخلیق کیا ہے۔ لیکن نانک یہاں سنبھلتا ہے اور کہتا ہے کہ البتہ بدی کا وہ خالق نہیں۔ صرف نیکی کا خالق ہے۔ بدی تو خدا کی راہ سے ہٹ جانے کا نام ہے۔ چنانچہ کہتا ہے کہ بدی اور گناہ سے بچو۔ نیکی کی راہ اپناؤ اور سچائی تک پہنچو۔ یہ نہ ہو کہ تم کو پچھتانا پڑے۔

یہ ہوا خدا۔ اب رہا انسان کا معاملہ۔ بات یہ ہے کہ جیسا آپ کا خدا کا تصور ہوتا ہے' ویسا ہی انسان کا تصور بنتا ہے۔ صاف اور واضح تناقص کے جال میں الجھے بغیر آپ ان دونوں کو الگ الگ نہیں کر سکتے۔ ایک لحاظ سے ان دونوں کے مابین ایک منطقی تعلق ہے اور اس تعلق کی اہمیت کو کم کرنا ممکن نہیں ہے۔ اس باب میں بابا نانک کا کہنا ہے کہ انسان کی فطرت کا تعین اس کی وابستگی سے ہوتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ جس راہ کو انسان اپناتا ہے' وہی اس کی فطرت بناتی ہے۔ لہٰذا جب تک انسان کی وابستگی مادی دنیا تک محدود رہتی ہے' اس کی فطرت اور ہوتی ہے جب اس کی وابستگی خدا سے' نیکی اور راست بازی سے ہوتی ہے اور وہ مادی مفادات سے آگے نکلتا ہے تو اس کی فطرت بھی بدل جاتی ہے۔

دنیا داری کی حالت میں' یعنی دوسروں کے ساتھ لین دین' مادی مفادات اور زندگی کے دباؤ ڈالنے والے معاملات میں انسان الجھا ہوا ہو تو اس کی توجہ خود کو مضبوط بنانے تک محدود رہتی ہے۔ وجہ یہ ہے کہ اس کیفیت میں وہ خود کو کمزور محسوس کرتا ہے اور خوف کی حالت میں رہتا ہے۔ ناتوانی اور خوف کے جذبے اس کے افعال کو کنٹرول کرتے ہیں اور وہی اس کی شخصیت بناتے ہیں۔ لہٰذا سیدھی سی بات ہے کہ اس عالم میں، اس کے لئے سب سے اہم شے اس کی ذات ہوتی ہے۔ وہ سب کچھ اپنی ذات کے حوالے سے کرتا ہے۔ وہ اپنی خودی کو مضبوط بنانا چاہتا ہے۔ اور یوں خام اور نامکمل ہونے کے احساس پہ قابو پانا چاہتا ہے۔

نانک کا کہنا ہے کہ دنیا داری کی کیفیت میں انسان مکمل نہیں ہو پاتا۔ اس کی تکمیل خدا کے ساتھ تعلق بنانے سے ہی ممکن ہوتی ہے۔ نامکمن انسانی تکمیل کے لئے آواگون کے پراسس سے گزرتا چلا جاتا ہے۔ وہ مسلسل جنم اور موت کے پراسس میں رہتا ہے۔ لیکن جب وہ حقیقت مطلقہ سے' خدا سے اپنا تعلق بناتا ہے' تو اس کی منزلیں

آسان ہو جاتی ہیں۔ اس کی دنیا ہی بدل جاتی ہے---- یعنی اس کی فطرت پہلے جیسی نہیں رہتی۔ وہ نجات کی حالت میں آ جاتا ہے اور آواگون کا سلسلہ ختم ہو جاتا ہے۔ وہ مکتی کی حالت میں آ جاتا ہے۔ اس کی خودی' جس نے اس کو حقیقت سے جدا کیا ہوا تھا اور التباس میں الجھا رکھا تھا اور ساتھ ہی ساتھ اس کو جداگانہ تشخص کے وہم میں مبتلا کیا ہوا تھا' وہ ختم ہو جاتی ہے۔ وہ انت سے بے انت اور محدود سے لامحدود ہو جاتا ہے۔ بابا نانک نے اس معاملے میں لوہے کی مثال دی ہے' جس کو بھٹی میں ڈالا جاتا ہے' پگھلایا جاتا ہے اور نئی صورت دی جاتی ہے۔ یونہی وہ جو دنیا سے' مایا سے تعلق بنائے ہوتا ہے' اس کو جنم کے بعد جنم دیا جاتا ہے تاکہ اس کو اپنی میل نکالنے' اپنا گناہ دھونے اور پاک صاف ہونے کا موقع مل جائے۔

گناہ کا تعلق طبقے سے نہیں اور جہاں تک نانک کا معاملہ ہے اس نے ہندوستانی سماج کی طبقہ بندیوں کی' ذات پات کے امتیازات کی مذمت کی ہے اور ان کو نفرت سے رد کیا ہے۔ سچی بات تو یہ ہے کہ ذات پات کے نظام کی مذمت محض یورپی اثرات کا نتیجہ نہیں۔ یہ بجا ہے کہ گزشتہ دو تین صدیوں سے بہت سے تعلیم یافتہ ہندو بھی اس نظام کی مذمت کرتے رہے ہیں۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ مہاتما بدھ اور مہاویر سمیت ہندوستان کے سبھی مصلحین نے اس نظام کو ناپسند کیا' اس کی مذمت کی اور انسانوں کو' سماج کو اس سے نجات دلانا چاہی۔ بھگتی تحریک والے خصوصاً اس نظام کے مخالف ہیں اور یہی رویہ ہم کو بابا نانک کے ہاں ملتا ہے۔ لیکن چونکہ نانک کبیر' نامدیو اور رائے داس جیسے نچلے طبقوں سے تعلق رکھنے والے بھگتوں کے مقابلے میں نسبتاً اونچے سماجی طبقے سے تعلق رکھتا تھا' لہذا ذات پات کی اس کی جانب سے نفی زیادہ اہمیت رکھتی ہے۔

طبقہ بندی کی بابا نے ایک اور توجیہ دی ہے۔ وہ کہتا ہے کہ نچلی ذات کا وہ ہے جو خدا کو بھلا بیٹھا ہے۔ جو روشنی پا لیتے ہیں وہ ذات پات کی تقسیموں سے بلند ہو جاتے ہیں۔ لیکن ہم کو یاد رکھنا ہو گا کہ سکھوں میں ذات پات کا حقیقی خاتمہ گورو گوند کے زمانے میں ہوا جب اس نے سکھوں کو ایک فوجی جماعت میں تبدیل کیا۔ ظاہر ہے کہ ذات پات کو قائم رکھتے ہوئے وہ ایک فوجی جماعت نہ بنا سکتا تھا۔

ذات پات کو نہ ماننے والا نانک خاندانی زندگی کے تقدس میں یقین رکھتا تھا۔ یہ اس کی دانش کا ایک اور پہلو ہے جو اس کو عمومی ہندوستانی سوچ سے الگ کرتا ہے۔ خاندانی زندگی سے لگاؤ کا مطلب یہ ہے کہ وہ رہبانیت کے حق میں نہ تھا۔ ہندوستان کے بہت سے سیانوں سے ہٹ کر وہ خاندانی زندگی کو مذہبی زندگی یا سچائی کی جستجو میں رکاوٹ نہ سمجھتا تھا۔ اس نے خود نارمل یعنی معمول کی خاندانی زندگی نہ گزاری تھی' لیکن بدھ اور مہاویر کی طرح وہ خاندانی زندگی سے مکمل الگ بھی نہ ہوا تھا۔ وہ والدین' عزیزوں' بیوی اور بچوں سے جدا رہا' لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ وہ ان کے پاس لوٹتا بھی تھا اور آخری دن اس نے خاندان کے ساتھ ہی گزارے۔ اس کے جانشین بھی' ایک کے سوا' اس کے خاندان کے لوگ ہی بنے۔

جوگ اور رہبانیت کے متعلق اس کا موقف بہت ہی صحت مند تھا۔ چنانچہ وہ کہتا ہے کہ جوگ اور زہد یہ نہیں کہ جوگی کا لباس پہنا جائے' جسم پہ راکھ ملی جائے۔ بھوکا رہا جائے۔ جوگ تو ناپاکوں میں پاک رہنے سے ملتا ہے۔ جوگی وہ ہے جو سب سے یکساں پیش آتا ہے۔ جس کو لوگوں سے محبت ہے اور جو ان کے کام آتا ہے۔ اور یہی ہے جس کو نجات ملے گی۔

رنجیت سنگھ: کیا ایک روادار حکمراں تھا؟

ڈاکٹر مبارک علی

پاکستان کی تاریخ نویسی میں سکھوں کی تاریخ کو بہت کم اہمیت دی گئی ہے۔ اگر کوئی تاریخی مواد ملتا ہے تو ان چند مضامین اور مقالوں کی شکل میں کہ جو اخباروں اور رسالوں میں چھپتے رہے ہیں' اور یا پنجاب پر لکھی گئی تاریخوں میں ایک آدھ باب سکھ دور حکومت پر مل جاتا ہے۔ لیکن تحقیقی نقطہ نظر سے یہ دور پاکستان کی تاریخ میں خالی ہی ہے۔ اس کی وجہ سے اگر سکھوں کی تاریخ لکھی جائے تو موجودہ مواد کافی حد تک ناکافی ہے۔ خصوصیت سے طالب علموں اور عام قارئین کے لیے اس دور کے بارے میں جاننے کے لیے کتابوں کی بہت کمی ہے۔ چونکہ یہ تعلیمی اداروں میں نصاب کا حصہ بھی نہیں ہے' اس لیے لوگ پنجاب کی تاریخ کے اس پہلو سے بے خبر ہی ہیں۔ اس طویل عرصہ میں رنجیت سنگھ پر پاکستان میں صرف ایک کتاب لکھی گئی ہے' اس کے مصنف فقیر وحیدالدین ہیں کہ جن کا خاندان سکھ دربار کی ملازمت میں تھا' انہوں نے اپنی کتاب کو جو عنوان دیا ہے وہ بھی قابل غور ہے' یعنی "حقیقی رنجیت سنگھ" (Real Ranjit Singh) یعنی اس حقیقی رنجیت سنگھ کے علاوہ بھی کوئی اور رنجیت سنگھ ہے کہ جس کے بارے میں پاکستان میں ایک رائے بنی ہوئی ہے۔ لہذا اس کتاب میں انہوں نے کوشش کی ہے کہ رنجیت سنگھ کے اس امیج کو کہ وہ مسلمانوں کا دشمن' اور متعصب حکمراں تھا' اسے دور کیا جائے' اور تاریخی شواہد کی روشنی میں اس کی اصل تصویر پیش کی جائے۔

سکھ دور حکومت کے بارے میں جو تاثر دیا جاتا ہے وہ یہ ہے کہ ان کا عہد سیاسی انتشار' بے چینی' افراتفری اور ٹوٹ پھوٹ کا تھا اس وجہ سے "سکھ گردی" کے محاورے سے اس وقت کی صورت حال کی عکاسی کی جاتی ہے۔ اب مورخین نے اس

نقطہ نظر کو غلط ثابت کرتے ہوئے' اس کی وضاحت کی ہے کہ پنجاب کے بارے میں سیاسی انتشار' معاشی بدحالی اور لاقانونیت کی تصویر پیش کرنے کا کام انگریزوں کا تھا' جو یہ ثابت کرنا چاہتے تھے کہ انہوں نے اہل پنجاب کو بدامنی کے دور سے نکال کر امن و امان دیا' اس لیے لوگوں کو اہل برطانیہ کا شکر گزار ہونا چاہیے۔ تاریخ میں یہ نقطہ نظر بڑا مقبول ہے کہ ہر فاتح' اپنی فتح اور کامیابی کو ماضی کی حکومتوں اور حکمرانوں کی نااہلی قرار دیتے ہوئے اسے ایک اخلاقی جواز کے طور پر پیش کرتا تھا۔

جہاں تک رنجیت سنگھ کا بحیثیت حکمراں سوال ہے' تو وہ ابتداء ہی سے ایک متنازعہ شخصیت رہا۔ اسے ایک طرف تو لالچی' چالاک' شہوت پرست اور ظالم کے طور پر پیش کیا گیا ہے' تو دوسری طرف فیاض' سخی' بامروت' دوست اور روادار حکمراں کے روپ میں نظر آتا ہے۔ اگرچہ پاکستان کی تاریخ نویسی میں' اور عمومی طور پر اس کے بارے میں جو خیالات ہیں وہ یہ ہیں کہ وہ مسلمانوں کا دشمن اور سخت متعصب حکمراں تھا کہ جس کے عہد میں ان پر سخت مظالم ہوئے' اور انہیں اپنے مذہب کے مطابق عبادت کرنے یا رسومات ادا کرنے کی اجازت نہ تھی۔ رنجیت سنگھ کے بارے میں ان خیالات کے پس منظر میں سید احمد شہید اور سکھ حکومت کا تصادم بھی ہے' جنھوں نے کہ سکھوں کے خلاف اعلان جہاد کیا' سرحد میں اسلامی حکومت کو قائم کیا اور اپنی فوج میں جہادیوں کی شمولیت کے لیے اس پر زور دیا کہ چونکہ پنجاب میں سکھوں کے مسلمانوں پر مظالم بڑھ گئے ہیں' اس لیے ان کے خلاف جہاد کرنا فرض عین ہے۔ سید احمد شہید اور ان کے ساتھی سکھوں سے لڑتے ہوئے بالا کوٹ کے مقام پر 1831 میں شہید ہوئے' اس لیے مسلمانوں میں سید احمد شہید کا درجہ بطور جہادی عظیم ہے کہ جنھوں نے مذہب کے تحفظ کے لیے سکھوں سے جہاد کیا' سکھوں کی مخالفت' اور ان کی شہادت نے مسلمانوں سے سکھوں کے خلاف جذبات کو پیدا کرنے میں مدد دی۔

ایک اور وجہ کہ جس کی وجہ سے مسلمانوں میں سکھوں کے خلاف عناد ہوا' وہ ملتان پر ان کا حملہ اور نواب مظفر خاں اور ان کے بیٹوں کی شہادت ہے' اس میں سکھ بطور حملہ آور اور نواب مظفر اپنے علاقہ کا دفاع کرنے والا ہے' یہ دونوں واقعات مذہبی اور سیاسی رنگ لیے ہوئے ہیں' انہیں جہاں مذہب پر حملہ سمجھا جاتا ہے وہیں سیاسی

طور پر سکھوں کے جارحانہ رویہ کا اظہار ہوتا ہے۔ اس تناظر میں سکھ مخالف اور دشمن کے روپ میں ابھرتے ہیں' تو سید احمد شہید اور نواب مظفر ہیرو اور شہید کہ جنہوں نے مذہب کے تحفظ کی خاطر قربانیاں دیں۔

فقیر وحیدالدین' حقیقی رنجیت سنگھ کے مصنف نے دعویٰ کیا ہے کہ ان کے پاس سکھ دور کی دستاویزات اور سرکاری کاغذات ہیں کہ جن کی مدد سے انہوں نے یہ کتاب لکھی ہے' اور اس میں اس مواد سے مدد لی ہے کہ جو اب تک مورخوں کی دسترس میں نہیں تھا۔ اس کتاب میں انہوں نے کوشش کی ہے کہ مسلمانوں میں رنجیت سنگھ کے بارے میں جو مخالفانہ جذبات اور خیالات ہیں انہیں دور کیا جائے اور اس کی اصل تصویر لوگوں کے سامنے لائی جائے۔ یہ کتاب 1965ء میں پہلی مرتبہ شائع ہوئی' لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس کی کوئی زیادہ پذیرائی نہیں ہوئی' کیونکہ نہ تو اس کا دوسرا ایڈیشن شائع ہوا' اور نہ ہی یہ کتب خانوں میں آسانی سے ملتی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ چونکہ مصنف نے رنجیت سنگھ کو مقبول عام امیج کے خلاف پیش کیا' اس لیے اسے پسند نہیں کیا گیا' مصنف کی یہ دلیل کہ رنجیت سنگھ کو متعصب سکھ حکمراں نہیں تھا' بلکہ مذہبی طور پر رواداد' اور انسانی خوبیوں کا حامی تھا' اسے بھی زیادہ اہمیت نہیں دی گئی۔ اس کتاب میں تحقیق کے نقطہ نظر سے کچھ کمزوریاں ضرور ہیں' مثلاً اس میں حوالہ جات نہیں ہیں' اور نہ ہی کتابیات کی فہرست ہے' خاندانی دستاویزات سے جو حوالے دیئے گئے ہیں' ان کی شہادت بھی ناکافی ہے' چونکہ نہ تو یہ کتاب مارکیٹ میں ملتی ہے' اور نہ اکثر کتب خانوں میں' اس وجہ سے پاکستان میں سکھ تاریخ اور رنجیت سنگھ کے بارے میں جو تاثرات ہیں' وہ اسی طرح سے باقی ہیں۔

پاکستان میں پنجابی قوم پرستوں کا ایک چھوٹا سا حلقہ ہے' جو کہ سکھوں کی تاریخ اور رنجیت سنگھ کی شخصیت کو اپناتے ہیں' کیونکہ وہ پہلا پنجابی تھا کہ جس نے پنجاب کو متحد کر کے' اس پر بحیثیت حکمراں حکومت کی' اور پنجاب کا ان تمام حملہ آوروں سے دفاع کیا کہ جو اس کو اپنے ماتحت رکھنے کے خواہش مند تھے۔ اس تناظر میں رنجیت سنگھ' پنجابی شناخت کی ایک علامت بن کر ابھرتا ہے۔ لیکن اس نقطہ نظر کو بھی زیادہ مقبولیت نہیں مل سکی۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ اس موضوع پر کوئی تخلیقی اور

پر مدلل کام بھی نہیں ہوا۔

(2)

رنجیت سنگھ کی شخصیت اور اس کے کردار کو بنانے میں 18 ویں صدی' اس کا ماحول' اور روایات نے اہم حصہ لیا' لہٰذا انیسویں صدی کے اوائل تک اس پس منظر نے اس کے ذہن کی تشکیل کی۔ اس دور کی اہم خصوصیات میں سے ایک خصوصیت معاشرہ میں مذہبی رواداری کی تھی' یہ اس کا تسلسل تھا کہ جس کی پرورش میں اکبر نے اپنی "صلح کل" کی پالیسی کے ذریعہ حصہ لیا تھا' یہ مذہبی رواداری اور مختلف مذاہب کے لوگوں کے جذبات کا احترام' وہ روایت تھی کہ جس کی بنیادیں برصغیر ہندوستان میں گہری ہو چکی تھیں' اس کی وجہ یہ تھی کہ ہندوستان میں کئی مذاہب کے لوگ آباد تھے جو ایک دوسرے کے مذہبی عقائد اور روایات کا نہ صرف احترام کرتے تھے' بلکہ ان میں حصہ بھی لیتے تھے۔ لہٰذا ہندوستان کی تاریخ میں ہم یہ بھی دیکھتے ہیں کہ ایک طرف سیاسی مفادات کے حصول اور تکمیل کے لیے جنگیں ہو رہی ہیں' لیکن دوسری طرف ثقافتی اور سماجی طور پر لوگ باہمی اشتراک کو اپنائے ہوئے ہیں۔ بھگتی تحریک نے جو رواداری کی فضا پیدا کی تھی' اس نے لوگوں کو ایک دوسرے کے ساتھ رہنے اور مذہبی تنازعات سے بالاتر ہو کر سوچنے کے لیے فضا سازگار کی۔ اگر مذہبی جماعتوں میں مذہبی اختلافات باقی بھی رہتے تھے' تو بھی انہوں نے ساتھ رہنے کا طریقہ کار سیکھ لیا تھا۔ اس کا نتیجہ یہ تھا کہ ہندوستانی معاشرے میں نہ صرف یہ کہ ایک دوسرے کے مذہب کا احترام تھا' بلکہ ہر مذہب کے بزرگ' صوفی' سنت' پیر' اور سنیاسی سے عقیدت رکھتے تھے' اور برکت کی غرض سے ان کی درگاہ' قبر' یا خانقاہ میں جایا کرتے تھے۔ تاریخ میں اس کی کئی مثالیں ہیں کہ اکبر' جہانگیر' اور دوسرے مغل بادشاہ جوگیوں' سادھوؤں' اور صوفیوں کے آستانوں پر بطور عقیدت جایا کرتے تھے۔ ہندوستان کے معاشرے میں ان بزرگوں' صوفیوں' اور اولیاء کا کردار اس وقت اور زیادہ اہمیت اختیار کر لیتا تھا کہ جب معاشرہ میں سیاسی بے چینی ہوتی تھی' اور لوگوں کو عدم تحفظ کا احساس ہوتا تھا' ان موقعوں پر یہ لوگوں میں اعتماد اور تحفظ کا احساس پیدا کرتے تھے' اور انہیں تکالیف و

مصیبتوں کو برداشت کرنے کا حوصلہ دیتے تھے۔ ان لوگوں کے زیر اثر ہندوستان میں اس قسم کی کئی مذہبی تحریکیں اٹھیں کہ جنھوں نے شعوری طور پر یہ کوشش کی کہ مختلف مذاہب کے لوگوں کو آپس میں ملایا جائے' یا ان مذاہب کے ملاپ سے ایک ایسا عقیدہ تشکیل دیا جائے کہ جو تمام لوگوں کے لیے قابل قبول ہو۔ اس پس منظر میں دیکھا جائے تو سکھ ایک ایسا ہی مذہب ہے جو کہ بھگتی تحریک کے نظریات کے نتیجہ میں پیدا ہوا' یہ وہ تحریک تھی جو مذہبی انتہا پسندی کے خلاف تھی' چاہے یہ اسلام میں ہو یا برہمن ازم میں۔

اٹھارویں صدی ہندوستان کی تاریخ میں اس لیے بھی اہم ہے کہ اس دور میں حکومت کی مرکزیت کا خاتمہ ہوا۔ جب سیاسی طور پر حکومت کے اختیارات کمزور ہوئے تو اس کا فائدہ صوبوں نے اٹھایا' اور انھوں نے علاقائی طور پر یا تو خود مختاری اختیار کر لی' اور یا مرکز کی سرپرستی سے آزاد ہو کر' اپنے اندرونی معاملات کا انتظام خود سے کرنا شروع کر دیا۔ اس عرصہ میں نادر شاہ (1739) اور احمد شاہ ابدالی (1752) کے حملوں نے خصوصی طور پر پنجاب کی سیاسی اور معاشی زندگی پر گہرے اثرات ڈالے۔ جب لوگوں میں عدم تحفظ بڑھ گیا۔ جنگ و جدل نے امن و امان کو تہہ و بالا کر دیا' تو اس صورتحال میں سکون' آرام' امن' اور اطمینان کی شدید خواہشات لوگوں میں پیدا ہوئیں۔ اسی وجہ سے جب رنجیت سنگھ نے اقتدار حاصل کر لیا' اور لوگوں کی ان خواہشات کو پورا کر دیا' تو اس کے عوض انھوں نے اس کی حکومت کو تسلیم کر لیا' اور اس کی راہنمائی میں ہندو' مسلمان' سب ہی متحد ہو گئے کہ اپنے ملک کو بیرونی حملہ آوروں سے بچایا جائے۔ یہ اس کا ایک بڑا کارنامہ ہے کہ اس نے پنجاب کو افغان حملہ آوروں سے محفوظ رکھتے ہوئے اس کی آزادی کو برقرار رکھا۔ اس نے افغانوں کی جانب سے جس پالیسی کو اختیار کیا' اس کی مثال علاء الدین خلجی سے ملتی جلتی ہے' جس نے منگولوں کے حملوں کے خلاف نہ صرف ہندوستان کا دفاع کیا' بلکہ ان حملوں کو مکمل طور پر روکنے کی غرض سے افغانستان میں ان کے ٹھکانوں پر حملے کیے' اس طرح دفاع کرنے والا حملہ آور اور جارح ہو گیا۔ اس پالیسی کو ہم رنجیت سنگھ کے ہاں دیکھتے ہیں کہ جس نے اپنی سلطنت کو وسیع کر کے درہ خیبر تک کے علاقے کو شامل کر لیا' اور افغانوں کی مداخلت کو ان کی

سرحدوں پر روک دیا۔

اس بات کو ذہن میں رکھنا ضروری ہے کہ رنجیت سنگھ کی حمایت کی اصل اور اہم بنیاد اس کی سکھ کمیونٹی میں تھی' ان میں بھی خاص طور سے اکالی کہ جو جارحانہ اور پرتشدد رویہ رکھتے تھے' ان کی حمایت کو برقرار رکھنے کے لیے یہ لازمی تھا کہ ان کی خواہشات کو پورا کیا جائے۔ سکھوں کے علاوہ' دوسرے مذاہب کے لوگوں کو سکھ ریاست کا حصہ بنانے میں دو عناصر خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔ اول یہ کہ سکھ پنجاب میں اقلیت میں تھے' اور محض طاقت کے زور پر حکومت نہیں کر سکتے تھے' اس لیے اپنے اقتدار کے استحکام کے لیے ضروری تھا کہ دوسرے مذاہب کے لوگوں سے خوشگوار تعلقات رکھتے ہوئے' انہیں حکومت میں اپنے ساتھ شامل کریں۔ دوسری بات یہ تھی سکھ کمیونٹی اب تک حکومت کے انتظام اور ڈپلومیسی میں تجربہ نہیں رکھتی تھی' ان میں سے اکثریت یا تو کاشتکار تھی' اور یا تاجر' اس لیے رنجیت سنگھ کی یہ ضرورت تھی کہ ہندوؤں' مسلمانوں' اور عیسائیوں کی خدمات حاصل کرے' اس کی اس پالیسی کے پس منظر میں مغل ریاست کا ڈھانچہ تھا کہ جس میں برصغیر کی ہر کمیونٹی شامل تھی' اس وجہ سے اس کی بنیاد میں نہ تو عدم رواداری تھی' اور نہ تعصب۔ رنجیت سنگھ نے مغل ریاست کے اس تسلسل کو جاری رکھا۔

رنجیت سنگھ کے دربار میں مسلمانوں کی خاصی تعداد تھی کہ جو ریاست کے اعلیٰ عہدوں پر فائز تھی۔ مسلمانوں کو اس بات کی اجازت تھی کہ وہ اپنے مذہبی اور ذاتی مسائل میں شریعت پر عمل کریں۔ اس مقصد کے لیے قاضی نظام الدین کا تقرر کیا گیا تھا تاکہ مسلمانوں کے درمیان جو تنازعات ہوں' ان کا شرعی قوانین کے تحت فیصلہ کریں۔ اسلامی فقہ کی تفسیر اور تاویل کے لیے محمد شاہ اور سعد اللہ شاہ کا بطور مفتی تقرر ہوا تھا۔ امام بخش کو لاہور کے کوتوال کا عہدہ دیا گیا تھا۔ حکیم نورالدین کو شفاخانہ کا انچارج مقرر کیا تھا' فقیر عزیزالدین اس کا سب سے زیادہ پراعتماد امیر تھا' جن کے ذمہ انتظامیہ کے اہم امور کے علاوہ خارجی معاملات کی دیکھ بھال بھی تھی' اس لحاظ سے انہیں رنجیت سنگھ کا وزیر خارجہ کہا جا سکتا ہے۔ انہیں کے بھائی امام الدین کو ان کی انتظامی صلاحیتوں کے پیش نظر' حکومت کے مختلف صوبوں میں بطور گورنر بھیجا گیا۔

جب انہیں گجرات کا گورنر مقرر کیا تو اس پر وہاں کے اونچی ذات کے ہندوؤں نے سخت احتجاج کیا' لیکن رنجیت سنگھ نے ان کے شور مچانے کے باوجود اپنا فیصلہ تبدیل نہیں کیا۔ (1) فوج میں سپاہیوں کی بھرتی کے وقت کسی قسم کے مذہبی تعصب کا مظاہرہ نہیں ہوتا تھا۔ چارلس میسن (Charles Masson) نے اس سلسلہ میں لکھا ہے کہ: "رجمنٹس مسلمان اور سکھوں سے بھری ہوئی ہیں' یہ پنجاب میں استعمال ہونے والی پگڑی کو پہنتے ہیں۔" (2)

اس طرح ضرورت کے تحت اس نے یورپیوں کی ایک خاص تعداد کو ملازمت میں شامل کر رکھا تھا' انہیں ماحول کا عادی بنانے اور لوگوں سے تعلقات رکھنے کی غرض سے' اس نے مختلف قسم کے اقدامات کیے تھے تاکہ وہ پنجابی معاشرے کا ایک حصہ بن سکیں۔ اس کی ہدایت تھی کہ: ہندوستان بننے کے لیے ضروری ہے کہ وہ یہاں شادیاں کریں' لوگوں کے جذبات کا خیال رکھتے ہوئے نہ تو گائے کا گوشت کھائیں اور نہ ملک میں تمباکو نوشی کریں' اپنی داڑھیاں بڑھائیں' کسی بھی صورت میں سکھ مذہب اور اس کے ماننے والوں کے جذبات مجروح نہ کریں' اگر ضرورت پڑے تو اپنے ہم قوموں اور ملک والوں کے خلاف جنگ سے گریز نہ کریں۔" (3) ملازمت کے سلسلہ میں اس کا معیار یہ تھا کہ یہ باصلاحیت اور قابل اعتماد افراد کو ان کے مذہب' نسل' یا ذات سے بالاتر ہو کر دی جائے۔ یہی وجہ ہے کہ اس نے ریاست کے اعلیٰ عہدوں پر غیر پنجابیوں کا تقرر کر رکھا تھا' جن میں دیوان ناتھ جو کہ ایک کشمیری تھا خوش حال سنگھ' جس کا تعلق برہمن ذات سے تھا اور ڈوگرہ برادران جو کہ معمولی سپاہی تھے' یہ سب اعلیٰ انتظامی اور فوجی عہدوں پر فائز تھے۔ ان لوگوں کی وفاداری کو مستحکم کرنے کی غرض سے اس نے صدیوں پرانی روش کو اختیار کر رکھا تھا' یعنی ان کو اعلیٰ خدمات کے عوض جاگیریں' تحفہ تحائف' نقدی' اور موثر و خوش کن خطابات عطا کرنا۔ یہ انعامات پبلک میں دیئے جاتے تھے تاکہ وہ لوگوں کی نظروں میں آئیں' جہاں ایک طرف حکمراں کی فیاضی و داد و دہش کا اظہار ہو' وہاں ان کی وفاداری اور اس کے صلہ میں ملنے والے امتیازات سے دوسرے لوگ متاثر ہوں۔ اس نے اس پالیسی کو بھی اختیار کیا تھا کہ جب بھی کوئی علاقہ یا شہر فتح کیا جائے' تو وہاں کے لوگوں کے ساتھ فیاضانہ سلوک کیا جائے'

تاکہ شکست کھانے والے اس کی حکومت کو خوش دلی سے تسلیم کرلیں' مثلاً اس نے قصور کے نواب قطب الدین خاں' منکیرہ کے حافظ احمد خاں' اور ملتان کے نواب سرفراز خاں کی کھلے دل سے سرپرستی کی اور انہیں فیاضی کے ساتھ وظیفے دیئے تاکہ وہ عیش و آرام سے رہیں۔ (4)

(4)

ہندوستان میں مختلف مذاہب اور فرقوں سے تعلق رکھنے والے بزرگ اور اولیاء معاشرے میں عزت و احترام اور عقیدت کی نگاہ سے دیکھے جاتے ہیں' اور یہ یقین کرلیا جاتا ہے کہ ان بزرگوں کے پاس روحانی طاقت ہے کہ جس سے وہ فرد کی زندگی میں تبدیلیاں لا سکتے ہیں اور خدا کے قرب سے یہ لوگوں کی خواہشات پوری کرنے کے اہل ہیں۔ اس وجہ سے لوگ ان سے عقیدت کا اظہار بھی کرتے ہیں اور ان سے ڈرتے بھی ہیں۔ اس وجہ سے ہندوستان کے حکمرانوں ہمیشہ اس پالیسی کو اختیار کیا کہ ان کی مملکت میں جو اللہ والے بزرگ ہیں ان سے خوشگوار تعلقات رکھے جائیں' اور اپنی عقیدت کے اظہار کے طور پر ان کی زیارت کی جائے۔ رنجیت سنگھ اگرچہ پکا سکھ مذہب کا ماننے والا تھا' لیکن وہ مسلمان صوفیوں' بزرگوں' اور ہندو سادھوؤں سے گہری عقیدت رکھتا تھا۔ فقیر وحیدالدین نے لکھا ہے کہ وہ مسلمان اولیاء کی درگاہوں اور ہندوؤں کے مندر میں اس عقیدت و احترام سے جاتا تھا کہ جس طرح وہ گولڈن ٹمپل اور ترن تران کی زیارت کرتا تھا' انہیں بھی اسی فیاضی سے عطیات دیتا تھا کہ جیسے سکھ متبرک مقامات کو (5) اس نے احکامات جاری کیے تھے کہ اس کی مملکت میں ایسے تمام مسلمان صوفیوں کے مزارات کی مرمت کرائی جائے جو کہ شکستہ اور قابل مرمت ہو گئے تھے۔ ان ہی میں سے داتا صاحب کا مقبرہ بھی تھا کہ جس کی مرمت کرائی گئی۔ ان مقبروں کے متولی اور سجاد نشیں سکھ دربار سے برابر وظیفے پاتے تھے۔ وہ خصوصیت سے مادھو لال کے سجادہ نشیں سائیں صوبے شاہ کا احترام کرتا تھا اور جب کبھی بھی کسی مہم پر جانا تھا تو پہلے ان کے پاس جا کر کامیابی کی دعا کراتا تھا۔ ان ہی میں ایک بزرگ تھے جن کا نام شاہ فدا حسین تھا' یہ سر سید کے نانا کے بھائی تھے' رنجیت سنگھ انہیں 200

روپیہ ماہانہ بطور عقیدت بھجوایا کرتا تھا۔ ایک اور بزرگ تھے جن کا نام مستان شاہ تھا' انہیں 100 روپیہ روز ملا کرتے تھے۔ رنجیت سنگھ نے اپنے عہد کی جن روایات کو بطور ورثہ پایا' ان میں سے ایک یہ بھی تھی کہ حکمراں سید خاندانوں کی عزت کرتے تھے' لہٰذا اس نے بھی اس روایت کو برقرار رکھا اور سیدوں کا خصوصیت سے ہمیشہ احترام کیا۔ (6)

چونکہ سکھ دربار میں ہر مذہب و فرقہ اور نسل و ذات کے لوگوں کا مجمع رہتا تھا' اس وجہ سے اس کی ثقافتی زندگی رنگا رنگ ہو گئی تھی' اس سلسلہ میں گریوال نے لکھا ہے کہ یہ کلچر کو سیکولر بنانے کا عمل تھا (7) اس وجہ سے دربار میں تمام مذہبی اور ثقافتی تہوار منائے جاتے تھے اور رسومات ادا کی جاتی تھیں۔ مثلاً ایک مرتبہ جب اکالیوں کی دخل اندازی کی وجہ سے شیعہ فرقہ کے لوگوں کے لیے تعزیہ نکالنا مشکل ہو رہا تھا' تو مہاراجہ نے احکامات دیئے کہ وہ حسب معمول تعزیہ نکالیں اور کوئی ان کے جلوس میں گڑبڑ نہ کرے۔ وہ بسنت کے موقع پر مادھو لال کی درگاہ پر تہوار کو مناتا تھا۔ اس نے درگاہ کے اخراجات کے لیے درگاہ کو جاگیر دے رکھی تھی' مگر اس کا کہنا تھا کہ اس نے جو کچھ دیا ہے اس کا مقابلہ وہ چغتائی خاندان کے حکمرانوں سے نہیں کر سکتا ہے' لیکن پھر بھی اس کے پاس جو کچھ بھی ہے وہ اس میں سے مالی مدد دینے کے لیے تیار ہے۔ (8)

اس نے اپنی مملکت میں عربی و فارسی کے مدرسوں کی سرپرستی کی' اس قسم کا ایک مدرسہ لاہور میں بازار حکیماں میں تھا' وہ اس مدرسہ کی مالی امداد کرتا تھا کہ جس سے غریب طالب علموں کو وظائف دیئے جاتے تھے۔ ایک دوسری مثال کے بارے میں چارلس میسن نے لکھا ہے کہ: ''اگرچہ وہ خود ان پڑھ تھا' لیکن وہ ان کی عزت کرتا تھا جو علم کے حصول میں رہتے تھے' اور جب کبھی اسے موقع ملتا وہ ان کی مدد کرتا تھا۔ پشاور میں اپنی آمد کے موقع پر' اس نے علم و ادب سے اپنی عقیدت کا اظہار اس طرح سے کیا کہ ایک مسلمان صوفی کہ جن کی لائبریری چمکنہ میں تھی' اس کی حفاظت کے لیے احکامات دیئے۔'' (9)

مہاراجہ کی مقبولیت کے بارے میں میسن لکھتا ہے کہ: ''وہ اپنی تمام رعایا میں

مقبول ہے' کیونکہ وہ ہندوؤں اور مسلمانوں دونوں پر برابری کے اصول پر حکمرانی کرتا ہے۔ صرف ایک بات پر مسلمان اس سے ناراض ہیں اور وہ یہ ہے کہ اس نے نماز کے اعلان کے لیے اذان کو بند کر دیا ہے۔" (10)

ایک دلیل یہ دی جاتی ہے کہ رنجیت سنگھ نے پنجاب کے ہر طبقہ' فرقہ اور مذہب کے ماننے والوں کو ایک سلسلہ میں جوڑ کر ان میں پنجابی کی شناخت پیدا کی۔ گریوال کے مطابق اس کا اظہار تعمیرات' مصوری' اور ادب سے ہوتا ہے۔ اگر اس کو ذہن میں رکھا جائے تو ہم ساون یار کی "سہ حرفی" کو جو رنجیت سنگھ کی تعریف میں لکھی گئی ہے' بہتر طور پر سمجھ سکیں گے۔ جعفر بیگ کی "سہ حرفی" جو کہ رنجیت سنگھ کی وفات پر مرثیہ ہے' اس سے لوگوں کے جذبات کا اندازہ لگا سکیں گے۔ حکم سنگھ کی سہ حرفی جو کہ ہری سنگھ نلوا کی مہمات کی تعریف میں ہیں' اس سے اس عہد کے ذہن کو سمجھا جا سکے گا۔ رنجیت سنگھ کس طرح سے مسلمانوں اور ہندوؤں میں مقبول تھا اس کا اندازہ نادر یار کی تحریروں سے ہوتا ہے کہ جو افغانوں کے مقابلہ میں کہ جو اس کے ہم مذہب تھے' پنجاب کے حکمراں طبقوں کے ساتھ اپنی وفاداری اور ہمدردی کا اظہار کرتا ہے۔ (11) بہرحال یہ ایک متنازعہ مسئلہ ہے کہ یہ پنجابی شناخت کس حد تک رہی' اور اس کے کتنے اثرات ہوئے۔ کیونکہ ہم دیکھتے ہیں کہ رنجیت سنگھ کی وفات کے فوراً" بعد یہ جذبات زیادہ عرصہ نہیں رہے۔ اس کی موت نے یہ ثابت کر دیا کہ اس کی ریاست کا پورا ڈھانچہ اور اس کے فنکشن اس کی زندگی تک تھے اور انہوں نے مستحکم اداروں کی شکل اختیار نہیں کی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ اس کی وفات نے اس کی سلطنت کو انتشار کا شکار کر دیا' اس کے جانشینوں میں کوئی ایسا فرد نہیں تھا کہ جو اس کی تعمیر شدہ عمارت کو سنبھال سکتا' نتیجہ اس کا زوال اور خاتمہ کی شکل میں ہوا۔

(5)

ایرانی و ترکی روایات میں حکمرانوں اور بادشاہوں کی راہنمائی اور آداب کے لیے سیاستدانوں' مفکروں اور دانشوروں نے کتابیں لکھی ہیں کہ جنہیں "اخلاقی ادب" کہا جاتا ہے۔ ان تحریروں میں حکمرانوں پر زور دیا گیا ہے کہ وہ اپنی رعایا کی فلاح و بہبود کے

لیے کام کریں' ان سے رابطہ رکھیں' ان کی شکایات سنیں' عمال کے ظلم و ستم سے ان کی حفاظت کریں' عدل و انصاف سے کام لیں' اور غیر ضروری طور پر ان پر ٹیکسوں کا بوجھ نہ ڈالیں۔ اگر اس ادب کی روشنی میں رنجیت سنگھ کی شخصیت کو دیکھا جائے تو ہم اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ ابتداء ہی سے اس نے یہ اصول اختیار کیا تھا کہ وہ لوگوں کی پہنچ میں رہے' ان سے دور نہ ہو۔ یہ حکم تھا کہ جب بھی وہ باہر نکلے تو لوگ اس کے قریب آ کر اپنی فریاد اس سے بیان کریں۔ لہٰذا لوگ اس کے جلوس کے وقت "دھائی سرکار" کا نعرہ لگا کر اس سے اپنی تکلیفیں بیان کرتے۔ فقیر وحیدالدین نے لکھا ہے کہ اکثر لوگ اس نعرہ کے ساتھ اسے روک کر اس سے عجیب و غریب مطالبات کرتے تھے۔ لوگوں کا یہ خیال تھا کہ اگر اس کے جسم سے کسی بھی دھات کو چھوا دیا جائے تو وہ بدل کر سونا ہو جائے گی۔ (12) چنانچہ ایک بار ایک عورت نے اپنی دیگچی کو اس کے جسم سے چھوایا' جب رنجیت سنگھ کو اس کا پتہ چلا کہ لوگ اس کے بارے میں یہ سوچتے ہیں تو اس نے اس عورت کو انعام میں سونا دیا۔

فقیر وحیدالدین نے رنجیت سنگھ کے ایک فرمان کی نقل شائع کی ہے جس میں اس نے حکم دیا ہے کہ اس کی مملکت میں رہنے والے تمام لوگوں کی حفاظت کی جائے۔ اس نے خصوصی طور پر اعلان کیا کہ وہ کبھی بھی یہ برداشت نہیں کرے گا کہ لکڑہارے چارہ فروخت کرنے والے' تیل بیچنے والے' اور گھوڑوں کی نعل بندی کرنے والوں کے ساتھ ظلم ہو اور عمال انہیں ستائیں۔ اس نے اپنی حکومت کے عہدیداروں کو خبردار کیا کہ رعیت کو ظلم و ستم سے بچائیں' اور ہر فرد کی جان و مال کی حفاظت کریں۔ (13)

تاریخ کی ستم ظریفی یہ ہے کہ رنجیت سنگھ نے اپنی زندگی کا بڑا حصہ جنگ و جدل میں گزارا' اس لیے مورخوں اور محققین کے لیے اس کی جنگیں اور اس کی ڈپلومیسی زیادہ اہم ہو گئی۔ سیاست کے اس دھارے میں اس کی اصلاحات اور انتظامی امور اوجھل ہو گئے۔ لیکن ہمارے پاس جو بھی مواد ہے اس کی بنیاد پر کہا جا سکتا ہے کہ وہ ایک دانش مند' سمجھدار' اور روادار حکمراں تھا۔

References

1. *Naqush* (Lahore Number) February, 1962, p. 370.

2. Masson, Charles: *Narrative of various Journeys in Balochistan, Afghanistan, and the Panjab.* Vol. I, OUP, Karachi 1974, p 432.

3. Grey, C: *European Adventurers of Northern India.* Falcon Books Lahore 1982, p. 12.

4. Kohli, Sitaram: *Ranjit Singh,* Allahabad, 1993, p. 316.

5. Fakir, Syed Waheeduddin: *The Real Ranjit Singh* Karachi 1966, p. 20.

6. *Naqush,* p. 371.

7. Grewal, J. S.: *The Sikhs of the Punjab* (The New Cambridge History of India) Cambridge 1990, p. 112.

8. Fakir, p. 23; *Naqush,* 371.

9. Fakir, p. 121; Masson, p. 440.

10. Masson, p. 439.

11. Grewal, p. 117.

12. Fakir, p. 166.

13. Ibid., pp. 32, 33.

رنجیت سنگھ کے دربار میں یورپین اثر و رسوخ

ڈاکٹر پرویز وندل

تاریخی ارتقاء میں طریقہ کار یعنی مینجمنٹ (Management) کا بھی ایک منفرد رول رہا ہے۔ جنگی ہتھیار، فوج کی تعداد، انفرادی بہادری کے علاوہ بہتر فوجی نظم و نسق کا جنگی نتائج پر گہرا اثر ہوتا ہے۔ تاریخ میں کئی دفعہ یوں ہوا کہ بہتر جنگی طریقہ کار سے ایک فریق اپنے مد مقابل پر حاوی ہوا۔ مہاراجہ رنجیت سنگھ کو بھی اس چیز کا پورا احساس تھا۔ اور وہ ہر وقت اس کوشش میں رہتا تھا کہ اس کی فوج مضبوط تر ہو۔ اور اس کے لئے وہ اپنی فوج کے جنگی طریقہ کار (Taetic) اور نظم و نسق کو بہتر سے بہتر کرنے میں ہمہ وقت مصروف رہتا۔ اس ضمن میں اس نے یورپین جنگی طریقہ کار سے استفادہ حاصل کرنے کی بھرپور کوشش کی۔ اس میں اس نے دو قسم کے لوگوں سے سیکھا۔ ایک تو وہ یورپی تھے۔ جو سیاحت کے بہانے اس کے علاقے میں آئے اور اس سے ملاقات کی۔ اور دوسرے وہ جنہیں مہاراجہ نے باقاعدہ اس مقصد کے لئے ملازم رکھا۔

مہاراجہ رنجیت سنگھ سے پہلے کا دور ایک مسلسل گڑبڑ کا زمانہ تھا۔ پرانا نظام پرانے رسوم و رواج، پرانے حکمران اور ان کا حکومتی ڈھانچہ (Structure) ہر جانب ٹوٹ رہا تھا۔ مغل سلطنت ماسوائے نام نہاد بادشاہ کے مکمل طور پر بے بس ہو چکی تھی۔ انگریز ہندوستان کے بیشتر رقبہ پر قابض ہو چکے تھے۔ اور پنجاب میں نادر شاہ اور ابدالی کے مختلف حملوں سے امن معیشت اور حکومتی نظام کو سخت نقصان پہنچ چکا تھا۔ اس خلاء میں چھوٹی چھوٹی ریاستیں ابھر آئی تھیں۔ ان میں بیشتر سکھوں کی تھیں اور باقی ہندو اور مسلمانوں کی۔

سکھوں کے مختلف گروہ بھی آپس میں لڑ مر کر چھوٹی چھوٹی ریاستوں میں بٹ گئے تھے۔ مہاراجہ رنجیت سنگھ نے ان چھوٹی ریاستوں کو اکٹھا کیا۔ پنجاب کے بیشتر حکمران' راجاؤں اور نوابوں کو زیر کیا۔ اور ایک مضبوط ریاست کو منظم کیا۔ اس کامیابی میں مہاراجہ کی بہتر سوچ اور بہتر طریقہ کار کا بڑا حصہ تھا۔ وہ ہر نئی چیز کو غور سے "دیکھتا" "سمجھتا۔" اس کے بارے میں سوال کرتا۔ اور اس سے استفادہ حاصل کرنے کی کوشش کرتا۔ یورپین سیاح لکھتے ہیں کہ مہاراجہ اس قدر سوالات کرتے کہ وہ جواب دیتے دیتے تھک جاتے۔

انیسویں صدی کے پہلے حصے میں یورپین امپیریل ازم (Imperialism) تیزی سے پھیل رہا تھا۔ اور یورپین ممالک کے مابین ایک زبردست دوڑ لگی ہوئی تھی۔ یہ دوڑ نئے علاقے اور ان پر قبضہ کرنے کی دوڑ تھی۔ اس دوڑ میں تین بڑے کھلاڑی برطانیہ' فرانس اور روس تھے۔ برطانیہ اور فرانس میں اس وقت کے معیار کے حوالے سے عالمی جنگیں ہوئی۔ جن میں برطانیہ کامیاب رہا۔ اور روس بھی ایک عالمی قوت بن کر سامنے آیا۔ روس نے اپنی وسعت کے لئے وسطی ایشیا کی طرف قدم بڑھائے اور افغانستان اور ہندوستان پر نگاہیں ڈالیں۔ اس برطانوی اور روسی کشمکش کو Hopkick Peter نے اپنی کتابوں بالخصوص "The Great Game" میں تفصیل سے بیان کیا ہے۔

اٹھارویں صدی اور انیسویں صدی کے شروع میں کئی یورپین سیاحوں کی توجہ کا مرکز وسطی ایشیا اور ہندوستان تھے۔ یورپین امپیریل ازم (Imperialism) کا ہراول دستہ یہ جاسوس جغرافیائی سوسائٹی (Geographic Society) کے ایجنٹ اور مہم جوئی (Adventure) کے شوقین لوگ تھے۔ یہ حضرات ان علاقوں میں جاتے جو یورپ کے لئے نئے تھے۔ اور ان نئے علاقوں کا سروے کرتے۔ وہاں کے بارے میں تجارتی معلومات' دوائیوں کے لئے جڑی بوٹیاں اور سب سے بڑھ کر وہاں کے سیاسی نظام کے بارے میں اطلاعات اکٹھی کرتے۔

مہاراجہ رنجیت سنگھ کے زمانے میں جو قابل ذکر سیاح یا جاسوس پنجاب آئے۔ ان

میں Moor Craft اور Burnes تھے۔

Moor Craft ہندوستانی برطانوی فوج میں ڈنگر ڈاکٹر Dr. Vetermay تھا۔ اور گھوڑوں کی دیکھ بھال پر متعین تھا۔ اس نے ہندوستانی انگریز حکمران کا پروانہ لے کر پنجاب اور وسطی ایشیا میں گھوڑوں کی تلاش میں کافی سفر کیا۔ اور اطلاعات اکٹھی کیں۔

1831ء میں الکزنڈر برنس (Alexander Burns) مہاراجہ رنجیت سنگھ کے لئے انگریز بادشاہ کی طرف سے گھوڑے اور ایک بگھی تحفہ کے طور پر لایا۔ یہ گھوڑے اور بگھی بڑی سوچ سمجھ کر کشتی پر دریائے سندھ کے راستے بھیجی گئی۔ اس کا اصل مقصد دریائے سندھ کا سروے کرنا تھا۔ برنس (Burns) نے بڑی تفصیل سے دریائے راوی پر آتے ہوئے پنجاب کے اس علاقے کا بھی جائزہ لیا۔ مہاراجہ ان کے عزائم سے بخوبی واقف تھے۔ اور ان پر کڑی نظر رکھے ہوئے تھا۔ ملاقات پر ان سے سوالات کر کر کے خود ان سے اطلاعات اکٹھی کیں۔

مہاراجہ رنجیت سنگھ برطانوی فوج میں نظم و نسق اور جنگی طریقہ کار سے بڑا متاثر تھا۔ کہا جاتا ہے کہ امرتسر میں برطانوی انگریز فوج اور سکھوں کے درمیان ایک چھوٹی سی جھڑپ ہوئی۔ جس میں ہندوستانی انگریز فوج کے چند سپاہیوں نے اپنے سے بہت بڑے مسلح ہجوم کو شکست دی۔ ہوا یوں کہ برطانوی فوج نے اپنی بہتر طریقہ فائرنگ سے سکھوں کی بہت بڑی تعداد پر برتری حاصل کرلی۔ مہاراجہ رنجیت سنگھ نے خود یہ واقعہ دیکھا اور اپنی فوج کو یورپین لائنوں پر منظم کرنے کا فیصلہ کیا۔ شروع میں تو انہوں نے چند ہندوستانی برطانوی فوج کے سپاہیوں کو ملازم رکھا۔ تاکہ وہ سکھ فوج کو یورپین انداز میں منظم کریں۔ اور اس کو ڈرل کرائے۔ یہ سپاہی عام طور پر برطانوی فوج کے بگھوڑے تھے۔ اور ان کی اہلیت بھی خاص نہ تھی۔

اسی اثناء میں چند یورپین افسران سکھ دربار میں حاضر ہوئے۔ یہ لوگ فرانس کی شکست کے بعد یورپ سے نکلے۔ اور ایران کے راستے رنجیت سنگھ کے دربار میں پہنچے۔ اور ملازمت کی خواہش کی۔ مہاراجہ رنجیت سنگھ نے ابتدائی تفتیش کے بعد انہیں ملازم رکھ لیا۔ اور ان کو سکھ فوج کو نئے سرے سے منظم کرنے کو کہا۔ اب تک سکھ

فوج کا رول ماڈل افغان فوج تھی۔ یعنی تلوار اور گھوڑا' توپ بندوق ہونے کے باوجود یہ فوج ایک نسبتاً کم منظم جتھے کی مانند تھے۔

یورپین افسران میں پہلے جناب وینتورا (Ventura) اور الارڈ (Allaed) آئے۔ یہ دونوں فرانسیسی فوج میں رہ چکے تھے۔ چار سال بعد جناب کورٹ (Court) اور اری ٹابل (Aritable) آئے۔ مہاراجہ نے ان کو بڑی تنخواہ پر رکھا۔
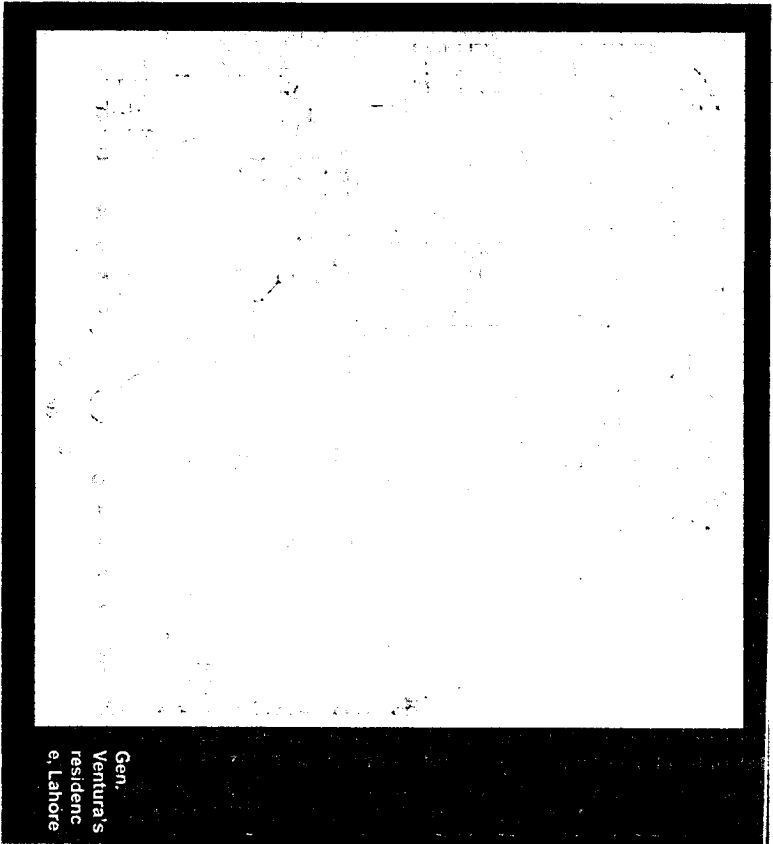
Gen. Ventura's residenc e, Lahore

جناب وینتورا (Ventura) نے لاہور میں ایک گھر بنایا۔ جو کہ آج چیف سیکرٹری (Chief Secretary) کا دفتر ہے۔ اس کا نقشہ دلچسپی کے لائق ہے۔ یہ یورپین طرز تعمیر کے مطابق نہیں بلکہ ہندوستان میں انگریزی تعمیر یعنی کولونیل طرز کا ہے۔ ایک

بڑا کمرہ اور بہت سے۔ مگر چھوٹے کمرے اور چاروں طرف ورانڈہ لاہور میں یہ اپنی طرز کا پہلا گھر تھا۔ اور بعد میں جب انگریزوں نے لاہور چھاؤنی بنائی۔ تو یہ طرز تعمیر عام اور مقبول ہوا۔ اور آج بھی بڑے گھروں کے لئے یہ ہی مثال ہے۔ یہ نقشہ یہ بھی بتاتا ہے کہ سکھ پنجاب اور انگریز ہندوستان میں نقل و حمل یعنی تبادلہ عام تھا۔ وینتورا نے 1825ء میں لدھیانہ میں ایک یورپی خاتون سے شادی کی۔ اور یہ گھر اسی تاریخ کے لگ بھگ بنا۔ پیچھے کی طرف انہوں نے ایک صحن دیا جو اپنے کمروں سمیت گویا ایک روائتی زنانہ بنا۔ جہاں ان کی یورپین بیوی رہتی تھیں۔ یوں یہ گھر کولونیل طرز اور مقامی قدروں کا عکس ہے۔

یورپین افسران نے سکھ فوج کو چار اہم چیزیں سکھائیں۔

1- فوج کی نقل و حمل اور حرکت میں نظم و ضبط یعنی جنگ کے دوران نظم و نسق برقرار رکھنا ہے۔ حملہ کے وقت اور نہ ہی پسپائی میں نظم و ضبط کو ہاتھ سے جانے دینا۔ موقع کے مطابق اور حکم ملنے پر پہلے سے تہہ شدہ صفوں میں اکٹھے ہونا۔ حملہ میں آگے بڑھنا منظم طریقہ سے مڑنا پسپائی پر ترتیب سے پیچھے ہٹنا۔ اور پھر جوابی حملہ کی تیاری میں منظم ہونا۔ اور گرتے ہوئے فوجیوں کی جگہ لینا اور پہل نہ کرنا۔

بہت جنگوں میں یہ مثالیں ملتی ہیں کہ ایک اہم موقع پر فوج کی منظم کاروائی نے لڑائی کا رخ بدل دیا۔ اس طرح کی منظم موومنٹ کی صلاحیت پیدا کرنا آسان نہیں۔ سکھ فوج کی تمام تربیت و روایت ایک جتھہ اور ہجوم کی مانند تھی۔ جو انفرادی بہادری جوش و خروش اور گھوڑ سواری کے بدولت کئی لڑائیاں جیت چکی تھی۔ ان کے لئے یہ طریقہ کار اور ڈرل نئی اور عجیب تھی۔ کچھ سکھ سرداروں نے تو سراسر ایسے نئے طریقوں کا مذاق اڑایا اور انہیں اپنانے سے انکار کر دیا۔ مہاراجہ رنجیت سنگھ نے ان سرداروں کی سرزنش کی اور یورپی افسران کے حکم ماننے پر زور دیا۔ اور ایک دو موقعہ پر تو اپنے سکھ سرداروں کو سزائیں بھی دیں۔

2- مسلسل فائر کرنے کی اہلیت ایک زبردست ہتھیار بن جاتا ہے۔ یہ اہلیت خاص طور پر دفاعی صورت حال میں بہت کام آتی ہے۔ ان وقتوں میں بندوق و توپ کو ہر فائر

کے بعد پھر سے فائر کے لئے تیار کرنا پڑتا یعنی دوبارہ سے بھرنا کرنا ہوتا۔ آجکل کی مشین گن نہیں تھی۔ اس ری لوڈنگ پر کافی وقت لگ جاتا تھا۔ اس طرح ہر فائر کے بعد ایک ایسا وقفہ ملتا جس میں دشمن کے چڑھ دوڑنے کا خطرہ رہتا۔ اس کا علاج ایک منظم اور مسلسل فائر کرنے کا طریقہ تھا۔ جو طریقہ اپنایا گیا اسے ہم 3' 2' 1 یا 3 مرحلہ وار فائر کہہ سکتے ہیں۔ یہ یوں تھا کہ فوج کا کوئی دستہ تمام یکدم فائر نہ کرتے تھے بلکہ 3 حصوں میں کھڑے ہو جاتے۔ ایک گھٹنوں کے بل ہو کر فائر کرتے۔ اور اس کے بعد اٹھ جاتے۔ گھٹنوں کے بل ہو کر فائر کرنے سے نشانہ بہتر ہوتا تھا۔

دوسرا دستہ فائر کے لئے تیار کھڑا ہوتا۔ اور پہلے دستے کے فائر کے بعد ان کی جگہ لیتے۔ تیسرا دستہ اپنی بندوق دوبارہ فائر کے لئے تیار کرتے۔ اس طرح 3'2'1' 3'2'1 فائر کرنے کی اہلیت والا ایک چھوٹا گروپ اپنے سے بہت بڑے بے منظم جتھے پر حاوی ہو جاتا۔

-3 توپ کی نشانہ میں مہارت۔ توپ ساز اور سائنس دان توپ کی ترقی میں گولا بڑا کرنے اور دور نشانے پر پھینکنے کی صلاحیت بہتر کرنے پر زور دیتے۔ بڑی توپ ڈھالنے کا فن بڑا قیمتی فن تھا۔ جس کی بڑی قدر ہوتی۔ بحری جنگ میں البتہ بات بدل جاتی۔ جہازوں میں زیادہ وزنی توپ سے الٹا نقصان ہو سکتا تھا۔ نشانہ لگانے میں بحری توپ کا بنیادی مسئلہ یہ تھا کہ بحری توپ خانے کو ایک ہلتی ہوئی سطح سے دوسرے ہلتے ہوئے نشانے کو مارنا ہوتا۔ یہ حالت زمین توپ خانے سے بہت فرق تھی اس طرح سمندری توپ خانہ نشانہ سازی میں زیادہ مہارت حاصل کر لیتے' یہ بہتر نشانہ بازی توپ کا ڈیزائن' نشانے لگانے کے آلہ اور توپچی کی مہارت کا نتیجہ ہوتا۔ یہ بات تو واضح ہے کہ چھوٹا گولہ جو نشانہ پر لگے اس بڑے گولہ سے نشانہ پر نہ لگے بہتر تھا۔ یوں بحری توپ کم وزنی ہوتی اور نشانہ بھی بہتر ہوتا۔ اور موومنٹ میں آسانی ہوتی۔ ایک واقعہ جس سے مہاراجہ رنجیت سنگھ بہت متاثر ہوا وہ یہ ہے کہ ایک مشق کے دوران برطانوی فوج نے دوڑتے گھوڑے کے پیچھے بندھی ہوئی توپ کو گرتے اور ٹوٹتے دکھایا۔ اور پانچ منٹ کے اندر سپاہیوں نے اسے پھر سے جوڑ کر قابل استعمال کر لیا۔ یہ پھرتی منظم ڈرل اور

مہارت رنجیت سنگھ نے اپنی فوج میں بھی اپنائی اور یورپین افسران کی بدولت اپنی فوج کو سکھائی۔

4- اس سارے مقصد کے لئے سکھ فوج کو لباس بدلنے کو بھی کہا۔ یورپین افسران نے خاص ایک ڈریگون کی بٹالین تیار کی اور انہیں ڈرل سکھائی Dragoon گھڑسوار فوج جو کہ تلوار اور نیزے کی جگہ بندوق استعمال کرتے۔ دوڑے گھوڑے سے وہ نشانہ لگاتے اور پھر سے بندوق کو لوڈ کرتے۔ وہ تلوار بھی رکھتے لیکن وہ ثانوی ہوتی اور دست بہ دست کے وقت کام آتی۔

یہ ڈریگون بڑے اثر انداز ہوتے اور دور سے ہی دشمن کو بے بس کرتے اور خود ان کا نشانہ نہ بنتے۔

ساری بات کا مقصد یہ کہنا ہے کہ انگریز اور یورپین کی 19 صدی کی ٹکنالوجی کا مقابلہ ہندوستان کے 15 اور 16 صدی سے کیا اور ہار گئے۔ مہاراجہ واحد حکمران تھے جنہوں نے یوں یورپین افسران کی مدد سے اپنی فوج اور سلطنت کو انتہائی مضبوط کر لیا تھا۔ مہاراجہ نے ان کی اندھی تقلید نہ کی لیکن ان سے سیکھتے رہے۔ اور ان کے زندگی میں انگریز نے چناب پر حملہ کی ہمت نہیں کی۔ ان کی وفات کے بعد بھی انگریز نے خالصہ کو خرید کر ہی ان کو تباہ کیا۔ پر یہ ایک الگ داستان ہے۔

پاؤلا ڈی ایویٹا بائیل

سی- گرے/امجد محمود چودھری

رنجیت سنگھ کے یورپی افسران پر نظر ڈالیں تو جتنی بھی دلچسپ شخصیات سامنے آتی ہیں ان میں سے کسی کی شخصیت بھی اتنی پیچیدہ نہیں ہو گی جتنی اس مہم جو کی تھی جس نے اپنی عملی زندگی کا آغاز توپچکانے کی ملازمت سے کیا۔ پھر اپنی بے رحم، شخصیت اور توانائی کے زور اور صلاحیتوں کے بل بوتے پر دو مختلف ایشیائی افواج میں اعلیٰ مقام حاصل کیا۔ اس نے ایشیا کی بدمعاش ترین اور ناقابل اعتبار نسلوں میں سے ایک نسل پر اتنی کامیابی سے حکومت کی کہ اس سے پہلے ایسی کوئی نظیر نہیں ملتی۔ اور اس عمل کے دوران اس نے اپنے لئے بے پناہ دولت بھی اکٹھی کی، اگرچہ مشکوک طریقے استعمال کر کے۔

ایجرولا میں واقع اس کے مزار پر اس کی زندگی کے لئے دوڑ دھوپ کا خلاصہ کچھ یوں مذکور ہے۔

لیفٹیننٹ جنرل پاؤلوڈی ایویٹا بائیل
پیدائش اکتوبر 1791 مرگ 28 مارچ 1850
لیجن آف آنر کا خطاب یافتہ نائٹ تمغہ اعزاز سان فرڈی ننڈ آف نیپلز
شاہ افغانستان درانی کا خطاب یافتہ، شیر ببر اور آفتاب کا اعزاز، اور دو شیروں اور تاج فارس کا اعزاز، پنجاب حکومت کی طرف سے تمغہ اعزاز
نیپلز کا فرسٹ لیفٹیننٹ- کرنل فارس، جنرل فرانس و پنجاب اور

گورنر پشاور

فقید المثال عزت اور شان والا۔ (1)

اعزازات کی تعداد یقیناً مرعوب کر دینے والی ہے؟ اگرچہ ان چھ میں سے پانچ محض چمکدار دھاتی چادر اور شیشے کے بنے ہوئے تھے جو اپنے بنانے والوں کا نام زندہ رکھنے کے لئے بھی سلامت نہ رہ سکے تاہم ان کی حیثیت قدر شناسی اور یورپی بہادری کے پرانے پرشکوہ تمغہ جات کی تھی۔ آج بھی کئی شہزادے اور سپاہی جو رنگے برنگے ربن سے آراستہ زرہ بکتر پہنتے ہیں انہوں نے کئی بھدے بڑے تمغے بڑے فخر سے اپنے سینوں پر سجائے ہوتے ہیں ایویٹا بائیل بھی شاید اسی فخر سے اپنے کثیر تمغے پہنتا ہو گا۔

فقید المثال عزت اور شان والا! خوب۔ مرنے والے کے بارے میں اچھے الفاظ استعمال کرنا نیکی کا کام ہے مگر "انسان جو برائیاں کرتا ہے وہ اس کے مرنے کے بعد بھی زندہ رہتی ہیں۔" محاورہ بھی اتنا ہی جاندار ہے۔ اور ایویٹا بائیل کے اخلاقی جرائم اور شیطانی مظالم آج بھی ان اضلاع میں کہ جن پر اس نے کبھی حکومت کی تھی' روایتی لوک کہانیوں یا دہشت ناک قصوں کی صورت میں یاد کیے جاتے ہیں۔ ان میں سے چند کہانیوں کو تو ہم شائع کرنے کا سوچ بھی نہیں سکتے۔

لیکن اگر اس کا مزاج ظالمانہ تھا یا اخلاق برا تھا تو جن لوگوں کے ساتھ اسے معاملات کرنے پڑے ان کو کنٹرول کرنے کے لئے یہ دونوں خامیاں بہت مناسب تھیں۔ اور یہی اس کے ان لوگوں پر کامیابی سے حکومت کرنے کا راز تھا۔ کیونکہ ایسے لوگوں کے ساتھ معاملات کرتے ہوئے یہ دونوں اوصاف تابعداری کروانے اور تحسین کا موجب بن گئے۔ ہم نے اس کے مزاج کی پیچیدگی کی بات کی ہے جو کہ یقیناً چکرا دینے والی بات لگتی ہے۔ تاہم بہت سے ایسے لوگوں نے جو اسے قریب سے جانتے تھے یا مختلف جگہوں پر اس کے ساتھ رہائش پذیر رہے اس پیچیدگی کا ذکر کیا ہے۔ ہم یہاں ہنری لارنس کا حوالہ دیتے ہیں جو کہ ایویٹا بائیل کو بہت اچھی طرح جانتا تھا: (2)

"میں نے ایویٹا بائیل کا نمک کھایا ہے اس لئے اس کے خلاف زیادہ تند باتیں نہیں کر سکتا..... عجیب و غریب طور پر دوسروں کو متاثر کرتی اور دوسروں سے متاثر

ہوتی ایویٹا بائیل کی سوانح حیات تجسس سے بھرپور ہے اور جب اس کی اپنی نسل کے لوگ گزر جائیں گے تو آنے والے لوگ اس پر مشکل سے ہی یقین کریں گے۔"

یہاں ہم ہیولاک' برنیز' میکینن' میکنزی' ایڈورڈز اور ڈیورنڈ کی رائے کا خلاصہ پیش کرتے ہیں۔ یہ تمام لوگ وہ تھے جو ایویٹا بائیل کو اچھی طرح جانتے تھے یا کم از کم سرسری طور پر جاننے سے بہتر معلومات رکھتے تھے۔ اس کی حمایت میں انہوں نے کہا:

"مہربان ترین' کھرا' خوش طبع و خوش مزاج' کسانوں اور چھوٹے تاجروں کے ساتھ احتیاط سے انصاف کرنے والا' ایک ماہر اور زیرک افسر' ایک تیز فہم اور غیر جانبدار جج' ایک سلیم الطبع' مضبوط اور آہنی عزم رکھنے والا انسان اور حضرت سلیمانؑ کی سی بصیرت والا۔"

اور اب اس کے الٹ:

"ایک ظالم دیوث جس نے ایشیا کی ایذا رسانیوں اور قتل و غارتگری کے طریقوں کی لمبی فہرست میں یورپی نکھار پیدا کیا' تند خو اور منتقم مزاج' اپنی خواہشات پوری کرنے کے لئے ہر حد سے گزرنے والا' غیر قانونی فوائد سمیٹنے کا حریص' جس نے محض شک کی بناء پر اور بغیر عدالتی کارروائی کے لوگوں کو تختہ دار پر لٹکایا' ایذا پہنچائی یا ہاتھ پاؤں سے محروم کر دیا' بے رحم اور درگزر نہ کرنے والا' بلا نوش اور ہر مقدس یا آسمانی بات پر طنز کرنے والا۔"

اگرچہ یہ ایک وحشت ناک اور متضاد اوصاف کی فہرست ہے مگر عجیب بات ہے کہ ہر اچھے یا برے وصف کے پیچھے کوئی نہ کوئی جواز موجود ہے۔ اس کے تمام مظالم کی پشت پر تحریری اجازت نامہ موجود ہے۔ ان مظالم میں سے کئی اتنے خوفناک ہیں کہ انہیں بیان نہیں کیا جا سکتا اور قارئین کے مزاج کا خیال کرتے ہوئے یہاں صرف سرکاری طور پر ریکارڈ کئے گئے واقعات کا ذکر ہی کافی ہے۔

ایویٹا بائیل کے کردار پر رائے قائم کرتے ہوئے' اور قاری کو خود رائے قائم کرنی چاہئے' اس کی قومیت کو ذہن میں رکھنا چاہئے۔ مزید برآں فارس میں اس کی مخصوص

تربیت اور پنجابی اور افغان دونوں اقوام جن کے ساتھ اس کا واسطہ پڑا' ان کی ذہنیت اور عادات کو بھی مدنظر رکھا جانا چاہئے۔ اور جیسا کہ ہونگ برجر نے کہا کہ ایویٹا بائیل کی زیادتیوں نے اس کے اپنے دماغ کو بھی متاثر کیا۔ اس سے قطع نظر قاری اپنی بھی رائے قائم کر سکتا ہے۔ کوئی بھی مضبوط حکمران غلطیوں سے پاک نہیں ہو سکتا کیونکہ اگر ایسا نہ ہو تو نہ وہ طاقتور حکمران بن سکتا ہے اور نہ ہی کامیاب حکمران۔

پاؤلو ڈی ایویٹا بائیل اکتوبر 1791 میں ایجرولا میں پیدا ہوا۔ اپنے آٹھ بہن بھائیوں میں اس کا نمبر پانچواں تھا۔ سولہ برس کی عمر میں اس نے نیا پولیٹن ملیشیا کی ملازمت اختیار کر لی۔ تین سال تک خدمات سرانجام دینے کے بعد اس نے نیپلز کے بادشاہ جوکم میورات کی باقاعدہ فوج میں توپخانے میں ملازمت کر لی۔ یہ بادشاہ نپولین بونا پارٹ کا باج گزار تھا۔ پانچ برس تک وہ توپخانے میں خدمات سرانجام دیتا رہا جہاں اسے سارجنٹ میجر کا عہدہ مل گیا۔ اور ریکارڈ میں یہ بات شامل ہے کہ اس کا کردار اتنا شاندار تھا کہ اسے کارکردگی پر خصوصی اعزاز بخشا گیا۔

مارچ 1815 میں میورات اور آسٹریا کے درمیان جنگ چھڑ جانے پر اسے سیکنڈ لیفٹیننٹ کے طور پر کمیشن ملا۔ تاہم اس دوران باقاعدہ لڑائی شروع نہ ہوئی تو اس کے توپخانے کو گیریژن ڈیوٹی پر مامور کر دیا گیا۔ میورات شکست کے بعد بھاگ نکلا تو ایویٹا بائیل اس وقت کے بہت سے دوسروں سپاہیوں کی طرح جو اثر و رسوخ کھوتی بادشاہتوں کی خدمت کر رہے تھے' نہایت آسانی سے وفاداریاں تبدیل کر کے بوربنز سے جا ملا۔ اسے فسٹ لیفٹیننٹ بنا دیا گیا۔ تب اس نے گیتا شہر کے محاصرے کے دوران خدمات سرانجام دیں۔ اس شہر پر ابھی تک میورات کے کچھ حامیوں کا قبضہ تھا۔ یہاں اس نے اپنی بہادری سے نمایاں مقام حاصل کر لیا کیونکہ شدید زخمی ہونے کے باوجود اس نے اپنے توپخانے کو چھوڑنے سے انکار کر دیا تھا حتیٰ کہ حکام بالا کو اس مقصد کے باقاعدہ احکامات صادر کرنا پڑے۔ اس کے سپاہیانہ خوبیوں نے خصوصی توجہ حاصل کر لی اور اسے اتنا فائدہ بہم پہنچایا کہ جب افواج کی تعداد کم کی گئی تو ایویٹا بائیل کو مقامی ملیشیا میں آدھی تنخواہ پر رکھ لیا گیا۔

یہاں اس نے غربت میں کچھ وقت گزارا کیونکہ وظیفے کی رقم اتنی معمولی تھی کہ ایک اطالوی کے لئے بھی اس میں گزر بسر مشکل تھی۔ اور جیسا کہ ایویٹا بائیل ایک پرجوش اور آہنی عزم کا مالک تھا وہ جلد ہی اس گھٹیا زندگی سے اکتا گیا جس میں بہتری کے کوئی آثار نظر نہ آتے تھے۔ اس طرح جنوری 1817 میں اس نے اپنی اس ملازمت سے استعفیٰ دے دیا جس میں نہ عزت تھی اور نہ ہی آسائش۔ ایسا کرتے ہوئے اس نے اپنے فوجی کیریئر ہی کو خیر باد کہنے کا فیصلہ کر لیا تاکہ کسی سول شعبے میں عزت کی زندگی گزار سکے۔ تاہم اسے پتہ نہ تھا کہ اس کا یہ فیصلہ عارضی ثابت ہو گا۔ لیکن یہاں اس کا پسندیدہ مقولہ پیش کیا جائے کہ "اللہ کریم ہے" تو ایویٹا بائیل کی قسمت اس کے اپنے ہاتھ سے لکھی گئی تھی کہ وہ رزق کی تلاش میں سپاہی بن کر اجنبی سرزمین پر جائے گا۔

اس دوران اس نے ایک اسپینی تاجر کے مال تجارت کے نگران کی حیثیت سے ملازمت اختیار کر لی۔ اس سلسلے میں بحیرہ روم کی مختلف بندرگاہوں کا دورہ کرتے ہوئے وہ الجیریا پہنچا جہاں قسمت بنانے کا ایک موقع ملا۔ مگر بدقسمتی سے طاعون کی وبا پھوٹ پڑنے کی وجہ سے منصوبہ مکمل ہونے سے پہلے ہی جہاز کو بندرگاہ چھوڑنا پڑی۔ تاہم بدقسمتی جہاز کے مسافروں کا پیچھا کرتی رہی یہاں تک کہ وہ رہون کے دہانے میں تباہ ہو گیا۔ تاہم ایویٹا بائیل کی قسمت میں ابھی مزید پریشانی لکھی تھی کیونکہ ساحل پر پہنچنے پر جب لوگوں کو پتہ چلا کہ وہ طاعون زدہ علاقے سے آئے ہیں تو انہیں ایک حویلی میں محصور کر دیا گیا۔

آخرکار جب ایویٹا بائیل کو رہائی ملی تو نہ اس کے پاس رقم بچی تھی اور نہ ملازمت۔ اسے اچھی خاصی پریشانی کا سامنا کرنا پڑا پھر اسے چند فرانسیسی افسروں کی مدد ملی جو کہ بوناپارٹ کی فوج سے الگ کر دیئے گئے تھے۔ ان کے لئے مارسیلز نے باہر کی دنیا میں داخلے یا خروج کے لئے بندرگاہ کا کام دیا۔ دوسروں ملکوں میں یہ لوگ فوجی ملازمتوں کی تلاش میں گئے تھے۔ ان میں سے ایک حال ہی میں فارس میں خدمات انجام دینے کے بعد لوٹا تھا۔ قابل فوجی افسروں کے لئے مشرق میں موجود ملازمت کے مواقع

کے بیان نے ایویٹا بائیل کو یقین دلا دیا کہ اس کا مستقبل وہیں بن سکتا ہے۔

میدان تجارت میں اپنے مستقبل کے عزائم کو پس پشت ڈال کر اس نے دوبارہ اپنے پہلے پیشے کی طرف رجوع کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ اور وہ بھی مشرقی ماحول میں اور کسی غیر ملکی پرچم تلے۔ یہ یاد رہے کہ اٹھارویں صدی کے اواخر کے کامیاب مہم جوؤں میں سے چند ایک مثال کے طور پر بورکن، پیرون، ایل اسٹینو اور ڈی بوگن ابھی تک فرانس ہی میں رہ رہے تھے۔ ان کی کامیابیوں کے فسانوں نے بوناپارٹ کے سابقہ مہم جو افسروں میں ان کی پیروی کرنے کی جوت جگا دی تھی۔

ایویٹا بائیل نے قسطنطنیہ میں فارس کے سفیر کے نام ایک سفارشی رقعہ حاصل کیا۔ سفیر نے اس سفارش کو مان کر اسے تہران روانہ کر دیا۔ ان دنوں شاہ فارس کی افواج دو گروپوں میں منقسم تھی۔ ایک گروہ کو انگریز تربیت دے رہے تھے اور دوسرے کو بین البراعظمی مہم جو افسران۔ ان حالات سے سابقہ اس وقت پیش آیا جب فتح علی شاہ نے نامزدگی کے اپنے اختیار کو استعمال کرتے ہوئے اپنے ڈھیروں بیٹوں میں سے عباس مرزا کو جانشینی کے لئے چن لیا۔ سب سے بڑے بیٹے محمد علی مرزا کے علاوہ تمام نے اس نامزدگی کو قبول کر لیا۔ محمد علی مرزا نے اس نامزدگی کے خلاف اعلان بغاوت کرتے ہوئے کرمان شاہ میں اپنی گورنری کی طرف لوٹ آیا اور وہاں ایک فوج تیار کرنا شروع کر دی۔

ایشیائی شہزادوں کی افواج میں کام کرتے ہوئے انگریزوں اور فرانسیسیوں کے درمیان صدیوں پرانی دشمنی دوبارہ شروع ہو گئی کیونکہ عباس مرزا نے ہندوستانی فوج سے کئی افسروں اور جوانوں کی خدمات حاصل کر لیں۔ جبکہ اس کے مد مقابل بھائی نے بین البراعظمی مہم جوؤں کو اپنی ملازمت میں رکھ لیا۔ ان کے درمیان ایویٹا بائیل جلد ہی نمایاں ہو گیا اور اسے کردش لیویز کے ایک دستے کو نظم و ضبط سکھانے اور تربیت دینے پر مامور کر دیا گیا۔ کرد لوگ فارس کے پہاڑی علاقوں کے رہائشیوں میں سے سب سے زیادہ وحشی اور اجڈ لوگ تھے۔ تاہم اس نے اس ذمہ داری کو اس طرح بحسن و خوبی سرانجام دیا کہ جب بغداد پر ایک ناکام حملے کے دوران محمد علی مارا گیا تو عباس مرزا نے ایویٹا بائیل اور اس کی زیر کمان دستہ کو اپنی ملازمت میں لے لیا۔ علاوہ ازیں اس

نے اسے گرد اضلاع کے سول نظم و نسق کو سنبھالنے پر بھی مامور کر دیا۔ یہاں پر نوجوان مہم جو نے ٹیکسوں کی وصولی جیسے مشکل کام کو بھی بخیر و خوبی انجام دیا۔

یہی وہ جگہ تھی جہاں اس نے سب سے پہلے خوف' بے رحم تشدد اور بڑے پیمانے پر پھانسیوں کے ذریعے حکومت کرنے کے نظام کا تجربہ کیا۔ یہی طریقہ کار اس نے بعد میں پشاور اور خیبر کی سرحد کے شورش پسندوں پر بھی آزمایا اور لوگوں کے دلوں میں اپنی انتظامیہ کے لئے خوف اور اطاعت کے جذبات پیدا کئے۔ ان ہتھکنڈوں نے (جب دوسروں پر آزمایا گیا) ان سکھوں کو دبانے کے لئے بھی کام کیا جو رنجیت سنگھ سے نفرت کرتے تھے۔ یہ بات کہ ایویٹا بائیل ایشیائی وحشیوں کی نفسیات کو اچھی طرح سمجھ چکا تھا اس حقیقت سے بھی ظاہر ہوتی ہے کہ پشاور میں اس کے ذاتی محافظ ان لوگوں پر مشتمل تھے جن کے بیسیوں یا سینکڑوں رشتے داروں کو اس نے یا تو تشدد کا نشانہ بنایا تھا یا پھانسی پر چڑھایا تھا۔ اور یہ کہ جب اس کے سکھ سپاہیوں نے بغاوت کی تو وہی قبائلی جن کے بیٹے' بھائی اور باپ تختہ دار پر لٹکائے گئے تھے جوق در جوق اس کی مدد کو پہنچ گئے۔

فارس میں اپنی خدمات کے صلے میں اسے کرنل کے عہدے اور دو تمغہ جات سے نوازا گیا۔ مگر چھ سال بعد جب اس نے مزید ترقی کے مواقع نہ پائے' کیونکہ تمام اعلیٰ عہدوں پر انگریز افسر براجمان تھے' اور اس جیسے سنگدل اور بے رحم شخص کے لئے یہ بات عجیب سی لگے گی کہ اسے گھر کی یاد بھی ستانے لگی تو اس نے استعفیٰ دے دیا اور واپس نیپلز لوٹ آیا۔ یہاں بادشاہ اور ملکہ نے اس کا پرتپاک استقبال کیا جس کی ایک وجہ یہ تھی کہ وہ اپنے ساتھ قیمتی تحفے لایا تھا اور دوسری وجہ یہ کہ اس کی شہرت اس سے پہلے ہی اس کے ملک پہنچ چکی تھی۔

لیکن اگر اس کا خیال تھا کہ اسے کوئی مناسب فوجی ملازمت مل جائے گی تو یہ اس کی غلط فہمی تھی کیونکہ اسے بس ایک گھٹیا نمائشی اعزاز سے نوازنے پر اکتفا کیا گیا۔ علاوہ ازیں ایک ایسے شخص کے لئے کہ جس نے دور دراز کے علاقوں میں لمبے سفر کئے ہوں اور اپنے خوابوں سے بھی زیادہ اختیارات استعمال کئے ہوں ایک دیہاتی گھر کی یکسانیت

اور محدود دائرے نے جلد ہی بے زار کر دیا۔ لہٰذا ایویٹا بائیل نے مشرق کو واپسی کا قصد کر لیا۔ بیرون ہیوگل کہتا ہے: (3)

"ایویٹا بائیل ایک اطالوی باشندہ تھا جس نے چند سال کے لئے فارس میں خدمات انجام دی تھیں۔ اپنے آبائی گھر کی چاہت نے اسے واپس اسے دیکھنے پر مجبور کر دیا مگر جلد ہی اسے یہ اتنا بے رونق لگا کہ اس نے یہ علاقہ چھوڑ دیا اور مشرق میں واپس جا کر ایک خود مختار شہزادے کی ملازمت اختیار کر لی۔"

ونچورہ کی کامیابی کا سن کر ایویٹا بائیل نے خط لکھ کر اس سے درخواست کی کہ وہ اپنے اثر و رسوخ کو استعمال کرتے ہوئے رنجیت سنگھ کے دربار میں ملازمت دلا دے۔ ونچورہ نے درخواست مان لی۔ رنجیت سنگھ نے اس شرط پر ملازمت دینے کا وعدہ کر لیا کہ امیدوار خود لاہور میں پیش ہو اور اپنی اہلیت ثابت کرے۔ اسے تلقین کی گئی کہ وہ وہی راستہ چنے جو کہ اس کے پیش رووں نے چنا تھا۔ یہ تو ظاہر نہیں ہوتا کہ ونچورہ نے اسے رقم بھیجی تھی تاہم یہ ایک یقینی امر ہے کہ اس نے ایویٹا بائیل کے استقبال کے لئے فنڈ اور گائیڈ ہرات بھیجا تھا۔ جناب کاٹن جنہوں نے ایویٹا بائیل کی سوانح عمری لکھی ہے' کہتے ہیں کہ اس سفر کے واقعات پر مشتمل ڈائری ابھی تک ایجرولا میں موجود ہے۔ اور یہ کہ جو اشیائے تجارت ساتھ لے جائی گئی تھیں وہ گھٹیا زیورات' گھڑیوں' آلات موسیقی اور نامعقول تصاویر پر مشتمل تھیں۔

یہ تو پتہ نہیں چلتا کہ کورٹ یورپ سے ہی اس کے ہمرکاب رہا تاہم چونکہ موخرالذکر کی سفر کی تفصیل یزد سے شروع ہوتی ہے اس سے ہم یہ رائے قائم کر سکتے ہیں کہ وہ دونوں وہاں پر اکٹھے ہوئے۔ نامعقول تصاویر لازمی طور پر ایویٹا بائیل ہی نے اشیائے تجارت میں شامل کی ہوں گی کیونکہ تمام رواداروں کے مطابق کورٹ انتہائی سختی سے اخلاقی اصولوں پر کاربند رہنے والے اور عمدہ اطوار کے مالک تھے۔ جبکہ ایویٹا بائیل ان دونوں خوبیوں سے تہی دامن تھا۔ کورٹ کی ڈائری میں ان کے کابل تک کے سفر کی مکمل تفصیل ملتی ہے اور ہم اپنی کہانی وہیں سے شروع کریں گے۔ (4)

25 دسمبر' 1826 کو لاہور کا خبر نویس لکھتا ہے کہ: "دو فرانسیسی افسران کابل میں

ہیں اور لاہور کے راستے پر ہیں۔ دونوں افسران اعلیٰ عہدوں پر فائز رہ چکے ہیں جن میں سے ایک کرنل کے عہدہ پر رہ چکا ہے اور دونوں کے ساتھ بہت سے خدام ہیں۔"

قیاس اغلب یہی ہے کہ خوشحالی کے اس مظاہرے کے لئے رقم و۔نچورہ نے ہی فراہم کی ہو گی جو جانتا تھا کہ نئے آنے والوں کے لئے مواقع بڑھانے کا یہی راستہ تھا کہ وہ اپنی وضع قطع سے اہم اور معزز افراد دکھائی دیتے ہوں۔ حسب معمول رنجیت سنگھ نے انہیں کئی ماہ انتظار میں رکھا اور ماہ اپریل میں کہیں جا کر انہیں باقاعدہ ملازمت میں لیا گیا۔ ایویٹا بائیل کو سات صد روپیہ ماہوار پر ایک پیادہ دستے کا سربراہ مقرر کیا گیا۔ ایک سال کے اندر یہ وظیفہ بڑھ کر بارہ صد روپیہ ماہانہ ہو گیا۔ اور قصہ مختصر کرتے ہوئے ہم یہاں یہ ذکر کریں گے کہ یہ فوجی تنخواہ سال بھر میں ساٹھ ہزار روپیہ لانے لگی۔

یہاں یہ بات تعجب سے خالی نہ ہو گی کہ توپخانے کا آدمی ہوتے ہوئے اسے توپخانے کے لئے خدمات سر انجام دینے کا ذرا بھر موقع نہ دیا گیا۔ 1830 تک وہ فوجی ملازمت میں رہا۔ اس کے دستہ کا پڑاؤ لاہور کے شمال مشرق میں دو میل کے فاصلہ پر واقع مقام نولکھا پر اور کورٹ کی چھاؤنی کے نواح میں تھا۔ اس کے پڑاؤ کے عقب میں چار صد گز لمبا اور تین صد فٹ اونچا جبل الطارق کی ایک شکل کا ایک ٹیلہ تھا جسے بدھ کا آوا کہتے تھے اور اس مقام پر لاتعداد سالوں سے اینٹوں کے جلانے کے نتیجے میں وجود میں آیا تھا۔

اس ٹیلے کی چوٹی پر جو کہ اردگرد کے علاقے اور لاہور جانے کے راستوں پر چھایا ہوا تھا ایویٹا بائیل نے اپنے لئے ایک چھوٹا مگر کسی قلعے کی طرح مضبوط مکان تعمیر کیا جسے میسن کے مطابق بے ڈھنگے پن سے رنگ و روغن سے آراستہ کیا گیا تھا۔ بعد میں یہ مکان سرخیلوں کے ملنے کی جگہ بن گیا جہاں سے پنجاب میں طوائف الملوکی کے منصوبے تیار کئے اور شروع کئے گئے۔ دوسرے دستوں کی طرح ایویٹا بائیل کے دستے کو بھی فوجی ذمہ داریوں کے علاوہ نادہندہ اضلاع سے اکثر ریونیو اکٹھا کرنے اور ان لوگوں کو نکال باہر کرنے کی ذمہ داری بھی سونپی گئی جن کی جاگیریں مہاراجہ ضبط کرنا چاہتا۔

سوہن لال کی تاریخ میں ہمیں یہ بات ملتی ہے کہ ایویٹا بائیل کو مالکان کی عدم موجودگی میں جیسروتہ کے جاگیرداروں کی زمین ضبط کرنے پر مامور کیا گیا۔ چالاک مہاراجہ نے انہیں اس مقصد کے لئے بلا کسی مقصد کے لئے اپنے دربار میں طلبی کا پروانہ بھجوا دیا تھا۔ چونکہ یہ ناخوشگوار ذمہ داری ایویٹا بائیل کو طاقتور لوگوں کے ساتھ الجھا کر مصیبت میں ڈال سکتی تھی اس لئے اس نے اپنا دامن بچانا چاہا اور پیغام بھجوا دیا کہ چونکہ جاگیردار دربار میں موجود ہیں اس لئے مہاراجہ کو ذاتی طور پر انہیں مجھے دیئے گئے احکامات کے بارے میں بتا دینا چاہئے۔ یہاں یہ ذکر کرتے چلیں کہ یہ جاگیریں پھر ضبط نہ کی گئیں۔

دسمبر 1829 میں ایویٹا بائیل کو وزیر آباد کا گورنر مقرر کیا گیا اور یہاں سے اسے ہمیشہ کے لئے فوجی دستے کی کمان کے ساتھ ساتھ گورنری کی ذمہ داری کا بھی اضافہ ہو گیا۔ سول حکومت میں اس کی شد بد کے متعلق ہربرٹ ایڈورڈز لکھتا ہے کہ: (5)

"ایویٹا بائیل اگرچہ ایک پیشہ ور سپاہی تھا تاہم تھامس منرو یا ہنری لارنس جیسی سول حکومت کے لئے اس میں تمام خوبیاں بدرجہ اتم پائی جاتی تھیں۔ یہ الگ بات ہے کہ وہ ان دونوں کے برخلاف فیاضی اور سخاوت سے تہی دامن تھا۔ ایک ایشیائی کی سازش اور چالاکی، یورپی کی کھلی ذہانت اور خود انحصاری، اس شخص کی شقاوت قلبی جو کھلم کھلا کہتا تھا کہ اس کا کوئی خدا نہیں ہے، اور ایک طاقتور سکھ فوج کی مدد سے وہ جلد ہی وادی پشاور پر قابو پانے میں کامیاب ہو گیا۔ اور آج تک (1872) افغان اسے گیدڑوں کے دستے کا شیر انچارج کے طور پر یاد کرتے ہیں۔ کوئی بھی طریقہ جو اس کے معاملے کو سلجھا دے اسے اختیار کرنے سے نہیں ہچکچایا...... راقم الحروف (ایڈورڈز) نے ایک سے زائد بار پشاور کے شہریوں سے سنا کہ کس طرح ایک ماتحت کو جس نے جنرل کے حرم میں سے کسی کی بے عزتی کی تھی ایک مینار سے نیچے لڑھکائے جانے کا حکم دیا۔ (6)

"اس مظلوم کو اس طرح سے لڑھکا دیا گیا مگر ادھ رستے میں اس نے ایک گر کا سہارا لے کر خود کو گرنے سے بچایا اور اونچی اونچی آواز میں ایویٹا بائیل سے خدا کے نام

پر رحم کی درخواست کی۔ ذرا بھی متاثر ہوئے بغیر ایویٹا بائیل نے جواب دیا 'خدا اگر چاہے تو تم پر رحم کر سکتا ہے مگر میں نہیں۔ اسے گگر سے نیچے دھکیل دو'۔"

لارنس اس واقعہ کی تصدیق کرتے ہوئے اضافہ کرتا ہے کہ اس شخص کو جعلی معافی نامہ دکھا کر کہا گیا کہ وہ چھلانگ لگا دے نیچے محافظ اسے تھام لیں گے۔ اس پر یقین دلا کر اسے چھلانگ لگوا کر مروا دیا گیا۔ مگر کئی سال پہلے ہمیں اس واقع کے متعلق کچھ اور خیالات سننے کو ملے جن کے مطابق یہ واقعہ وزیر آباد میں پیش آیا تھا۔ اور ملزمان دو شخص تھے جنہوں نے ایویٹا بائیل کی ایک منظور نظر دیہاتی لڑکی کے ساتھ چھیڑ خانی کی تھی۔ اس نے ایویٹا بائیل کو حقیقت حال بتا دی تو ایک شخص کو مینار سے نیچے پھینک دیا گیا جبکہ دوسرے کو گائے کے کچے چمڑے میں سی کر دھوپ میں رکھ دیا گیا۔ یہ بہت خوفناک تشدد تھا کیونکہ آہستہ آہستہ خشک ہو کر یہ چمڑا سکڑ گیا اور اندر لپٹا ہوا شخص دباؤ سے مر گیا۔

سوہن لال سے ہمیں پتہ چلتا ہے کہ سول گورنروں میں ایویٹا بائیل کا مقام دوسرا تھا۔ کانگڑہ کا گورنر پہلے نمبر پر تھا۔ گیارہ بڑی ریشمی چادروں' چار کشمیری شالوں اور سونے کے دو کنگنوں پر مشتمل خلعت عطا کرنے کے ساتھ اسے جو ہدایات دی گئیں وہ کچھ یوں تھیں: (7)

"تمہیں اپنے ماتحت تمام اشخاص اور جائیداد کی خصوصی دیکھ بھال کرنا ہو گی تاکہ بوڑھے اور غریب لوگوں کا اچھا خیال رکھا جا سکے۔ اور تمہیں اپنے زیر کمان زمینوں' ان سے حاصل ہونے والی آمدن اور دوسرے ذرائع سے حاصل ہونے والی رقومات کا باقاعدگی سے تفصیلی حساب کتاب بھجوانا ہو گا۔"

یہ حقیقت کہ آقا اور اس شخص میں ہمیشہ دوستانہ رہا یہ آشکار کرتی ہے کہ کئی لحاظ سے وہ عادات و اطوار میں ایک دوسرے سے ملتے جلتے تھے۔ دونوں اخلاقیات سے قطعی مبرا تھے' حریص اور بے ایمان تھے۔ دونوں میں واحد فرق یہی تھا کہ اپنے مقاصد کے حصول میں دونوں کا طریقہ کار مختلف تھا۔ ایویٹا بائیل براہ راست قوت کے استعمال' تشدد اور بڑے پیمانے پر پھانسیوں میں یقین رکھتا تھا جبکہ رنجیت سنگھ نے زمانہ سازی'

چالاکی، دھوکہ دہی اور مثلہ کرنے کو ترجیح دیتا تھا اور قوت کا استعمال تبھی کرتا تھا جب باقی تمام ہتھیار ناکام ہو جائیں۔
ممکن ہے کہ ایویٹا بائیل نے اپنے نئے آجر کو حکومت کرنے کے اپنے طور طریقوں سے آگاہ کیا ہو اور کردوں کے ساتھ اس کے تجربے نے رنجیت سنگھ کو متاثر کیا ہوا اور یہ یقین دلایا ہو کہ ایویٹا بائیل میں وہ انسان چھپا ہوا ہے جو شورش زدہ اضلاع پر کامیابی سے حکمرانی کر سکتا اور وہاں سے خزانے کے لئے مال و دولت اکٹھی کر سکتا ہے۔

ایویٹا بائیل کے انتظامی طریقہ کار اور ان کی کامیابی کا ذکر پنجاب ریکارڈز اور ہمعصر مصنفوں کی تحریروں میں جا بجا ملتا ہے اور یہ تمام شواہد ملتے ہیں کہ اگرچہ مجرموں کے لئے وہ وحشیوں کی حد تک ظالم تھا مگر عام رعایا کے لئے اس کا دور حکومت انصاف اور عدل پر مشتمل تھا۔ دو لڑائیوں کے درمیان پنجاب کے معاملے کو طے کرنے کے لئے مقرر کئے گئے برطانوی حکومت کے افسروں میں سے ایک ریئل ٹیلر کے مطابق ایویٹا بائیل کے چلے جانے کے بعد وزیر آباد کے حالات بڑی حد تک بگڑ گئے اور دوکاندار حضرات ایویٹا بائیل کے گزرے دنوں کو "عقلمند اور مضبوط انتظامی" دور کے نام سے یاد کرتے تھے۔ (8)

"ایویٹا بائیل چور کو تختہ دار پر لٹکا دیا کرتا تھا اور یہ نسل اس کے دور میں ناپید تھی۔ اس دور کو مقامی باشندے تحفظ کے عظیم ادوار میں شمار کرتے ہیں۔ ہربرٹ ایڈورڈز ایویٹا بائیل کی طرف سے بطور وزیر آباد گورنر کے متعارف کروائے جانے والے نظام کی بھی تعریف کرتا ہے۔ اس نظام کے تحت ہر گاؤں میں بہی کھاتے رکھوائے گئے تاکہ گورنر کے نام پر کی گئی وصولیاں کاردار یہ اس کا کوئی اور ماتحت ہضم نہ کرے۔ ان کھاتوں میں ادا کی گئی قسط کا اندراج کیا جاتا اور ادائیگی کے موقع پر دونوں فریقوں کے دستخط لئے جاتے۔ ان کھاتوں کو سال میں ایک یا دو دفعہ لاہور میں جانچا جاتا۔"

یہ بعد والا فقرہ اس قیاس کو ختم کر دیتا ہے کہ ایویٹا بائیل نے اپنے اثاثے یا تو

رنجیت سنگھ کو لوٹ کر بنائے یا رعایا کو۔ تاہم وہ امیر کبیر کیسے ہوا اس کا ذکر بعد میں کیا جائے گا۔ لیکن یہ یاد رہے کہ اس کی سالانہ قانونی آمدن ساٹھ ہزار روپے تھی جبکہ جاگیر اور بونس سے تقریباً آدھی اتنی آمدن اور ہو جاتی تھی۔

ایویٹا بائیل کی ذات کا عکس وولف نے پیش کیا ہے جس نے 1832 میں پنجاب کا چکر لگایا تھا۔ (9)

"وولف نے اپنی رہائش مشہور جنرل ایویٹا بائیل کے ساتھ رکھی جو پیدائشی نیا پولیٹن تھا اور اطالوی، فرانسیسی، فارسی اور ہندوستانی یکساں روانی سے بول سکتا تھا۔ وہ وزیر آباد کا گورنر تھا اور علاقے کو اس نے نمایاں ترقی دی تھی۔ اس نے شہر کی سڑکیں صاف رکھی ہوئی تھیں اور اپنے لئے ایک خوبصورت بگھی اور عمدہ محل بنوا لیا تھا۔ وہ ایک خوش مزاج، زیرک اور ہنسنے کھیلنے والا شخص تھا۔ اس نے ایک دفعہ وولف کو بتایا کہ وہ اسے اپنے محافظ فرشتے دکھائے گا۔ پھر وہ اسے اپنی خوابگاہ میں لے گیا جس کی دیواریں رقص کرتی لڑکیوں کی تصویروں سے بھری ہوئی تھیں۔ ایک دن وہ اور وولف ایک ہاتھی پر سوار ہو کر باہر نکلے تو اس نے کہا: "اب میں تمہیں تہذیب کے وہ آثار دکھاؤں گا جو میں نے اس ملک میں رائج کئے ہیں۔ ہاتھی پر سوار ہی وہ شہر سے باہر چلے گئے اور وہاں وولف نے پھانسی کے کئی ایک تختے دیکھے جن پر بہت سے مجرموں کو کھڑا کیا گیا تھا۔

"اگرچہ صاحب بہت ہنس مکھ تھا مگر جب بھی گفتگو اہم معاملات کا رخ کرتی تو وہ سنجیدہ ہو جاتا۔ اگرچہ اس نے ہندوستان میں پچاس ہزار پونڈ کی خطیر دولت اکٹھی کر لی تھی تاہم وہ ہمیشہ اپنے آبائی وطن کو لوٹنے کی خواہش میں تڑپتا رہتا۔ اور اس نے وولف سے کہا خدا کے لئے اس ملک سے نکلنے میں میری مدد کرو۔"

یہ بات کہ ایویٹا بائیل ملک سے نکلنا چاہتا تھا صحیح ہے کیونکہ اسی سال اس نے حکومت ہند تحریری درخواست کی تھی کہ وہ اپنا اثر و رسوخ استعمال کر کے اسے ذمہ داریوں سے سبکدوش ہونے میں مدد دے۔ اس کا جواب آیا کہ چونکہ اس نے سکھ دربار میں ملازمت حکومت برطانیہ کے علم میں لائے بغیر اور بلا اجازت شروع کی تھی

اس سے وہ اس کے معاملے میں بذات خود دلچسپی نہیں لے سکتے۔

امن و امان قائم کرنے کے لئے اس کے مخصوص ہتھکنڈوں کا ریکارڈز میں سب سے پہلا ذکر 10 دسمبر 1830 کی اس رپورٹ میں ملتا ہے: (10)

"تین آدمی شہر میں چوری کرتے پکڑے گئے۔ جنرل ایوٹیا بائیل کے حکم پر انہیں سولی پر لٹکا دیا گیا اور ان کی لاشوں کو چار حصوں میں تقسیم کر کے شہر کے دروازوں پر لٹکا دیا گیا۔ ایک اور شخص کو باغ سے سنترے توڑ کر گلی میں اپنے ساتھی کی طرف پھینکتے ہوئے پکڑا گیا۔ اسے ایک کان اور ایک ٹانگ سے محروم کر کے شہر کی گلیوں میں گشت کروایا گیا اور پھر شہر بدر کر دیا گیا۔"

ایسے معاملات میں وہ بذات خود قانون کا درجہ رکھتا تھا اور رنجیت سنگھ کے قہر سے اس سے زیادہ نہ ڈرتا تھا جتنا کہ وہ خدا سے۔ سوہن لال کے مطابق وہ بزرگ سکھ سرداروں پر اکثر اور کھلے بندوں تنقید کرتا رہتا تھا۔ ہیوگل نے ایک ایسی ہی کہانی بیان کی ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ مہاراجہ سے کتنا سا ڈرتا تھا: (11)

"زیادہ عرصہ نہیں گزرا جب ایوٹیا بائیل وزیر آباد میں تھا چھ راہزن حراست میں لئے گئے جو سکھ مذہب کے اساتذہ میں سے تھے۔ رنجیت سنگھ کے خیال میں اسے ان کے معاملے میں برداشت کا مظاہرہ کرنا چاہئے۔ یہ صورتحال باعث شرمندگی تھی کیونکہ یہ راہزن دوسری مرتبہ پکڑے گئے تھے۔ اس حکم کے ساتھ انہیں ایوٹیا بائیل کے پاس بھجوا دیا گیا کہ انہیں دوبارہ فرار ہونے کا موقع نہیں ملنا چاہئے۔ وزیر آباد آمد کے ساتھ ہی انہیں تختہ دار پر لٹکا دیا گیا۔ مہاراجہ نے نہایت غصے سے ایوٹیا بائیل کو بلا بھیجا اور اس کے دوست اس کے لئے گھبرا گئے۔ جب وہ رنجیت کے سامنے پیش ہوا اور اس سے پوچھا گیا کہ اس نے چھ سکھوں کو پھانسی دینے کی جرات کیسے کی جبکہ انہیں حفاظت سے رکھنے کا حکم دیا گیا تھا۔ ایوٹیا بائیل نے جواب دیا اس کا خیال تھا کہ ان کے فرار کو روکنے اور مہاراجہ کے حکم کو بجا لانے کا یہی ایک سب سے یقینی طریقہ تھا۔ بادشاہ اس جواب پر ہنس پڑا اور واقعہ کا مزید نوٹس نہ لیا گیا۔

"وہ سکھ جس نے مجھے یہ کہانی سنائی اسے ایک اچھا مذاق سمجھ رہا تھا اور تمام لوگ

اس کا نہایت ادب کر رہے تھے۔"

ایویٹا بائیل چھوٹے چھوٹے جرائم پر موت کی سزا دے دیا کرتا تھا۔ ہونگ برجر بیان کرتا ہے کہ کچھ مسلمان قصابوں نے عیسائی گورنر کی موجودگی کو دیکھتے ہوئے گاؤ کشی کی ممانعت کے سکھ قانون کی خلاف ورزی کی۔ ایویٹا بائیل نے یہ کہہ کر ان سب کو پھانسی پر لٹکا دیا کہ اگرچہ خود اسے اس معاملے میں کوئی جرم نظر نہیں آتا مگر اس کی ذمہ داری ہے کہ وہ سکھ قانون کو سکھوں سے زیادہ سختی کے ساتھ نافذ کرے۔ ہونگ برجر مزید لکھتا ہے کہ اس کی طبی رائے میں ایویٹا بائیل نے شمپین کی بلا نوشی اور دوسری زیادتیوں کی وجہ سے کچھ زیادہ ہی پاگل ہو گیا تھا۔ "اس وجہ سے میرے خیال میں وہ لوگوں کو سولی سے لٹکتا دیکھ کر لطف اندوز ہوتا تھا۔ میں اسے بہت اچھی طرح جانتا ہوں کیونکہ میں تین سال تک اس کے گھر میں ٹھہرا رہا اور اس کا طبی علاج کیا۔"
(12)

اپریل 1835 میں اس کی مرضی کے خلاف ایویٹا بائیل کو پشاور کا گورنر بنا دیا گیا۔ یہ وہ ذمہ داری تھی جسے دو سکھ گورنر ادا کرنے میں ناکام رہے تھے۔ شہر اور ضلع کی حالت انتہائی خستہ تھی۔ طوائف الملوکی' قتل و غارتگری روزانہ کا معمول تھا۔ اور وہ صوبہ جسے دس لاکھ سالانہ ریونیو پیدا کرنا چاہئے تھا وہ اس کا تیسرا حصہ بھی پیدا نہیں کر رہا تھا۔ کوئی سکھ ایک مسلح جتھے کی معیت کے علاوہ چل پھر نہیں سکتا تھا۔ راہزنی' قتل اور جھگڑے روزانہ نہیں گھنٹوں کا معمول تھے۔ حالات کی سنگینی کو دیکھتے ہوئے ایویٹا بائیل نے اصرار کیا کہ اسے وہاں مکمل آزادی دی جائے اور یہ آزادی اسے دے دی گئی۔ اس نے اسے استعمال کیسے کیا آگے بیان کیا جائے گا۔

اب کی طرح اس وقت پشاور خیبر کے بے رحم اور وحشی قبائلیوں کے لئے جو اپنی جانوں کو بھی اتنا ہی ارزاں سمجھتے تھے جتنا کہ دوسروں کی جانوں کو' ایک پناہ گاہ یا تفریح گاہ کا مقام رکھتا تھا۔ ان قبائلیوں کی روزی اور تفریح کا انحصار راہزنی اور قتل پر تھا۔ ایسے لوگوں پر حکمرانی بھی کوئی ایسا ہی شخص کر سکتا تھا جو انہی کی طرح وحشی اور ظالم ہو اور اپنے اختیارات بغیر کسی رحم و کرم کے استعمال کرنے کا عادی ہو۔ خیبر والے کیا تھے

(اور ہیں) کا اندازہ اس حقیقت سے لگایا جا سکتا ہے کہ برطانوی قبضے کو پچھتر برس گزر جائے کے بعد اور قرب و جوار میں یورپی اور ہندوستانی سپاہیوں کی ایک بڑی چھاؤنی بن جانے کے باوجود کوئی یورپی محافظ دستے کے بغیر اکیلا پشاور شہر میں داخل ہونے کی جرات نہیں کر سکتا۔

عام شہری آبادیوں میں ہر یورپی گھر میں ایک پٹھان چوکیدار ہونا ضروری ہے۔ یہ چوکیدار انہی قبائلیوں میں سے ایک انشورنس کے طور پر لیا جاتا ہے کیونکہ کوئی اور شخص اس عہدے پر فائز ہونے کی جرات نہیں کرتا۔ یہ تمام لوگ ممکنہ چور اور قاتل ہوتے ہیں کیونکہ اگرچہ وہ جس گھر کی حفاظت پر مامور ہوں اس کو تو نہیں لوٹتے تاہم وہ اکثر اپنے بھائی بندوں کو ساتھ والے گھر کو لوٹنے کی اجازت دے دیتے ہیں۔ اور آپس میں چوریاں تبدیل کرنے میں مشہور ہیں۔

فوجی سنتری خار دار تار کے اندر گشت کرتے ہیں اور اپنے ہاتھوں میں رائفلوں کے بجائے شاٹ گن اٹھاتے ہیں کیونکہ اول الذکر پٹھانوں کو چوری پر اکسانے میں بہت اہم کردار ادا کرتی ہے۔ محافظوں کے کمرے چھوٹے موٹے قلعے ہوتے ہیں۔ اندر بیرکوں میں رائفلوں کو زنجیریں ڈال کر تالے لگا کر رکھا جاتا ہے اور مسلح دستے ساری رات گشت کرتے رہتے ہیں۔ لیکن ان تمام احتیاطی تدابیر کے باوجود بنگلے لوٹ لئے جاتے اور رائفلیں چرا لی جاتی ہیں۔ ہندو اور کبھی کبھار یورپی خواتین کو اغوا کر کے بارڈر کے پار لے جایا جاتا ہے اور ان کے خاوندوں یا باپوں کے قتل کے بعد انہیں تاوان وصول کرنے کے لئے مقید رکھا جاتا ہے۔

تاہم ایوبٹا بائیبل کی حکمرانی کے آغاز کے چند سال بعد یہ صورتحال نہیں رہی تھی۔ قبائلیوں کی وہ متعفن لاشیں جنہیں وہ سنگدلی سے اپنے خاموش سنتری کہتا تھا پاس سے گزرنے والے امکانی لٹیروں اور قاتلوں کو یہ یاد دہانی کرواتی تھیں کہ گھنٹے بھر میں وہ بھی ان کے خاموش ساتھی بن جائیں گے۔ کیونکہ ایوبٹا بائیبل ہر وقت حرکت میں آنے کے لئے تیار رہتا تھا جبکہ اس کے خدام میں نازک اندام آندرے اور ٹراؤس ایچلز کے ہم پلہ اور ان کے مددگار موجود تھے جو اپنے مالک کے ایک ہی اشارے پر

کسی بھی ایسے آوارہ گرد کو جس کے چہرے پر غصیلے آثار ہوں یا چال ڈھال سے اہانت کا پہلو نکلتا ہو رسی کے بل دے کر لٹکانے کے لئے تیار رہتے تھے۔ بعض اوقات تو محض یہ بات کہ بندہ خیبری ہے یا مسلمہ بدمعاش ہے اس کے قتل کے لئے قابل قبول وجہ بن جاتی تھی۔ اگرچہ اس قبیل کے دوسرے افراد کو باقاعدہ مقدمہ چلا کر بھی فیصلہ ہونے کا موقع دیا جا سکتا تھا۔ ایویٹا بائیل نے اپنی حکمرانی کا آغاز کیسے کیا یہ ہم اس کے اپنے الفاظ میں بیان کرتے ہیں: (13)

"اپنے پشاور پہنچنے سے پہلے میں نے لکڑی کے کھمبے وہاں بھجوا دیئے جنہیں میرے آدمیوں نے شہر کی فصیلوں کے چاروں طرف گاڑ دیا۔ لوگوں نے ان پر طنز کیا اور فرنگیوں کے پاگل پن پر قہقہے لگائے۔ یہ قہقہے اور بھی بلند ہو گئے جب میرے آدمیوں نے ان کھمبوں کے قدموں میں رسے کے گچھے بھی رکھ دیئے۔ وہ کہنے لگے کہ شہر پر حکومت کرنے کے لئے بندوقیں اور تلواریں چاہئیں ناکہ یہ چھڑیاں اور رسیاں۔ تاہم جب میری تیاریاں مکمل ہو گئیں تو ایک عمدہ صبح انہوں نے پشاور کے پچاس بڑے بدکرداروں کو ان کھمبوں پہ لٹکے ہوئے پایا۔ میں نے روزانہ یہ تماشا جاری رکھا یہاں تک کہ شورش پسندوں اور قاتلوں کی کمی واقع ہو گئی۔

"اس کے بعد میں نے جھوٹوں اور داستان گوؤں سے نمٹنا شروع کیا۔ ان لوگوں پر میں نے یہ طریقہ آزمایا کہ ان کی زبانیں کاٹ دیں..... اور پھر ایک جراح وہاں آ نکلا جس نے دعویٰ کیا کہ وہ ان کی قوت گویائی بحال کر سکتا ہے۔ میں نے اسے بلوایا اور اس کی زبان بھی کاٹ دی۔ اس کے بعد امن قائم ہو گیا اور چھ ماہ کے اندر پشاور میں کوئی جرم باقی نہ رہا۔"

ہمارا خیال ہے کہ درج ذیل حوالہ جات جنرل کی آخری بات کی تردید کرتے ہیں۔ کیونکہ وہ تمام لوگ جنہیں پشاور سے گزرنے کا اتفاق ہوا اس بات کے گواہ ہیں کہ اس کی حکمرانی کے آخری دنوں تک پھانسی کے پھندے مصروف ہی رہے۔ اس بات کی گواہی یہاں دی جا رہی ہے: (14)

1840____ "پشاور کی عنان حکومت جنرل ایویٹا بائیل کے ہاتھوں میں ہے۔ یہ

حکومت اگرچہ زیادہ سخت ہے پر الزام ہے کہ اس نے اپنے وحشی ہمسایوں کو پہلے سے کہیں زیادہ دبا کر رکھا ہوا ہے۔ اس کی ہتھکنڈوں کی بہت سی مثالیں ہمیں شہر کی دیواروں کے پاس دیکھنے کو ملیں۔ پام کے اونچے درختوں کے چاروں طرف اچھی طرح سے تیار کئے گئے پھانسی کے تختے تھے اور مرجھائے ہوئے درختوں کے درمیان شہتیر باندھ کر انسانوں کے ضائع شدہ اعضاء لٹکائے گئے تھے۔ وہ جنہیں تازہ بتازہ ان شہتیروں سے لٹکایا گیا تھا چیلوں اور گدھوں کی مرغوب غذا بن رہے تھے جو جنرل ایویٹا بائیل کی درازی عمر اور خوشحالی کی دعائیں مانگ رہے تھے۔ شام کی ہوا میں جھولتے ہوئے انسانی ڈھانچے ان دعاؤں کی قبولیت کا عندیہ دے رہے تھے۔

"گردن کے بل لٹکانے کے اصولی طریقے پر ہر جگہ عمل نہیں کیا جاتا کیونکہ جلاد اس طریقہ کار میں سر یا ایڑیوں کے بل لٹکا کر تبدیلی کرتے رہتے تھے۔ زندہ انسان کی کھال کھنچوانے کی روایتی سزا کو بھی دوبارہ زندہ کر دیا گیا۔ کھال کھینچنے کا آغاز ایڑیوں سے اوپر کی جانب کیا جاتا۔ اور مظلوم دو گھنٹوں تک سخت اذیت کی حالت میں زندہ رہتا۔ مجرموں کے ہاتھ پاؤں کاٹ دینا اور ٹھونٹھ کو تیل میں ڈبو دینا اور ناک کان سے محروم کر دینا معمولی سزائیں تھیں۔ ان انسانی اعضاء کی نمائش کے لئے ایک درخت خاص طور پر مخصوص کیا گیا تھا.... اس رات ایویٹا بائیل کے ساتھ ڈنر کرتے ہوئے ان پھانسی کے تختوں نے مجھے اتنا آسیب زدہ کر دیا کہ میں خود کو بمشکل یہ یقین دلا سکا کہ ابلا ہوا بکری کا بچہ اور آختہ مرغ کسی کھال اترے مجرم کے بدن کا حصہ نہیں ہیں۔" (15)

"کولن میکنزی نے ایک زمیندار کا واقعہ ایویٹا بائیل سے منسوب کر کے لکھا ہے کہ اس زمیندار پر شک تھا کہ اس نے ریونیو میں فراڈ کیا ہے۔ جنرل نے اس پر بھاری جرمانہ عائد کر دیا۔ شورہ پشت ثابت ہونے پر ایویٹا بائیل نے اسے ننگا کر کے دیوار کے ساتھ زنجیروں سے بندھوا دیا۔ دسمبر کی رات میں جبکہ پشاور میں سخت سردی تھی ایک ملازم کو اس پر پانی ڈالنے پر مامور کیا گیا۔ تاہم اس کا نتیجہ دیکھ کر ایویٹا بائیل کو صدمہ ہوا۔ اس نے کہا' "تم اس بدمعاش کے بارے میں کیا کہو گے وہ پاجی محض اس بغض کی وجہ سے مر گیا تاکہ وہ مجھے مالیات سے محروم کر سکے۔"

پشاور میں تعینات برطانوی پولٹیکل ایجنٹ کے 26 مارچ 1841 کو لکھے جانے والے ایک خط کا یہاں حوالہ دیا جاتا ہے کہ "قتل کے مقدموں میں ذاتی انتقام کی پیاس بجھانے کی حوصلہ افزائی کی جاتی ہے بجائے اس کے کہ قانون کی روح کے مطابق عمل کیا جائے یعنی مقتول کے ورثاء کو مجرم کو مارنے کی اجازت دے دی جاتی ہے۔ ایسا ہی ایک خوفناک واقعہ کچھ دن قبل ہوا۔ ایک آدمی نے دوسرے کو قتل کر دیا۔ خون کی قیمت (دیت) وصول کرنے کے لئے ایویٹا بائیل نے مجرم کو کچھ وقت کے لئے جیل میں بند رکھا۔ پھر اس کے آدھے بدن کو سرخ رنگ کر کے الف ننگا سخت دھوپ میں رکھا گیا اور کیڑوں مکوڑوں کے حملوں کا نشانہ بنوایا گیا۔ مگر جب وہ ٹس سے مس نہ ہوا تو مقتول کی ماں کو حق دیا گیا کہ وہ ایک چاقو کے ساتھ اسے ذبح کر دے۔ اس عورت نے ایسے ہی کیا اور حیوانی خوشی کے عالم میں وہ اس پر جھکی اور اس کے زخم سے فوارے کی طرح پھوٹنے والے لہو سے دو چلو بھر خون پیا۔"

چند اور پشاوری جنہوں نے جرمانہ ادا کرنے سے انکار کر دیا تھا انہیں اکٹھے باندھ کر چاروں طرف اس طرح سے دیواریں چن دی گئیں کہ اندر چلنے پھرنے کی جگہ نہ بچی۔ ہر روز انہیں ادائیگی کرنے کا کہا جاتا اور انکار سن کر دیواروں کو چند انچ مزید چن دیا جاتا۔ اس طرح وہ چھ دن تک بغیر پانی اور خوراک کے اندر بند رہے یہاں تک کہ ان کے ہار ماننے سے پہلے دیواروں کو محرابی شکل میں بند کرنا شروع کر دیا گیا۔ اس دوران میں تیسرے دن ان کا ایک ساتھی مر گیا تھا اور وہ اس کی گلتی لاش کو بھی اپنے درمیان سیدھا کھڑا رکھنے پر مجبور تھے۔ جب انہیں ایویٹا بائیل کے سامنے لایا گیا تو ان کے کپڑوں سے اتنی گندی بدبو اٹھ رہی تھی کہ ایویٹا بائیل نے حکم دیا کہ انہیں گردن تک تازہ مٹی میں دبایا جائے تاکہ ان کی بدبو دور ہو سکے۔ (16)

"ایک اور واقعہ لکھنؤ کے کیتھولک بشپ نے بیان کیا ہے جو اس نے براہ راست خود جنرل سے سنا تھا۔ چند بارک زئی سردار جنرل سے ملنے آئے اور ملاقات کے اختتام پر خیبر کے لئے روانہ ہو گئے جبکہ جنرل اپنے معمول کے دورہ میں مشغول ہو گیا۔ پشاور سے کچھ فاصلے پر پہنچے تو سرداروں کو یاد آیا کہ وہ اپنی ایک قیمتی چیز پیچھے بھول آئے

ہیں۔ انہوں نے اسے حاصل کرنے کے لئے ایک پیغامبر کو واپس بھیجا۔ متعلقہ چیز حاصل کرنے کے بعد وہ گورکھترہ سے روانہ ہو رہا تھا کہ ایویٹا بائیل بھی وہاں آ پہنچا۔ اجنبی کو وہاں پا کر اس نے اس کے فوری قتل کا حکم صادر کر دیا اور اس اجنبی کی جانب سے وضاحتوں کے کوششوں کے باوجود اسے قتل کر دیا گیا۔

پیغامبر کے واپس نہ پہنچ سکنے سے پریشان ہو کر سرداروں نے ایک اور شخص کو اس کی خبر گیری کے لئے بھیجا۔ اسے جنرل کے سامنے پیش کیا گیا تو اسے پتہ چلا کہ اس کے پیشرو کو شک کی بنیاد پر قتل کر دیا گیا ہے اور اسے بھی دھمکی دی گئی کہ اگر اس نے فوری طور پر یہ جگہ نہ چھوڑی تو وہ بھی ایسے ہی انجام سے دوچار ہو گا۔ اس سلوک پر بھڑک کر سرداران خود واپس پہنچے تو ایویٹا بائیل نے اپنی پشیمانی کا اظہار کیا اور مقتول کی لاش کو واپس کرنے کی پیش کش کی۔

خیبریوں کو وہ محض انسان نما کیڑے سمجھتا جن کا سب سے مفید استعمال یہی تھا کہ وہ ایک دوسرے کو مٹا ڈالیں۔ ایویٹا بائیل نے ایک مقامی قبائلی سردار قلندر خان جو جن شرائط پر جاگیر عطا کی تھی ان میں سے ایک شرط یہ بھی تھی کہ وہ ہر سال پچاس آفریدیوں کے سر پیش کرے گا۔ ان لوگوں کے ساتھ معاملات نمٹانے میں اس کا طریقہ کار یہ تھا کہ وہ انہیں آپس میں بھڑائے رکھتا اور ان کے اندرونی خونی فسادات کو دونوں اطراف سے محاصل وصول کرنے کے لئے استعمال کرتا۔ ان لوگوں کو وہ اسلحہ اور گولہ بارود فراہم کرتا اور جب وہ لڑ کر تھک چکے ہوتے تو ان کے مال مویشی پر قبضہ کر لیتا۔ اس کے ہتھکنڈوں کی ایک مخصوص مثال مئی 1840 کی تاریخ میں ریکارڈز میں ملتی ہے۔
(17)

"حکومت ہند جنرل ایویٹا بائیل کے ان نامعقول اقدامات پر سخت احتجاج کرتی ہے جن کے تحت خیبر کے آفریدیوں سے جمرود اور درہ خیبر کے دہانے کے درمیان واقع زمینوں پر محاصل کا مطالبہ کیا گیا ہے اور اس مطالبے کو پورا کروانے کے لئے اورک زئی قبائلیوں کی خدمات حاصل کی گئی ہیں۔ جبکہ جلال آباد اور پشاور کے درمیان تمام روابط ختم کر دیئے گئے ہیں اور افغانستان جانے والے چند تاجروں کو گرفتار کر لیا گیا

ہے۔ اور آخری بات یہ کہ برطانوی حکومت کی رعایا میں شامل چند آفریدیوں کو اس
لئے گرفتار کر لیا گیا ہے کہ اس قبیلے کے چند دوسرے افراد نے مویشی چرا لئے تھے۔ اگر
اس رویے کی اصلاح نہ کی گئی تو برطانوی حکومت جنرل ایویٹا بائیل کو پشاور سے ہٹائے
جانے کا مطالبہ کرے گی۔"

جنرل ایویٹا بائیل کے لئے اس وقت اس آخری بات سے زیادہ دل خوش کن چیز
اور کوئی نہ تھی۔ کیونکہ اس نے اچھی خاصی دولت اکٹھی کر لی تھی اور اب بس اس
کے ساتھ یہاں سے نکلنا چاہتا تھا۔ مگر ہم دیکھتے ہیں کہ تھوڑے ہی عرصہ بعد اسی
حکومت نے درخواست کی کہ جنرل ایویٹا بائیل کو ہر قیمت پر پشاور میں تعینات رکھا
جائے کیونکہ اب اس کی موجودگی کی اہمیت کا احساس کر لیا گیا تھا۔

کابل تک آنے جانے والے افسروں کے لئے اس کی مہمان نوازی لامحدود تھی۔
اگرچہ ہمیں ایک ایسا خط ملتا ہے جس میں بھاری اخراجات پر احتجاج کیا گیا ہے اور شاہی
دربار سے مطالبہ کیا گیا ہے کہ وہ اس سلسلے میں مالی مدد فراہم کرے۔ اس طرح اسے
ایک ہزار روپیہ ماہانہ اضافی ملنے لگا۔ اسی دوران حکومت ہند نے یہ پتہ چلنے پر کہ چند
ناہنجاروں نے بھی یہ ضیافتیں اڑائی ہیں ہدایت جاری کہ ماسوائے انتہائی سینئر افسروں کے
کسی اور کی مہمان نوازی نہ کی جائے اور پولٹیکل افسر کو جونیئر حکام کی مہمان نوازی کے
لئے پانچ صد ماہوار کا وظیفہ دے دیا۔ بر ہمیں اس وقت کے ایویٹا بائیل کی ظاہری
حالت کے بارے میں لکھتا ہے : (18)

"جنرل ایویٹا بائیل چھ فٹ سے نکلتا ہوا ایک عمدہ قوی انسان ہے۔ اس کے چہرے
پر خوشگوار مگر آہنی عزم کے تاثرات ملتے ہیں جن سے آپ فوری اندازہ کر سکتے ہیں کہ
اس وقت وہ جو حکم جاری کر رہا ہے ان پر فوری عملدرآمد ہونا چاہئے اور حکم عدولی
کرنے والے کو خبردار ہونا چاہئے۔ اس کی خاکستری رنگ کی لمبی داڑھی ہے جو سینے
تک پھیلی ہوئی ہے۔ جب کہ وہ شاندار لباس پہنتا ہے۔ یہ لباس ایک لمبے سبز کوٹ پر
مشتمل ہے جس پر سونے کی ڈوری لگی ہوئی ہے اور سونے کی بٹنوں کی تین قطاریں
ہیں۔ پاجامہ قرمزی رنگ کے کپڑے سے بنایا گیا ہے جس پر سلائیوں کے چوڑی سونے

کی پٹی لگی ہے سبز مخمل کی ٹوپی ہے جس کے گرد سونے کی ڈوری اور اسی سے ایک پھندنا بنا ہوا ہے۔ اور ہندوستانیوں کی رسم کے مطابق کہ سر کو کبھی ننگا نہیں رکھنا چاہئے اسے ہروقت اپنے سر پر پہنے رکھتا ہے۔

"ایک مرصع نیام میں ایک خوبصورت تلوار ہے۔ نیام سبز مخمل سے بنی ہوئی ہے مگر سونے کے کام سے ڈھکی ہوئی ہے اور اوپر جواہرات اس طرح جڑے ہوئے ہیں کہ مخمل کا معمولی سا حصہ ہی نظر آتا ہے۔ تلوار کی دھار اکبر خان کی ہے اور اس پر پانچ ہزار روپیہ خرچ آیا ہے۔ جبکہ دستے میں فٹ کرنے پر ایک ہزار مزید خرچ آیا ہے اس لئے یہ ایک مہنگا ہتھیار بن گیا ہے۔ اس کے پیچھے چھوٹے قد کے دو افغان لڑکے کھڑے ہوتے ہیں جنھوں نے زرق برق کپڑے پہنے ہوئے ہیں اور لحیم شحیم ایویٹا بائیل کو دیکھتے ہوئے بالکل بے جوڑ لگتے ہیں۔"

ہیولاک مزید تفصیلات بیان کرتا ہے: (19)

"جنرل اپنی نجی زندگی میں اگرچہ ایک نرم خو شخص ہے مگر وہ پشاوریوں پر لوہے کے ڈنڈے کے زور پر حکومت کرتا ہے۔ اور ان پر حکومت کرنے کا یہ واحد طریقہ ہے۔ اس نے اپنا فوجی' اقتصادی اور سول ہیڈ کوارٹر ایک بڑی سرائے گورکھترہ میں قائم کیا ہے۔"

"وہ خصوصاً اپنی میز کی شان پر فخر کرتا ہے۔ اور اس بات میں حق بجانب بھی ہے۔ اس کے آٹھ باورچی ہیں جو فارسی' انگریزی' اور فرانسیسی کھانوں میں بڑی مہارت رکھتے ہیں۔ وہ ایک کھلے ذہن' اور خوش مزاج شخصیت کا مالک ہے اور ایک شاندار حکمران اور ماہر افسر ہے۔ ایک زیرک گورنر کے طور پر اس کی شہرت پنجاب میں اور ہند میں اس وقت ہی قائم ہو گئی تھی جب وہ وزیر آباد کے اضلاع کا حاکم تھا۔ رنجیت سنگھ نے پشاور کی فتح کے فوراً بعد اسے وہاں کا گورنر تعینات کر کے اپنی معاملہ فہمی اور زیرکی کا ثبوت دیا۔

"اس کی عادات شہزادوں جیسی ہیں جبکہ اس کا لباس اور ہتھیار اس شان کو ظاہر کرتے ہیں جو افغانوں جیسی قوم پر حکم چلانے کے لئے ضروری خیال کیے جاتے ہیں۔ وہ

بہت مہمان نواز ہے اور اپنی اسی مہمان نوازی اور شان و شوکت کے باوجود آٹھ لاکھ کی خطیر رقم اکٹھی کر چکا ہے جو کہ ساری کی ساری برطانوی حکومت کی سیکوریٹیز میں لگا دی گئی ہے۔"

آٹھ لاکھ کی دولت کے بارے میں یہ بیان درست ہو گا مگر 1842 کے آخر میں حکومت ہند کے بند کھاتوں کے مطابق یہ رقم چار لاکھ پچھتر ہزار روپے تھی۔ اتنی خطیر رقم اس نے پنجاب سے باہر کیسے نکالی اس کا سادہ سا جواب یہ ہے کہ حکومت ہند اور پشاور میں اس کے انفرادی حکام کو روپے پیسے کی بڑی شدت سے ضرورت تھی۔ ایویٹا بائیل نے انہیں ادھار دے دیا اور بدلے میں حکومت ہند کے تمسکات لے لئے۔ اس کے انتظامی طور طریقوں کے متعلق کیپٹن میکین لکھتا ہے: (20)

"ایویٹا بائیل کے پشاور میں تعیناتی کے پہلے سال میں کم از کم پانچ صد سکھ مارے گئے۔ اب ایسی صورتحال نہیں ہے۔ نیا پولیٹن کے متشدد ہتھکنڈے خیبریوں جیسے بے اصول لوگوں کے لئے بہت مناسب ہیں جو اب دور دراز علاقوں میں بھی ہوں تو ایویٹا بائیل کا نام سن کر کانپ اٹھتے ہیں۔"

کولن میکنزی لکھتا ہے کہ: (21)

"ایک صبح جنرل کے ساتھ ناشتہ کرتے ہوئے دیکھا کہ قفل لگے ایک بڑے بکس کو کھڑکی کے راستے ایک شارع عام پر اتارا گیا۔ اس کا مقصد تمام قسم کی درخواستوں کو وصول کرنا تھا تاکہ جنرل تک پہنچنے سے پہلے کوئی انہیں کھول کر نہ دیکھ سکے۔ بکس کی چابیاں جنرل خود اپنے پاس رکھتا تھا۔ وہ دوپہر کا کھانا تناول کرنے سے پہلے درجن بھر افسردہ مجرموں کو پھانسی پر لٹکا دیتا ہے' اپنے فوجیوں کو ادائیگی کی نگرانی کرتا ہے' اپنے پولٹری فارموں کا معائنہ کرتا اور گھریلو معاملات نمٹاتا ہے اور بہت سے موسیقی کے آلات سنتا اور دوسرے کئی معاملات سنبھالتا ہے۔"

یہ بتاتے ہوئے کہ ایویٹا بائیل ہمیشہ یکطرفہ پھانسی کے فیصلے نہیں صادر کر دیا کرتا تھا سر ہنری ڈیورنڈ کہتا ہے: (22)

"میں ایویٹا بائیل سے ملنے گیا اور اسے ججوں سے گھرے ہوئے فیصلے کرتے ہوئے

پایا- دو قاضی' دو ہندو اور دو سکھ اس کی اس مجلس میں شامل تھے- اس نے ہمیں اپنی پالیسی کا خاکہ بتایا جو بڑا پر لطف تھا- وہ مقامی جھگڑے نمٹانے کے لئے اپنے فوجی استعمال نہیں کرتا تھا بلکہ لڑنے والی دونوں قبائل کی افواج کو گولہ بارود فراہم کیا کرتا- منحرف لوگوں کے لئے اس کے دربار کے باہر خوفناک وارننگ لٹکی ہوئی تھی- درختوں کے درمیان بد قسمت مجرموں کو دوہری تہری قطاریں تھیں جو ایک دوسرے کے اوپر پھانسی کے پھندے سے جھول رہے ہوتے تھے-"

پنجاب ریکارڈز میں پائے جانے والے پہلی افغان جنگ سے متعلق اصلی خطوط بتاتے ہیں کہ خیبر کی پسپائی سے پہلے بھی اور بعد میں بھی ایویٹا بائیل کی پشاور میں موجودگی حکومت برطانیہ کے لئے بہت ناگزیر تھی- سہ فریقی معاہدے کی شرائط کے تحت لاہور کی طرف سے مہیا کی جانے والی سپاہ برطانویوں کے حق میں لڑنے کی بجائے اس کے خلاف لڑنے پر زیادہ آمادہ تھی-

سکھ اس معاہدے کو سخت ناپسند کرتے تھے اور اپنے موجودہ اتحادیوں کو ممکنہ فاتحین کے طور پر دیکھ رہے تھے جن کے ساتھ جلد یا بدیر لڑائی ہو کر رہتی- اور بلاشبہ انہوں نے پوری کوشش کی کہ جوابی حملوں کو بھڑکایا جا سکے- اس کی نفرت اتنی شدید تھی کہ اہم حکام بھی اپنے محافظوں کی معیت میں ہونے کے باوجود سکھ سپاہیوں کی طرف سے کھلم کھلا تمسخر یا گالیوں کا نشانہ بنتے- اور ہمیں ہنری لارنس سمیت دوسرے کئی اشخاص کے اس موضوع پر تند خطوط ملتے ہیں- ایک موقع پر خالصہ سپاہیوں نے برطانوی خزانے کے کارواں پر حملہ کر کے تین لاکھ سکے لوٹ لئے- جبکہ ایک اور موقع پر پشاور میں محکمہ رسد پر باقاعدہ منصوبے کے تحت حملہ کر کے گودام لوٹ کر آگ لگا دی گئی- (23)

ان پرانے کاغذات کا مطالعہ کرنے سے پتہ چلتا ہے کہ ان دنوں برطانوی افسروں کی ایک عظیم اکثریت کتنی احمق اور کتنی سی ہمت رکھتی تھی- بہت سے جونیئر خصوصاً سیاسی معاملات کو نمٹانے والے بھی کچھ بہتر نہ تھے- ان میں سے اکثر اہلیت کی بجائے دوسری وجوہات کی بناء پر وسیع و پیچیدہ مسائل کو حل کرنے پر مامور کئے گئے تھے-

سرکاری نااہلی' بیوقوفانہ تفاخر' بدمزاجی کی شکایت اور پیرانہ نااہلی کی اس ابتری میں جو بہت سوں نے شاہ شجاع پر غیرمدبرانہ اور تباہ کن حملے کے وقت پیش کی اور اس کی نتیجے میں جو تباہیاں سامنے آئیں ایسے موقع پر صرف تین افراد تھے جو پشاور میں اپنی عزم و ہمت سے قائم تھے۔ ان میں سے دو انگریز لارنس اور میکسن تھے اور تیسرا خالصوں کا اطالوی افسر۔

دونوں انگریز افسر جانتے تھے کہ پشاور میں ایوبٹا بائیل کی موجودگی برطانیہ کے لئے کتنی مفید تھی۔ یہ اسی کا خوف تھا کہ سکھ اور افغانوں نے باہم مل کر برطانوی سپاہیوں کے خلاف پشاور میں بغاوت سے باز رکھا۔ وگرنہ خیبر میں داخلے اور بچ نکلنے کے تمام راستے مسدود ہو جاتے۔

ایوبٹا بائیل خود بھی یہاں سے دور ہونے کے لئے بے تاب تھا کیونکہ وہ جانتا تھا کہ رنجیت سنگھ کی موت کے بعد سکھ راج کی تباہی اب دنوں ہی کی بات ہے۔ دربار کو ایک خط میں اس نے واشگاف الفاظ میں بتا دیا کہ کسی بھی شخص کے لئے ایک ایسی حکومت کی خدمت کرنا ناممکن ہے جو عرصہ دراز سے امن و امان قائم کرنے اور اپنا وقار بحال کرنے میں ناکام ہو رہی ہو۔ تاہم اس نے کہا کہ وہ اس وقت تک پشاور میں قیام کرے گا جب تک کسی قابل افسر کو اس کی جگہ تعینات نہیں کر دیا جاتا۔ کیونکہ ایسے موقع پر ملازمت چھوڑنا عزت اور نمک حلالی کے یورپی نظریات کے برعکس ہو گا۔

مئی 1841 کی تاریخ میں کیپٹن میکسن لکھتا ہے: (24)

"میں نے ہر ممکن کوشش کی ہے کہ جنرل ایوبٹا بائیل کو قائل کر سکوں کہ وہ مزید چند ماہ تک یہاں ٹھہرے۔ کیونکہ مجھے کامل یقین ہے کہ ایسے موقع پر اسے واپس بلانا تباہی کا پیغام ہو گا۔"

اور خبرنویس لکھتا ہے۔ (25)

"جنرل ایوبٹا بائیل کی جگہ کوئی دوسرا شخص تعینات کرنے کے لئے ہر طرف ڈھنڈیا پٹ رہی ہے اور اس دوران جنرل کو تسلی دینے کے لئے جلد از جلد سبکدوشی کے وعدے کئے جا رہے ہیں ایسا کوئی دوسرا شخص ملنا مشکل ہے۔ کیونکہ جنرل ایوبٹا بائیل کی

طرح اس میں چالاکی بے خوفی اور عزم و ارادے جیسے اصولوں کا ایک حسین مرکب ہونا چاہئے۔ ایسا کوئی شخص ملنا ناممکن ہے اور فی الحال جنرل ایوبیٹا بائیل کو یہاں ٹھہرنا چاہئے۔" (26)

سرکاری رپورٹوں سے ہم درج ذیل واقعات بغیر کسی ترمیم یا اضافہ کے یہاں پیش کرتے ہیں۔

"مئی 1841____ سوائے ان تین بٹالین کے جنہیں ایوبیٹا بائیل نے خود اکٹھا کیا اور تربیت دی جنرل کی باقی تمام سپاہ اپنے خالصہ بھائیوں کی طرح کسی حکم کے بجا لانے کو کمزوری سمجھتے تھے۔ ایسی کمزوری جو گورو کے پیروکار کے شایان شان نہ تھی۔ مہاراجہ شیر سنگھ نے ایوبیٹا بائیل کو ان کے خلاف حرکت میں آنے کی اجازت دینے کی جرات نہ کی۔"

"جنرل ایوبیٹا بائیل سپاہیوں کو تنخواہیں پشاور ہی میں اپنے ذرائع میں سے دیتا تھا۔ تاہم وہ نجیب (مسلمان) سپاہیوں میں یہ افواہ سن کر پھیلنے والی بغاوت کہ لاہور کے سپاہیوں کی تنخواہ میں ایک روپیہ اضافہ کے مقابلہ میں ان کی تنخواہ میں صرف آٹھ آنہ کا اضافہ کیا جا رہا ہے کو نہ روک سکا۔ یہ بغاوت اسی وقت ختم ہوئی جب جنرل ایوبیٹا بائیل نے ان کے مطالبات تسلیم کر لئے۔ ایسی رپورٹیں سننے کو مل رہی تھیں کہ نجیب سپاہ نے جنرل کی رہائش گاہ گورکھترہ پر رات کو حملہ کر کے اسے قیدی بنا لینے کا منصوبہ بنا لیا ہے۔ اس دن سے شہر کے دروازے بند کر دیئے گئے اور جنرل ایوبیٹا بائیل نے افغانوں کا ایک محافظ دستہ حاصل کر کے اپنی حفاظت کا بندوبست کر لیا۔ دن کے وقت یہ محافظ نظر نہ آتے تاہم رات کو انہیں اس کی رہائش گاہ کے اردگرد تعینات کر دیا جاتا۔

"نجیب سپاہ نے اگر گورکھترہ پر حملے کا منصوبہ بنایا بھی تھا تو انہوں نے اس پر عمل نہ کیا۔ اپنے مطالبات پورے ہونے پر وہ واپس اپنی ڈیوٹی پر چلے گئے۔ اگر شہر کے لوگوں کی باتوں پر اعتبار کیا جائے تو ان کے مطابق نجیب سپاہ نے جنرل ایوبیٹا بائیل کو گالیاں دیں اور دھمکی دی کہ وہ اس کے ساتھ وہی سلوک کریں گے جس طرح سپاہیوں نے کشمیر کے گورنر کے ساتھ کیا تھا۔ (اس نے تنخواہ میں اضافے سے انکار کر

دیا تھا جس پر اسے قتل کر دیا گیا۔ اس کی لاش کو آگ لگا دی گئی۔)

"آٹھ تاریخ تک تمام معاملات خاموشی کے ساتھ طے پاتے رہے کہ سکھ بٹالین جسے غلطی سے کشمیری بٹالین کہا جاتا تھا اپنی تنخواہ لینے کے لئے آ گئی۔ کرنل سٹین بیک جو ابھی تک بٹالین کا انچارج تھا اگرچہ اس کا حکم کچھ زیادہ نہ چلتا تھا ایم کورٹ کی ہمراہی اور سردار فتح سنگھ مان کی حفاظت میں پانچ تاریخ کو پشاور چھوڑ کر لاہور کے لئے روانہ ہو چکا تھا۔ اس شعبے سے متعلق ایک افسر کرنل اور بٹالین کے نمائندوں کے درمیان ہونے والے مذاکرات میں موجود تھا۔ ان نمائندوں کا اپنے انچارج کے ساتھ رویہ نہایت ہتک آمیز تھا۔ انہوں نے اسے بتایا کہ بٹالین کو پتہ ہے کہ وہ انہیں چھوڑ کر لاہور جا رہا ہے۔ تاہم اس کی حیثیت جتنی بھی غیر اہم اور ناقابل برداشت ہے اسے یہ توقع نہیں کرنی چاہئے کہ اسے اتنا سستا چھوڑ دیا جائے گا۔ اور یہ کہ اسے مہاراجہ شیر سنگھ سے ان کے مطالبات کے حوالے سے کوئی موزوں جواب ضرور حاصل کرنا چاہئے۔

"اسی مہینے کی آٹھ تاریخ کو یہ بٹالین اپنی تنخواہ وصول کرنے کے لئے آئی۔ جبکہ نجیب ان سے پہلے ہی وصول کر چکے تھے۔ ایویٹا بائیل صبح سویرے گھڑ سواری سے پہلے انہیں گورکھترہ کے باہر ملا۔ اس نے انہیں مہاراجہ کی طرف سے ان کی تنخواہ کے متعلق موصول ہونے والا تازہ ترین پروانہ پڑھ کر سنایا۔ مخالفت میں کوئی آواز نہ سن کر اس نے اپنے منشی کو ان کے درمیان تنخواہیں تقسیم کرنے کے لئے چھوڑا اور خود چلا گیا۔ جنرل کی غیر موجودگی میں سپاہیوں نے اس وقت تک تنخواہ وصول کرنے سے انکار کر دیا۔ جب تک انہیں رنجیت سنگھ کے دور سے لے کر اب تک کے وقت کے بقایا جات بھی ادا نہیں کر دیئے جاتے۔ اس کے ساتھ ساتھ انہوں نے ناقابل اشاعت زبان میں جنرل ایویٹا بائیل کو کوسنا بھی شروع کر دیا۔

"منشی نے انہیں شورش پر آمادہ دیکھ کر جنرل کو لکھ بھیجا کہ وہ گورکھترہ واپس نہ جائے۔ منشی کا پیغام ملتے ہی جنرل اپنے ساتھ موجود چند گھڑ سواروں اور خدام کو لے کر وہاں آ دھمکا۔ اسے اپنے پاس دیکھ کر باغی سٹپٹا گئے تاہم وہ اپنے مطالبے سے دستبردار نہ ہوئے۔ جنرل ایویٹا بائیل نے اس شرط پر فی کمپنی دو ہزار روپے ادا کرنے کی حامی بھر لی

کہ اگر تخت لاہور نے اس کی منظوری نہ دی تو یہ رقم ان سے واپس لے لی جائے گی۔ دو کمپنیاں اپنی تنخواہ میں اس اضافے پر مطمئن ہو کر چلی گئیں۔ لیکن جب باقی لوگ اپنے واجبات وصول کرنے کے لئے آئے تو انہوں نے اپنے پہلے مطالبات کی منظوری سے شہہ پا کر مزید مطالبہ بھی پیش کر دیا۔

"کچھ نے اپنے کپڑوں کے لئے رقم چاہی دوسروں نے اپنی تنخواہوں میں سے پہلے کی جانے والی کٹوتیوں کی واپسی کا مطالبہ کر دیا کیونکہ ان کے خیال میں یہ کٹوتیاں ناجائز تھیں۔ ان کو اپنے افسروں کی حمایت بھی حاصل تھی اپنے ماتحتوں کی حمایت کے جذبات میں بہہ کر ان افسروں نے اس وقت تک جنرل ایویٹا بائیل کے پاس سے ہٹنے سے انکار کر دیا جب تک کہ وہ انہیں مطمئن نہیں کر دیتا۔

"جنرل نے برانگیختہ ہو کر گورکھترہ میں محافظوں کو حکم دیا کہ وہ باقی دو کمپنیوں کو واپس لوٹا دیں۔ یہ سپاہ واپس چلی گئی۔ تاہم جاتے ہوئے انہوں نے اپنی بندوقوں کو لوڈ کر لیا اور اس عزم کا اظہار کیا کہ وہ جنرل کی زندگی لے کر رہیں گے۔ پشاور سے تین میل دور واقع کیمپ میں واپسی کے بعد اس سپاہ پر شہر کے دروازے بند کر دیئے گئے اور کشمیری رجمنٹ سے تعلق رکھنے والے شہر میں موجود تمام لوگوں کو (جو کہ تعداد میں تیس تھے) پکڑ کر گورکھترہ میں آہنی سلاخوں کے پیچھے دھکیل دیا گیا۔ جہاں وہ ابھی تک موجود ہیں۔ بیس گولا اندازوں اور ان کے دو جمعداروں کو جنہیں اپنی بندوقیں کشمیری بٹالین میں پہنچانے کی سازش میں ملوث پایا گیا تھا کو پکڑ کر قید کر لیا گیا۔

"جنرل ایویٹا بائیل نے تین ہزار افراد پر مشتمل افغان سپاہ تیار کرنے میں زیادہ وقت نہ لیا۔ اس نے چمکنی سے تعلق رکھنے والے قلندر خان اور فتح دین ممند کو اس فوجی جتھے کی تیاری اور کمان سونپ دی۔ ان دونوں فریقوں کو یہ ذمہ داری سونپی گئی تھی کہ وہ رات کو چمکنی میں سکھ بٹالین کا محاصرہ کر کے ان کا قتل عام کرتے رہیں گے یہاں تک کہ صرف ایک آدمی زندہ بچے۔ لالچ کے طور پر انہیں وعدہ دیا گیا کہ ہر سکھ سپاہی کے قتل کے بدلے انہیں کم از کم اسی روپے دیئے جائیں گے۔

"آٹھ تاریخ کی شام جنرل ایویٹا بائیل نے اپنی نجیب سپاہ کی دو کمپنیاں ہماری

حفاظت کے لئے بھجوا دیں کیونکہ باغیوں کو یہ کہتے سنا گیا تھا کہ ان کے سارے مطالبات پورے ہو جانے کے بعد وہ مجھے قید کر لیں گے۔ ان محافظوں کے بغیر ہم زیادہ محفوظ تھے کیونکہ ہمیں ان پر اعتماد نہیں تھا۔ اور میں کسی شے کو ہوا دیئے بغیر ان کو واپس بلا لئے جانے کی کوشش کروں گا۔"

"آج صبح (8 جون) چمکنی کی طرف سے بندوقیں چلنے کی مسلسل آوازیں سنی گئیں۔ صبح سورج کے طلوع ہونے سے لے کر ساڑھے سات بجے تک یہ گھن گھرج جاری رہی پھر مسلسل کم ہوتے ہوئے آٹھ بجے بالکل بند ہو گئی۔ میدان جنگ سے ہم تک پہنچنے والی اطلاعات کے مطابق سکھوں نے رات ہی کو مورچہ بندی کر لی تھی کیونکہ انہیں وقت سے پہلے ہی اس حملے کی اطلاع مل گئی تھی۔ افغانوں نے بغیر کسی منصوبے یا حکم کے حملہ کیا تھا اور بہت نقصان اٹھایا تھا۔ انہوں نے سکھوں کے قبضے سے ایک قلعہ چھڑا لیا مگر وہ ابھی تک مضبوط پوزیشن میں تھے اور دونوں طرف سے حملوں کی شدت میں کمی آ گئی تھی۔

"مجھے جنرل ایویٹا بائیل سے معلوم ہوا کہ اصل میں اس کا منصوبہ یہ تھا کہ اولا سدری سپاہی (قبائلی لیویز) چمکنی میں سکھ بٹالین پر حملہ کریں گے مگر خراب موسم اور رات بھر چھائی رہنے والی مکمل تاریکی نے اس پر عملدر آمد نہ ہونے دیا۔ مجھے اب بتایا گیا کہ سات بجے بھی سکھ بٹالین مکمل بے خبری میں ماری جاتی اگر اولا سدری سپاہیوں کا ایک دستہ اپنے اصل مشن کو چھوڑ کر کیمپ کے باہر چرنے والے سکھوں کے یک صد مویشیوں کو چوری کرنے کی کوشش نہ کرتا۔ سکھ خبردار ہو گئے اور انہوں نے صبح روشنی پھوٹنے پر شروع ہونے والے افغانیوں کے حملے کے لئے خود کو تیار کر لیا۔"

"افغانیوں نے سکھ کیمپ میں داخل ہوتے ہی لوٹ مار شروع کر دی اور سکھوں نے ان کو مصروف پا کر گولیوں کی بوچھاڑیں کرنی شروع کر دیں اور انہیں پیچھے ہٹنے پر مجبور کر دیا۔ اس پسپائی کے دوران افغانیوں کے چالیس بندے قتل یا زخمی ہوئے جبکہ سکھوں کے نقصان کا شمار پینتالیس قتل یا زخمی تھا۔ جس میں چار مرد شامل تھے۔ تاہم ان کے اکثر اثاثہ جات لوٹ لئے گئے۔"

"صبح سکھوں نے جنرل ایویٹا بائیل سے تحریری درخواست میں اپنی پچھلی غلطیوں پر پشیمانی کا اظہار کیا اور غیر مشروط ہتھیار ڈالنے اور اس کے احکامات کی تعمیل کا اعادہ کیا۔ انہوں نے درخواست کی کہ انہیں جان بچا کر نکل جانے کی اجازت دے دی جائے جبکہ وہ اپنے قبضے میں موجود تمام سرکاری جائیداد' اپنا اسلحہ' خیمہ جات' اور وہ رقم جو ان کی ادا کر دی گئی ہے اور جس کی رقم کی ایک دن پہلے ادائیگی کی توقع تھی وہ تمام کی تمام اشیاء چھوڑنے پر تیار ہیں۔ جونہی دن چڑھا تو انہوں نے اپنے دشمنوں میں اضافہ ہوتے دیکھا کیونکہ آس پاس کے علاقوں سے افغان لوٹ مار کرنے کے لئے جوق در جوق اکٹھے ہو رہے تھے۔ اس بڑھتی ہوئی تعداد نے انہیں پریشان کر دیا اور انہوں نے اپنے ایک افسر کو جنرل ایویٹا بائیل کے پاس اس یقین دہانی کے ساتھ بھیجا کہ وہ ہر لحاظ سے اس کا حکم ماننے کو تیار ہیں۔

"ان کے نمائندے کی آمد کے بعد اور دونوں نجیب بٹالینوں کے انچارجوں سے تبادلہ خیال کر کے اس نے اس شرط پر ان کے سابقہ قصور معاف کرنے کی حامی بھر لی کہ وہ پشاور لوٹ آئیں گے اور وصول کی گئی رقم واپس کر کے اتنی ہی تنخواہ پر کام کریں گے جتنی نجیب سپاہ کو دی گئی تھی۔ انہوں نے اس شرط کو ماننے پر آمادگی ظاہر کی تو اولا سدری سپاہ کو حکم دیا گیا کہ وہ واپس چلی آئے تاکہ سکھ بٹالین اپنے مردوں کو جلا سکے۔ اس حکم کی تعمیل کی گئی۔

"23 جون 1841____ سکھوں نے زائد وصول کردہ تمام رقم جنرل ایویٹا بائیل کو لوٹا دی ہے۔ علاوہ ازیں چاروں کمپنیوں نے اپنی تنخواہیں بھی واپس جمع کروا دی ہیں۔ اس نے انہیں اختیار دیا ہے کہ یا تو وہ یوسف زئی علاقے میں چلے جائیں یا چھٹی لے کر لاہور چلے جائیں۔ انہوں نے یوسف زئی علاقے میں جانے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ افغانوں کی خدمات کے صلے کے طور پر جنرل ایویٹا بائیل نے ریاست کے خلاف ان کی تمام فرو گزاشتوں کو معاف کر دیا ہے اور کئی قیدیوں کو آزاد کر دیا ہے (وگرنہ ان کے مقدر میں پھانسی کا پھندہ تھا) اور انہیں لوٹ کا مال اپنے پاس ہی رکھنے کی اجازت دے دی ہے۔"

لارڈ ایلن بورو نے خط کا جواب دیتے ہوئے کیپٹن میکسن کے اس خیال کی تائید کی ہے کہ اگرچہ یہ اقدامات جنرل ایویٹا بائیل کی مقبولیت میں بمشکل ہی اضافہ کریں گے تاہم اس کے علاوہ اور کوئی چارہ کار بھی نہ تھا۔ کیونکہ پشاور میں اس کی پوزیشن اتنی بری تھی لیکن اس سے مزید بری ہونا مشکل تھا۔ دور سنگین بیماریوں کے لئے سنگین ادویات اور سخت اقدامات کی ضرورت ہوتی ہے۔"

اپریل 1843 میں ایویٹا بائیل کو فارغ کر دیا گیا تو وہ لاہور کے لئے روانہ ہو گیا جہاں اس نے چند ماہ قیام کر کے اپنے معاملات نمٹائے' کھاتے بند کئے اور یہ یقینی بنایا کہ ایک آنہ بھی پیچھے نہ رہ جائے۔ اس سارے عرصے کے دوران وہ بدھ کا آوا پہ بنے اپنے مکان میں قیام پذیر رہا۔ اگرچہ یہ ٹیلہ ابھی تک سازشیوں اور طوائف الملوکی کے کھیل کے بڑے کرداروں کے ملنے کی جگہ تھی تاہم کسی نے بھی اسے لوٹنے کی کوشش نہ کی۔ کیونکہ اس کے حالیہ سنگین اقدامات نے اس کی ماضی کی شہرت میں اضافہ کر کے خوفناک بنا دیا تھا۔

اس کے حرم میں شامل بیسیوں خواتین کا کیا بنا اس کا کوئی ذکر نہیں ملتا۔ لیکن شاید انہیں اس کے دوستوں میں تقسیم کر دیا گیا تھا یا پنشن دے دی گئی تھی۔ ہمیں اس کی اولاد کے حوالے سے بھی کوئی خبر نہیں ملتی۔ سوائے ایک بیٹی کے جو ایک پٹھان لڑکی سے پیدا ہوئی جس نے لمبے عرصے تک ایویٹا بائیل کی دل پھینک محبت پر قابو پائے رکھا۔ اس بیٹی کے متعلق لارنس یہ چھوٹی سی افسردہ کہانی بیان کی ہے: (27)

"اس کی اتنی احتیاط سے نگرانی کی جاتی تھی کہ اسے کھانا بھی کانونٹ کی طرح ٹرن پورٹ کے ذریعے پہنچائے جاتے تھے۔ اس کے راستے پر کسی مرد کا سایہ تک نہیں پڑنے دیا گیا تھا۔ یہ پوچھا جا سکتا ہے کہ آخر کس اعلیٰ مقصد کے لئے اس خوبصورت چڑیا کو مخصوص کیا گیا تھا؟ اپنے تخیل کے زور پر ہم کہہ سکتے ہیں کہ کسی شہزادے یا اعلیٰ خاندان کے خانوادے کے لئے۔ مگر سنگین حقیقت یہ تھی کہ ایویٹا بائیل نے اسے ایک باورچی سے بیاہ دیا اور جہیز میں سونے اور جواہرات بڑی تعداد میں دیئے۔ کیونکہ وہ اس بوجھ کے ساتھ یورپ میں نہیں جانا چاہتا تھا۔

"ایویٹا بائیل رخصت ہوا تو باورچی اور اس کی نازک بیوی دونوں گمنامی کی زندگی میں چلے گئے۔ کیونکہ اس دولت کے ساتھ سکون کی زندگی گزارنے کے علاوہ ان کی کوئی اور خواہش نہ تھی۔ لیکن وہ ان دنوں میں زندہ تھے جب حکومت بہت غریب تھی اور رعیت میں سے کسی کا امیر ہونا خوشگوار امر نہ تھا۔ پھر جتنے وہ دفاعی طور پر کمزور تھے اتنا ہی آسان شکار تھے۔ اور نمدار بھی وہ تھا جس کا بال بال ایویٹا بائیل کے احسان میں جکڑا ہوا تھا۔ جنرل کی سرپرستی میں وہ ایک معمولی کلرک سے دیوان بنا اور پھر جنرل کے ریٹائر ہو کر یورپ چلے جانے پر اس کی بٹالینوں کا انچارج بنا۔ ان کی دولت کے متعلق جانتے ہوئے اس نے اپنے آقا کی بیٹی کے ساتھ بے ایمانی کر کے اپنے لئے کرم نوازی چاہی۔ اجازت ملنے پر اس نے اس جوڑے کی تمام دولت لوٹ کر انہیں انتہائی غربت کی حالت میں چھوڑ دیا۔"

یہ خبیث پنڈت جودھا رام تھا۔ اس کے لئے ان کرتوتوں کی سزا مقدر میں لکھی تھی۔ ایک سال بعد اسی جیسے ایک خبیث نے اسے ناک، کان اور ہاتھوں کی انگلیوں سے محروم کر دیا۔

ستمبر 1843 میں شیر سنگھ کی وفات کے فوراً بعد ایویٹا بائیل لاہور چھوڑ کر شملہ کے لئے روانہ ہو گیا جہاں اس نے گورنر جنرل سے ملاقات کی۔ کمپنی کے لئے اس کی غیر معمولی خدمات کے باوجود گورنر جنرل اس سے انتہائی سرد مہری سے پیش آیا۔ اغلباً اس کے اخلاقی جرائم اور شیطانی ظلم کی بناء پر۔ اس لئے مختصر سے قیام کے بعد وہ کلکتہ کے لئے روانہ ہو گیا یہاں اس کا استقبال شملہ کے بالکل الٹ ماحول میں ہوا۔ کیونکہ اس کی شہرت نے اس کی بدنامیوں کو چھپا لیا تھا اور اپنی خطیر دولت کے افسانوں کی وجہ سے یورپی اور ہندوستان دونوں اقوام کے لئے اس کے لئے متجسس تھے۔

اس عرصہ کو کلکتہ کے کاغذات میں اسے ایک "معزز اور مہذب بوڑھے" کے طور پر ذکر کیا گیا ہے جو "کم گو اور وضع دار ہے اور بظاہر تھکا ہوا لگتا ہے۔" اس کی سکوت پسندی غالباً اس وجہ سے تھی کہ تقریباً بیس سال سے وہ مہذب معاشرے سے دور رہا تھا۔ کلکتہ سے وہ نیپلز کے لئے روانہ ہو گیا جہاں بادشاہ نے اس کا استقبال کیا

اور اسے سینٹ فرڈی ننڈ کراس کے اعزاز سے نوازا۔ اسے نیا پولیٹن آرمی کا اعزازی جنرل بھی بنایا گیا کیونکہ اس نے شاید دونوں افغان لڑکوں کے علاوہ دوسرے قیمتی تحائف بھی پیش کئے تھے۔ یہ دونوں افغان لڑکے جن کے متعلق بر نے ذکر کیا ہے ایویٹا بائیل کے ہمراہ ہندوستان سے آئے تھے۔

نیپلز کے بعد وہ پھر پیرس بھی گیا جہاں لوئی فلپ نے اس کا خیر مقدم کیا اور اسے لیجن آف آنر کراس کے ساتھ ساتھ فرانسیسی فوج کے جنرل کے خطاب سے بھی نوازا۔ یہاں سے وہ لندن گیا جہاں افغان جنگ کے دوران کمپنی کے لئے اس کی خدمات کے صلے کے طور پر ایسٹ انڈیا کمپنی نے اسے ایسٹ انڈیا ہاؤس میں استقبالیہ دیا جہاں اسے خطاب کی دعوت دی گئی اور ساتھ ہی تین صد طلائی سکوں کی قیمت والی سورڈ آف آنر بھی پیش کی گئی۔ اسے ڈیوک آف ولنگٹن کے ساتھ ملاقات کا شرف بھی بخشا گیا۔ اسے افغان جنگ اور عوام بارے بہت سی ایسی باتیں بتائی جو وہ اس سے پہلے نہیں جانتا تھا۔

لندن ہی میں اس نے اپنے تمسکات کے بدلے رقم حاصل کی اور نیپلز واپس پہنچ کر اپنے لئے کیل لامیر کے مقام پر ایک گھر بنایا جہاں وہ چند سال ہی ٹھہر سکا کیونکہ اس کی مخصوص عادات اور دہقان خواتین کے ساتھ خفیہ تعلقات کی وجہ سے ہمسایوں کے لئے وہ قابل نفرت بن گیا۔ انہوں نے بادشاہ سے شکایت کی جس نے معاملے کی چھان بین کے بعد ایویٹا بائیل سے کہا کہ بہتر ہو گا وہ کسی مزید پرسکون گوشے کی طرف چلا جائے۔

یہ اشارہ سمجھ کر جنرل نے اپنا کاسل لامیر والا بڑا گھر چھوڑ دیا اور ایجرولا پر جھانکتی ہوئی ایک پہاڑی کی چوٹی پر نیا بنانا شروع کر دیا۔ تاہم یہ مکمل نہ ہو سکا کیونکہ ابھی تین چوتھائی ہی مکمل ہوا تھا کہ اس کا آخری وقت آ گیا۔ اس کی موت کے بارے میں حقائق کچھ عرصہ تک چھپے رہے مگر پھر مسٹر جے کاٹن نے اس کی موت کے عوامل کا جائزہ لینے کے لئے ایجرولا کا دورہ کیا۔ تب یہ منکشف ہوا کہ جنرل کے خاندان نے اس کی دولت کو اپنے تک ہی محدود رکھنے کے لئے اس کی شادی پوپ کے استثنائی

قانون کے تحت اسی کی بھتیجی سے کر دی جو کہ ایک گداز بدن کی انیس سالہ دوشیزہ تھی۔

جس طرح کہ ایسی بے جوڑ شادیوں میں ہوتا ہے جلد ہی جوڑے کے درمیان مسائل کھڑے ہوئے۔ شادی سے پہلے اس لڑکی کے گاؤں کے ایک وکیل کے ساتھ تعلقات تھے جو کہ شادی کے بعد بھی جاری رہے۔ جلد ہی یہ بات ایویٹا بائیل کے نوٹس میں آگئی اور اس کی دھمکیاں کہ اگر اس نے دونوں کو اکٹھے پکڑ لیا تو برا انجام ہو گا۔ یہ سلسلہ مارچ 1850 میں اختتام پذیر ہوا۔

ایویٹا بائیل اپنے نئے گھر میں شفٹ ہونے کے لئے بے تاب تھا۔ اس نے نامکمل کمروں میں سے ایک میں رہائش اختیار کر لی۔ سردی کا موسم تھا اور کمرے کو گرم کرنے کے لئے کوئلوں کی انگیٹھی سلگائی جاتی تھی۔ اب یہ اتفاق تھا یا سازش کہ ایک رات اس انگیٹھی کو خام کوئلے سے بھر دیا گیا۔ گیارہ بجے ایویٹا بائیل نے بھنے ہوئے بکرے کا ڈنر کیا۔ شک کیا جاتا ہے کہ اس میں بھی زہر ملایا گیا تھا۔ اس کے بعد اس کے ملازم جو کہ نیچے گاؤں میں رہتے تھے اسے شب بخیر کہہ کر رخصت ہو گئے۔

صبح جو سب سے پہلا ملازم واپس لوٹا اس نے اپنے آقا کو سخت اذیت میں کراہتے ہوئے پایا۔ وہ ساتھ ہی بڑبڑا بھی رہا تھا کہ اسے زہر دے دیا گیا ہے۔ وجہ جو بھی رہی ہو ڈاکٹر کے پہنچنے سے قبل وہ آخری سانس لے چکا تھا۔ بعد میں اس کی لاش کا پوسٹ مارٹم بھی نہ کروایا گیا۔ جس کی وجہ سے اور اس کے اثاثہ جات کی پراسرار گمشدگی اور گزشتہ رات کو ملازموں کی نقل و حرکت سے ایویٹا بائیل کے مرتے وقت دعویٰ کی تصدیق ہوتی محسوس ہوتی ہے۔

اس کی موت کی جو بھی وجہ رہی ہو کوئی شخص بھی یہ بات نہیں کہہ سکتا کہ وہ ایک ظالمانہ موت کا حقدار نہیں تھا۔ کیونکہ اپنے سے پہلے وہ اتنے لوگوں کو اس طرح سے اوپر بھیج چکا تھا کہ جو ناقابل ستائش تھا اور بلاشبہ وہ سب اس کے حقدار نہیں تھے۔

اس کی موت کے فوراً" بعد مقدمہ بازوں کا ایک جم غفیر اس کی جائیداد پر پل پڑا

اور یہ سلسلہ اتنا طویل ہوا کہ ساری کی ساری جائیداد وکلاء کے حصے میں ہی آئی۔ اب بھی حکومت کو ایسی درخواستیں موصول ہوتی رہتی ہیں جن میں حکومت سے لاہور میں مبینہ طور پر چھوڑی گئی ایویٹا بائیل کی عظیم جائیداد کے بارے میں معلومات مانگی گئی ہوتی ہیں۔ لیکن جیسا کہ ہم کہہ چکے ہیں کہ ایویٹا بائیل نے یہاں اپنے پیچھے سوائے برے اخلاق و کردار کی بدنامی کے اور کچھ نہ چھوڑا تھا۔ اگرچہ وہ ایک نہایت قابل گورنر تھا۔

(یہ مضمون سی۔ گرے کی کتاب

European Adventurers of North India (1785-1849) London 1929, Reprinted Lahore 1982,

سے لیا گیا ہے)

Reference

1. Cohor's Life, page 585.
2. Adventurers in the Punjab, page 274.
3. Hugel's Travels in Kashmir, page 317.
4. Punjab Records, Book No 73, letter No 270.
5. Life of Henry Law sence, pages 292-294.
6. Adventurers in the Punjab, page 69.
7. Sohan Lal's Diary.
8. Political Diaries, Vol VI,pages 2-3.
9. Wolff's Travels, Vol II, page 61.
10. Punjab Records, Book No 110, letter No 43.
11. Hugel's Travels in Kashmir, pages 317-18.
12. Thirty five Years in the East, page 53.
13. Life of Avitabile, page 533.

14. Machinnor's Military Services, pages 245-46.
15. Life of Avitabile, page 540.
16. Life of Avitabile, page 538.
17. Punjab Records, Book No 40, letter No 1.
18. Journal of a March, etc, page 231.
19. War in Afghanistan (Havelock), Vol II, pages 195-7.
20. Mackinnor Military Service in Afghanistan, page 200.
21. Life of Avitabile, page 539.
22. Life of Sir Henry Durand , page 63.
23. Punjab Records, Book No 40, letter No 96.
24. Punjab Records, Book No 40, letter No 115.
25. Punjab Records, Book No 40, letter No 125
26. Punjab Records, Book No 40, letter No 120,125.
27. Calcutta Review, Vol VI, pages 247-48.

جین فرانسوا ایلرڈ

سی۔ گرے/طارق عزیز سندھو

جین فرانسوا ایلرڈ 1785 میں بحر روم کے ساحلی علاقے سینٹ ٹراپیز (St. Tropez) میں پیدا ہوا۔ وہ سپین کے شاہی اعزاز "لیجن آف آنر" (جو کہ جوزف بوناپارٹ نے جاری کیا تھا) اور پنجاب اور درانی سلطنت کے اعزازات کا حامل یافتہ تھا۔ دسمبر 1803 میں وہ انگریز مسلح سواروں کے تیئسویں دستے میں شامل ہو گیا اور ان کے ساتھ 1806 تک اٹلی میں کام کیا۔ اس کے بعد اسے سرجنٹ۔ میجر کی حیثیت سے جوزف بوناپارٹ کے محافظ کے عہدے تک ترقی دے دی گئی۔ اور پھر دو سال بعد نپولین کے مسلح سواروں کے ایک دستے میں سپین میں خدمات سرانجام دینے کے لئے بھیج دیا گیا۔

اس نے 1814 تک سپین میں کام کیا۔ اور فوجی جھڑپوں کے نتیجے میں دو مرتبہ زخمی ہوا۔ ایک مرتبہ تو اس قدر شدید زخمی ہوا کہ اس کی خدمات کے اعتراف میں فرانس اور سپین کے جنگی اعزاز سے نوازا گیا اور استعماری فوج کے مسلح سواروں کے دستے میں لیفٹیننٹ کے عہدے تک ترقی دے دی گئی۔ چند مہینوں بعد اسے فوج کے ساتویں مسلح دستے میں بطور کیپٹن کے ترقی دے دی گئی۔ اور پھر ماریچل بروَن (Marechal Brune) کے سٹاف آفیسر کے طور پر منتخب کیا گیا۔ وہ ان کے ساتھ نپولین عہد کے خاتمے تک آدھی تنخواہ پر رہا۔ تقریباً سو دنوں کے لئے وہ نپولین کے ہمراہ بطور کیپٹن کے کام کرتا رہا اور واٹرلو کی جنگ میں حصہ لیا۔

بوناپارٹ کے ساتھ اس والہانہ وابستگی کے نتیجے میں ایلرڈ کو اس کے عہدے اور آدھی تنخواہ سے محروم کر دیا گیا۔ ہم بیرن ہیوگل (Baron Hugel) کے مندرجہ ذیل کلمات کے علاوہ یہ اندازہ لگانے سے قاصر ہیں کہ اگلے پانچ اور چھ سالوں میں اس کا کیا

بنا۔

"جناب ایلرڈ نے فرانس کی استعماری فوج میں بڑے امتیاز کے ساتھ اپنی خدمات سر انجام دیں اور ایک عظیم شجاعت کے مالک' اعلیٰ صلاحیتوں کے حامل اور نہایت شائستہ مزاج والی شخصیت گردانے گئے۔ اپنے سیاسی نظریات کے باعث شاہی نوکری سے نکل جانے کے بعد انہوں نے مصر کا سفر اختیار کیا۔ اور پھر تہران کے محل کے جانب روانہ ہوئے۔ یہاں پر پھر انہیں ملک چھوڑنے کا قصد کرنا پڑا کیونکہ یہاں ایک دس ماہ سے رہائش پذیر ایک شخص نے ایلرڈ کے ہم نشیں و ینچورا (Ventura) کو مطمئن کر دیا کہ شاہ عباس کے ہاں فوری طور پر کوئی نوکری ملنے کا امکان نہیں ہے۔ وہ تاجروں کی حیثیت سے سفر پر نکلے اور قندھار سے ہوتے ہوئے لاہور جا پہنچے۔"

اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ ایلرڈ نے کچھ عرصہ مصری فوج کے ساتھ بھی کام کیا ہو گا۔ جیسا کہ واٹرلو کی جنگ کے بعد بہت سے فرانسیسی فوجی افسروں نے دوسرے ممالک میں قسمت آزمائی کی تھی۔ وہ و ینچورا (Ventura) سے پہلے کہاں ملا' کوئی نہیں جانتا مگر بظاہر یہ دونوں ایران میں اکٹھے ہی داخل ہوئے تھے۔ اس دور کے ایک فرانسیسی سیاح فاؤنٹینیئر (Fontanier) کے مطابق ان دونوں کو لاہور جانے کا مشورہ ایک روسی سفیر نے دیا تھا۔ جس کے ذہن میں یقیناً کچھ مقاصد تھے۔ اگر ایسا تھا بھی تو روسی سفیر کو مایوسی ہوئی ہو گی کیونکہ ان میں سے کسی نے بھی روسی مفادات کے لئے کوئی کام نہیں کیا۔ شاید انہیں ایسا کرنے کا موقع نہ ملا ہو۔

یہ دونوں مسافر 23 مارچ 1822 کو لاہور پہنچے اور کافی انتظار کے بعد رنجیت سنگھ کی خدمات کے لئے قبول کر لئے گئے۔ جیسا کہ ان کی آمد سے متعلق تمام تفصیلات و ینچورا (Ventura) پر ہمارے بیان میں محفوظ ہیں۔ لہٰذا ہم خبر نگار کے ایلرڈ کی شخصیت پر ان الفاظ کے علاوہ مزید کچھ نہیں پیش کرنا چاہیں گے۔ "وہ ایک گہرے نقوش کا شخص تھا' ذہین مزاج' اور نہایت اعتماد سے اعلیٰ اور نچلے درجے کے مقامی لوگوں سے شفقت اور توجہ سے پیش آتا۔"

ایلرڈ کو دو رجمنٹوں کی ٹریننگ کا کام سونپا گیا تھا۔ ایک یورپی مسلح سواروں کی اور دوسری پیادہ فوجیوں کی۔ بارہ مہینوں بعد ان نئے تربیت یافتہ دستوں نے نوشہرہ کی

جنگ میں جس کارکردگی کا مظاہرہ کیا وہ میسن (Masson) کے ان الفاظ سے ظاہر ہوتا ہے' جو اس نے تقریباً ایلرڈ ہی سے سنے تھے۔

"رنجیت سنگھ نے اٹک کے مقام پر دریائے سندھ کو عبور کرنے کا ارادہ نہیں کیا تھا۔ اور غالباً یوسف زئی کا بھی یہی خیال تھا کہ وہ دریا میں شدید لہروں کے پیش نظر ایسا نہیں کرے گا۔ مگر اپنے غصے کے بہاؤ کو نہ روک سکنے کے باعث اس نے اپنی داڑھی کو نوچا اور سکھوں سے کہا کہ وہ اپنے گرو سے کی جانے والی بے عزتی کا بدلہ لیں۔ مسٹر ایلرڈ نے جو کہ اس وقت اپنی رجمنٹوں کے ہمراہ وہاں موجود تھا' مہاراجہ کو سمجھانے کی کوشش کی۔ مگر وہ نہ صرف ناکام رہا بلکہ اسے بھی دریا کو عبور کرنے کا حکم ملا۔

سکھوں نے نہایت پھرتی سے اپنے حاکم کے حکم کی تعمیل کی۔ اور دریا میں چھلانگیں لگا دیں۔ مگر دریا میں پانی کا زور اس قدر شدید تھا کہ کم و بیش 1200 فوجی اس میں بہہ گئے اور پھر ڈوب گئے۔ مسٹر ایلرڈ نے پھر اپنا ہاتھی آگے بڑھایا اور بگل بجایا۔ منظم فوجی دستے پورے کے پورے دریا میں اتر گئے۔ اور ان کی مربوط حکمت عملی کے باعث وہ صرف تین جانی نقصانات کو سہتے ہوئے انتہائی کامیابی سے دریا عبور کر گئے۔ رنجیت سنگھ نے فوراً" ہی نظم و ضبط کے فوائد کی تعریف کی اور اس خوشی میں نئے محصولات کا اعلان کیا۔

البتہ یہ ارادہ یہاں تک ہی رک گیا۔ اور ایلرڈ کے زیر انتظام فوج کی تعداد 1829 تک اتنی ہی رہی۔ مگر اس کے بعد یہ 4 رجمنٹوں تک بڑھا دی گئی جو کہ کل ملا کر 2425 آدمی بن گئے۔ ایک مرتبہ پھر ہم میسن (Masson) (1) کا یہاں حوالہ دیں گے' جس نے 1829 میں لاہور کا دورہ کیا تھا۔

"جنرل ایلرڈ تب 3000 کی مسلح فوج کا سالار تھا۔ جو کہ مسلح گھڑ سواروں کی ایک رجمنٹ' نیزے بازوں کی ایک رجمنٹ' اور مسلح یورپی گھوڑ سواروں کی دو رجمنٹوں پر مشتمل تھا۔ اس کے زیر تربیت توپ خانے کے 2000 افراد بھی تھے۔ جن میں 200 توپیں جو کہ گھوڑوں کی مدد سے چلتی تھیں وہ بھی شامل تھیں۔

"جنرل کی انتظامیہ نہایت بھرپور تھی۔ اور یہ سب رنجیت سنگھ کی نرمی کے باعث تھا' جو جنرل ایلرڈ کی خوبیوں کی تعریف کرتا اور اس کے اعلیٰ ذوق کی تکمیل کے لئے ہر

طرح کی سہولتیں مہیا کرتا اور اس کے علاوہ دولت جمع کرنے کے لئے مدد کرتا۔"

میسن (Masson) کے اعداد و شمار تنخواہ کے معاملے میں اس سے اتفاق نہیں کرتے۔ اور جہاں تک توپ خانے کا تعلق ہے تو ہمیں یہ کہنا پڑتا ہے کہ یہ برطانوی انداز کا گھوڑوں سے مزین توپ خانہ نہ تھا بلکہ مختلف اقسام کی توپوں کو گھوڑوں کے ذریعے کھینچے جانے والا توپ خانہ تھا۔ توپ خانے کا مرکزی ذخیرہ لاہور میں تھا۔ اور اس عرصے کے دوران ایلرڈ انتظامی امور کا انچارج رہا ہو گا۔

نوشیرہ کی جنگ کے بعد اور پشاور پر قبضے کے بعد (جو کہ بعدازاں افغانیوں کے پاس واپس چلا گیا) فرانسیز کیمپو (یہ الفاظ فرانسیسی تربیت یافتہ دستے کے لئے استعمال کئے جاتے تھے)' کانگڑا چلے گئے اور اپنے فرائض کی ادائیگی کے بعد لاہور واپس آئے۔

اگلے چند سال تک ہم خبر نگاروں کے خطوط یا اس دور کے سیاحوں کے ذریعے ایلرڈ کے متعلق مزید کچھ نہیں جان پاتے۔ حتیٰ کہ فرانسیسی فطرت پسند جیک مونٹ (Jacquemont) 1831 میں لاہور آنے پر ایلرڈ اور رنجیت سنگھ کے یورپی آفیسروں اور اپنی رعایا سے برتاؤ کے طریقوں پر ہمیں چند اہم معلومات فراہم کرتا ہے۔ جیک مونٹ (Jacquemont) (2) لکھتا ہے۔

"مسٹر ایلرڈ' رنجیت سنگھ کے لئے سلیمان بے (Suleman Bey) ہی کی طرح ہے (سلیمان بے ایک فرانسیسی تھا اور اس وقت مصری فوج کی قیادت کر رہا تھا)۔ وہ اکثر اوقات لدھیانہ میں برطانوی افسران سے ملاقات کے لئے جاتا ہے۔ اسے ہر سال 100,000 فرانکس کی تنخواہ ملتی ہے۔ مگر وہ رنجیت سنگھ کا تقریباً آدھا قیدی ہی ہے۔ جو کہ اس بات کا خیال رکھتا ہے کہ مسٹر ایلرڈ اپنی ساری کمائی ہر سال بغیر جمع کئے ختم کرے تاکہ ایلرڈ میں رنجیت سنگھ کو چھوڑنے کی خواہش جنم نہ لے سکے۔ رنجیت سنگھ یہی حکمت عملی دوسرے یورپی آفیسروں کے ساتھ بھی روا رکھتا ہے۔ ایلرڈ ادبی علم اور ذوق کا مالک شخص ہے۔ افسر اکثر رنجیت سنگھ کے شکوک کو بڑھائے رکھتے ہیں۔ اور یوں وہ اس کے اعتماد کو بحال رکھنے کے لئے مستعدی کا مظاہرہ کرنے پر مجبور ہوتے ہیں۔

"یہ ممکن ہے کہ میں دوبارہ مسٹر ایلرڈ سے مل سکوں۔ جبل رانی کے سپوت اپنی

وراثت پر لڑ رہے ہیں (جیک مونٹ شہر سے لکھ رہا تھا) اور رنجیت سنگھ نے اس نزاد کی وجہ 9 لاکھ کے خاتمے کے لئے ایلرڈ کو روانہ کر دیا ہے۔ اگر میں مسٹر ایلرڈ کے چاندی کے تمغے کو سونے میں بدلتا دیکھ سکوں تو یہ میرے لئے باعث راحت ہو گا۔ ان کے نام کا پورے برٹش انڈیا میں احترام کیا جاتا ہے اور عزت سے بڑا اور کیا ہے۔ اس کی انسانیت دوستی' انصاف پسندی اور دانائی کے خلاف ایک آواز بھی موجود نہیں ہے۔ وہ ہر وقت فرانس کے متعلق بات کرتا ہے۔ مگر اس کے زیادہ فرانسیسی دوست نہیں ہیں۔ اس نے اپنی فوج کے لئے لافا ییتی (La Fayette's) پرچم کا انتخاب کیا ہے۔

ہمیں ایلرڈ کے متعلق مزید معلومات سید محمد لطیف کی تاریخ پنجاب سے ملتی ہیں۔ اور ان کی پیش کردہ ہندوستان کے گورنر جنرل اور اس کی آخری آزاد ریاست کے سربراہ کے مابین ملاقات کی تفصیلات ہمیں رنجیت سنگھ کی ایلرڈ پر اعتماد اور مشرقی طمطراق کے متعلق بتاتی ہیں۔ ہم یہاں ان میں سے کچھ کا مکمل حصہ پیش کرتے ہیں۔

"یہ طے پایا تھا کہ دو سربراہان کے مابین ملاقات 26 اکتوبر کی صبح کو ہو گی۔ تمام تیاریاں عروج پر تھیں کہ اچانک مہاراجہ کے ذہن میں تبدیلی آئی۔ وہ کسی بغاوت یا دھوکے کا شک محسوس کرنے لگا۔ اور اس کے چند مشیروں نے اسے بتایا کہ برطانوی مفادات کے کسی نمائندے سے ملنے کے لئے اپنے علاقے کو چھوڑنا نہایت نامعقول سی بات ہے۔ اسے یہ مشورہ دیا گیا کہ گورنر جنرل کو امرتسر میں ملے یا پھر یہ ملاقات ہی منسوخ کر دے۔ شکی مزاج مہاراجہ نے مسٹر ایلرڈ کو کہلوا بھیجا کہ وہ اگلے روز ملاقات کے لئے نہیں جا سکے گا۔

"مسٹر ایلرڈ نے اپنے سربراہ کے شکوک ختم کرنے کی پوری کوشش کی اور بڑا سر کھپایا کہ کوئی نامناسب حرکت نہیں ہو گی۔ اس نے مہاراجہ کو ذہنی طور پر الجھا کر رکھ دیا۔ لہٰذا اب نجومیوں کو بلایا گیا۔ اپنی مقدس کتابوں سے معلومات حاصل کرنے کے بعد انہوں نے بتایا کہ انگریزی مہاراجہ کے مخلص ساتھی ہیں۔ اور یہ ملاقات دونوں ممالک کے تعلقات بہتر بنانے میں بڑی مددگار ثابت ہو گی۔ مگر انہوں نے مہاراجہ کو مشورہ دیا کہ وہ گورنر جنرل سے ملتے وقت اپنے دونوں ہاتھوں میں ایک ایک سیب رکھے اور جونہی وہ گورنر جنرل کو دیکھے تو ایک سیب ان کو پیش کر دے۔ اور ایک اپنے پاس رکھ

دیے۔۔

اگر عزت ماب گورنر جنرل نے وہ سیب قبول کر لیا تو اس ملاقات کے ثمرات بہت مفید ہوں گے اور یوں ملاقات بھی بغیر کسی خطرے کے جاری رہے گی۔ اگلی صبح گورنر جنرل کے ایک وفد نے مہاراجہ کا انتظار شروع کر دیا اور اس دورے سے متعلق تمام تیاریاں مکمل کر لی گئیں۔ مہاراجہ نے صبح سویرے مسٹر ایلرڈ کے 800 مسلح گھڑ سواروں کو روانہ کیا اور ان کے بعد گھڑچڑھا (Ghorcharrah) کے بہترین 3000 مسلح گھڑ سواروں کو بھیجا۔ جب اس نے یہ تمام روانگی دیکھ لی تو وہ اور اس کے خاص ساتھی نے سفر شروع کیا۔ تقریباً یہ سب ہاتھیوں پر سوار تھے اور بسنتی رنگ کے لباس میں ملبوس تھے۔ وہاں پہنچنے کے بعد سکھوں کے سردار اور اس کے ساتھی برطانوی فوج کے قطار در قطار بنائے گئے راستے سے گزرتے ہوئے گورنر جنرل کے کیمپ تک پہنچے۔

"یہاں گورنر جنرل نے ان کا استقبال کیا اور رسمی کلمات کے تبادلے کے بعد اس نے سب سے پہلا کام گورنر جنرل کو سیب پکڑانے کا کیا۔ جو کہ اسی وقت قبول کر لیا گیا۔ اس صورتحال سے خوش ہوتے ہوئے مہاراجہ گورنر جنرل کے ہودے کی جانب بڑھے اور پھر یہ دونوں سربراہ اپنے اپنے وفود کے ہمراہ عوام سے بھرے ٹینٹ کی جانب بڑھے۔"

"مہاراجہ کے وفد کے ارکان اور اس کے ساتھی سرداروں کے لئے کرسیاں لگائی گئی تھیں۔ اس نے بڑے احتیاط سے ہر سردار کا نام لیا اور اس وقت تک خیمے میں داخل نہیں ہوا' جب تک سبھی لوگ نہ داخل ہو گئے اور اپنی کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ گورنر جنرل اور مہاراجہ تب اپنی نشستوں پر بیٹھے۔ تمام منظر بڑا دلکش تھا۔ یہاں نہ صرف سکھ موسم بہار کے پیلے رنگ والے لباس میں ملبوس تھے بلکہ انتہائی چمکتے ہوئے اسلحے کو بھی اسی رنگ سے سجایا گیا تھا۔ اور اس کے ساتھ ساتھ ان کے سر' چھاتی اور ہاتھوں پر ہیرے' جواہر اور موتی سجے ہوئے تھے' جو کہ اس منظر کو نہایت دلکشی فراہم کر رہے تھے۔

"کچھ دیر کی گفتگو کے بعد' مہاراجہ کے لئے تحائف اندر لائے گئے۔ یہ 51 تھالوں پر مشتمل تھے' ہر تھال اس کی زندگی کے ایک سال کی نذر تھا۔ ان تھالوں کا سامان

کلکتہ، ڈھاکہ اور بنارس سے لائے گئے نادر زیورات، موتیوں کے ہار، ہیروں سے سجی پگڑیاں، ایک سونے کی تلوار وغیرہ پر مشتمل تھا۔ اور اس کے ساتھ ساتھ مہاراجہ کے لئے برما کا ایک بہترین ہاتھی اور دو مستعد گھوڑے بھی لائے گئے تھے۔ مال و جواہر سے بھرے 21 تھال سب کے سامنے کھلے رکھ دیئے گئے جبکہ ایک گھوڑا سونا اور چاندی سے لدا ہوا تھا۔ سواروں کے لئے شاہی لباس پیش کئے گئے۔ مہاراجہ نے اپنے تحائف کی ہر تھال کو بڑے احتیاط سے دیکھا اور تھال اٹھانے والوں اور خادمین کو دو ہزار روپے کی رقم عنایت کی۔

"عزت مآب گورنر جنرل نے اگلے روز مہاراجہ کی طرف دورہ کیا۔ مہاراجہ کے کیمپ میں ان کے استقبال کے لئے بڑی تیاریاں کی گئی تھیں۔ ملاقات کے لئے مخصوص جگہ پر کشمیری کام سے سجے ہوئے ٹینٹ لگائے گئے اور یہاں سے دریا تک کے راستے پر فوجیوں کی دو قطاریں بنائی گئیں۔ عزت مآب گورنر جنرل نے بڑی کشتیوں کی راہنمائی میں دریا کو عبور کیا اور پھر خادمین کی ایک بڑی تعداد کے ہمراہ کشتیوں کے پل پر مہاراجہ نے اس کا استقبال کیا۔ جب دونوں سربراہ اپنی اپنی مقررہ نشستوں پر بیٹھ گئے تو پھر توپوں سے شاہی سلامی دی گئی۔

"سکھوں کے کیمپ میں خوبصورت کشمیری کام سے سجے شامیانے بڑے دیدہ زیب تھے۔ اور جس شامیانے کے نیچے مہاراجہ اور گورنر جنرل بیٹھے وہ موتی اور جواہر سے سجا ہوا تھا۔ جبکہ زمین پر بچھائے جانے والا کپڑا سلک کا بنا ہوا تھا، جس پر سونے اور چاندی کا کام کیا گیا تھا۔ ایک طرف نفیس سونے کے کپڑے کے پردے لٹک رہے تھے جن میں انتہائی نادر موتی اور ہیرے جڑے ہوئے تھے۔ گورنر جنرل کو سونے سے بنے تخت پر بٹھایا گیا تھا۔ مہاراجہ اس کے دائیں ہاتھ پر سونے کی کرسی پر جلوہ افروز تھا۔ جب سبھی لوگ اپنی اپنی نشستوں پر بیٹھ گئے تو پھر مہاراجہ نے اپنی ریاست کے تمام افسران اور سرداروں کو بالترتیب گورنر جنرل سے متعارف کروایا۔ اور ان سب نے گورنر جنرل کو سونے کے تحفے پیش کئے جنہیں چھو کر قبول کر لیا گیا۔"

"اس کے بعد ہر اعتبار سے مسلح مہاراجہ کے گھوڑے سامنے لائے گئے۔ اور پہلے کی طرح مہاراجہ نے ان کے نام اور خصوصیات کا ذکر کیا۔ پھر ناچنے والی لڑکیوں کو لایا

گیا' جن کے دیدہ زیب لباس نے اس منظر کی دلکشی کو اور بڑھا دیا۔ جب روانگی کا وقت قریب آیا تو گورنر جنرل اور ان کے سٹاف کے لئے تحائف پیش کئے گئے۔ عزت ماب گورنر جنرل کے لئے 101 (جو کہ شاہی نمبر ہے) تھالوں میں تحائف ترتیب دیئے گئے تھے۔ اور ان تحفوں میں کشمیر اور پنجاب سے لایا گیا قیمتی سامان' جواہر اور تقریباً سات بڑے بڑے ہیرے شامل تھے۔ اور اس کے علاوہ قیمتی پتھروں اور سونے سے جڑی تلوار اور تیروں سے بھرے ہوئے دو صندوق اور چاندی کے برتن اور سونے اور چاندی کے کپڑوں کے پردے بھی شامل تھے۔ اور اس کے ساتھ ساتھ دو زبردست گھوڑے اور چاندی کے ہودے کے ہمراہ ایک ہاتھی کا بھی اضافہ کیا گیا تھا۔"

"اس کے بعد کے 4 دن تفریح اور ایک دوسرے کے جائزے میں گزرے اور اس کے بعد دونوں گروہ ایک دوسرے سے جدا ہوئے اور اپنے اپنے گھروں کی جانب چل نکلے۔"

لارڈ ولیم بینٹکس (Lord William Benticks) کے کیمپ کے افسران کے درمیان ایک یورشین (Eurasian) کمانڈر سیکنر (Skinner) بھی تھا' جو اپنی رائے کا اظہار یوں کرتا ہے کہ ایلرڈ کا فوجی دستہ برطانوی فوجی دستے کے مقابلے میں کم تر تھا اور اس رائے کو دوسروں نے بھی تسلیم کیا ہے۔ مگر یہ بھی تسلیم کیا گیا ہے کہ اس میں ایلرڈ کا کوئی قصور نہیں تھا۔ اس کی وجہ رنجیت سنگھ کی مستقل فوج کے قیام کے لئے کی جانے والے خرچ میں کمی بتائی جاتی ہے۔ یعنی کہ یہ رقم اگلے چند سالوں میں مزید کم ہو گئی' جیسا کہ 23 اگست 1834 کے لاہور سے پتا چلتا ہے۔

"جس عدم تسلسل سے رنجیت سنگھ کی فوج کو تنخواہ ملتی ہے اور جس تھوڑی بہت تنخواہ پر نامناسب جرمانے لگائے جاتے ہیں' اس کے باعث تمام فوج میں بے چینی پائی جاتی ہے۔ اور اگر مہاراجہ نے بروقت اس بے رحمانہ عدم دلچسپی پر قابو نہ پایا جو کہ اس نے ان کے مطالبات اور ترجیحات کے حوالے سے کرنا شروع کر دی ہیں تو یہ فوج کے اتحاد کو متاثر کر سکتی ہے۔ مسٹر ایلرڈ کی تیار کردہ مسلح فوج میں اب صرف ایک فوجی ہی باقی بچا ہے جبکہ باقی کے تمام چھوڑ کر جا چکے ہیں۔ اور فرانسیسی فوجی بھی اس توجہ سے محروم ہو گئے ہیں جو وہ ایک زمانے میں حاصل رکھتے تھے۔"

یوں تو کسی بھی صورت میں عزت اور توجہ میں کمی کا مطلب تنخواہ میں کمی نہیں ہوتا۔ اور اگرچہ ایلرڈ کے فوجی دستوں کی مانند بہت سے یورپی افسر بہت زیادہ عزت یا عدم توجہی کے اتار چڑھاؤ سے متاثر ہوئے' مگر ان کی تنخواہ کو کبھی نہیں چھیڑا گیا۔ مگر اس وقت ایلرڈ کی پریشانی کا سبب اور بہت سے معاملات بھی تھے۔ پہلا مسئلہ تو اس کی بیٹی کی وفات کا تھا۔ اور دوسرا مسئلہ یہ تھا کہ وہ تمام دولت جو وہ کسی طرح سے جمع کر چکا تھا پامر بینک (Palmer's Bank) کے ناکام ہو جانے سے ڈوب گئی۔ یہ ایک اور بڑا مالیاتی اور تجارتی مسئلہ تھا جس کا زوال بہت سے یورپی افراد کے لئے تباہی تھی کیونکہ یہ نیم حکومتی ادارہ ہندوستان میں مقیم بیشتر یورپی افراد کے لئے رقم کا لین دین کرتا تھا۔

ایلرڈ کی صحت بھی بہت عرصہ ملک سے باہر قیام کے باعث متاثر ہوئی تھی اور پھر اس کی بیوی بھی اپنے بچوں کی تعلیم کے لئے واپس فرانس جانے کی خواہش مند تھی۔ لہٰذا اس کے سبب ایلرڈ نے لمبی چھٹی کی درخواست دے دی۔ اور اس کے نتیجے میں کی جانے والی گفتگو کا کچھ حصہ ہم درجہ ذیل میں پیش کرتے ہیں۔

"مسٹر ایلرڈ نے اپنے ملک واپس جانے کے لئے چھٹی کی ایک درخواست بھیج دی۔ مہاراجہ نے جمعدار خوشحال سنگھ کو حکم دیا کہ وہ مسٹر ایلرڈ کے پاس جائے اور اسے اس بات پر راضی کرے 30,000 مالیت کے پشمینہ (کشمیری شال) اپنی تنخواہ کے عوض لے لے۔ اور اس کو یہ بھی بتا دے کہ اگر وہ جانا چاہتا ہے تو اس کو اجازت ہے۔ جمعدار خوشحال سنگھ گیا اور تقریباً ڈیڑھ گھنٹے کے بعد آیا اور مہاراجہ کو مطلع کیا کہ مسٹر ایلرڈ پشمینہ کے طور پر اپنی تنخواہ لینے پر رضامند نہیں ہے۔ کیونکہ یہ اس کے لئے کسی نقصان سے کم نہیں ہو گا۔ مہاراجہ نے انتہائی غصے سے جواب دیا کہ جب مسٹر ایلرڈ اور ونچورا (Ventura) اپنے ملک سے آئے تھے تو وہ غریب و مسکین دکھائی دیتے تھے مگر اب لاکھوں روپیہ کمانے کے بعد انہوں نے مجھے اپنے نخروں سے متاثر کرنا شروع کر دیا ہے۔"

"مہاراجہ نے پھر مسٹر ایلرڈ سے پوچھا کہ وہ کس راستے سے اپنے ملک واپس جانے کا ارادہ رکھتا ہے۔ اس نے جواب دیا کہ وہ بہاولپور اور بمبئی کے راستے واپس جائے گا۔ مہاراجہ نے پوچھا اگر وہ مسٹر ونچورا (Mr. Ventura) کو راستے میں دیکھنا چاہے

گا' جب وہ مسٹر ونچورا کو اس کے تنخواہ کے بقایا جات ختم کرنے کو کہے گا۔ (تاکہ وہ بہت زیادہ رقم کے ساتھ رخصت ہونے کی تکلیف سے بچ سکے)۔ جمعدار خوشحال سنگھ اور بھائی گورمکھ سنگھ کو حکم دیا گیا کہ وہ مسٹر ایلرڈ کے پاس جائیں اور اسے بتائیں کہ فوجی رجمنٹوں کی تربیت میں لاکھوں روپے صرف ہوئے ہیں جو کہ اس کی روانگی کے بعد انتشار اور مسائل میں گھر جائیں گے۔ وہ ایلرڈ میں یہ خواہش پیدا کرنا چاہتے تھے کہ وہ فی الوقت اپنے ملک واپس جانے کا ارادہ ترک کر دیں۔ وہ ایلرڈ کے پاس گئے اور ڈیڑھ گھنٹے بعد واپس آ کر مہاراجہ کو مطلع کیا کہ مسٹر ایلرڈ اپنے ارادوں پر مستحکم ہے۔"

"کنور کھڑک سنگھ نے مہاراجہ کو بتایا کہ مسٹر ایلرڈ نے شہر کے جواہری کو اپنے چاندی کے اعزازات بیچنے کو بھیجے ہیں۔ مہاراجہ نے یہ گلا کیا کہ اگرچہ مسٹر ایلرڈ کے ارادے بدلنے کی ہر ممکن کوشش کی گئی ہے مگر وہ اس پر راضی نہیں ہو گا۔"

"مہاراجہ نے ایلرڈ سے کہا کہ اس نے مہاراجہ کے ساتھ 12 سال کام کیا ہے۔ لہٰذا اس کے دل میں ایلرڈ کے لئے احترام کے جذبات ہیں۔ جس کے نتیجے میں مہاراجہ روانگی کی تیاریوں کو بڑے افسوس سے دیکھتا ہے۔ لہٰذا وہ کچھ عرصے کے لئے اپنی روانگی کو ملتوی کر دے اور اس کے بدلے میں مہاراجہ اسے پہلے کی نسبت زیادہ اعزاز سے نوازے گا۔ مسٹر ایلرڈ کو اس کی تنخواہ کے عوض 30,000 مالیت کے پشمینہ دیئے گئے۔ اور یہ بتایا گیا کہ اپنے ملک سے واپسی تک وہ اپنی آدھی تنخواہ انگریزی نظام کے تحت وصول کرتا رہے گا۔"

"خوشحال سنگھ نے مہاراجہ کو بتایا کہ مسٹر ایلرڈ مہاراجہ سے 40,000 روپے ادھار مانگنے کی خواہش رکھتا ہے مگر مہاراجہ نے جواب دیا کہ جیسا کہ اس کا گھر بہت ہزار میل دور ہے لہٰذا اس کو اتنی زیادہ رقم دینا عقل کی بات نہیں ہو گی۔ البتہ اگر اس کی ضرورت بہت زیادہ ہے تو وہ یہ رقم پشمینہ میں وصول کر سکتا ہے۔"

"مسٹر ایلرڈ کے متعلق یہی خواہش کی جا رہی تھی کہ وہ مزید ایک سال وہاں رہے اور پھر تمام اعزازات کے ساتھ نوکری سے برخاست ہو۔ مگر اس نے جواب دیا کہ وہ اب ضرور جائے گا لیکن ڈیڑھ سال بعد واپس ضرور آ جائے گا۔ گیارہ کپڑوں پر مشتمل

ایک، خلعت' ایک موتیوں کا ہار' ہاتھوں میں باندھنے والے ڈوریاں' اس کو پیش کی گئیں اور مسٹر کالی رام کو کہا گیا کہ اسے 30,000 مالیت کی پشمینہ دی جائیں۔ مسٹر ایلرڈ کو یہ بھی کہا گیا کہ وہ اپنی روانگی سے قبل دربار میں حاضری دیتے رہیں (کیونکہ پشاور میں اس کی رجمنٹ تعینات تھیں)۔"

اٹھارہ مہینوں کے بعد ایلرڈ نے مطلوبہ چھٹی اس یقین دہانی کے بعد کر لی کہ اس کی دوبارہ واپسی پر اسے رکھ لیا جائے گا۔ اور پھر وہ برطانوی ذرائع سے پاسپورٹ حاصل کرنے کے بعد 15 جون 1834 کو اپنی بیوی اور بچوں کے ہمراہ براستہ کلکتہ یورپ کے لئے روانہ ہوا۔ کلکتہ میں گورنر جنرل یا اس کے نمائندگان کو کچھ خطوط وہ ذاتی طور پر پہنچانا چاہتا تھا۔ اٹھارہ مہینوں بعد وہ دوبارہ کلکتہ کے ذریعے اکیلا آن پہنچا۔ کلکتہ اس وقت یورپ سے ہندوستان آنے والوں کے لئے محبوب بندرگاہ تھی۔

وہ اپنے ہمراہ ہتھیاروں کا ایک بڑا ذخیرہ' پستول' اور دوسرے آتش گیر مادہ لے کر آیا تھا۔ ان کے لانے میں ہی اس کی دولت کو اتنا گھٹا دیا کہ اس نے حکومت ہند سے ان اشیاء کو اندرون ملک پہنچانے کے لئے قرضہ وصول کیا۔ یہ کل رقم 40,000 روپوں پر مشتمل تھی اور پیسے واپس کرنے کے معاملے میں ہم دیکھتے ہیں کہ سرکاری کرنسی اس وقت دو بالکل مختلف اقسام کے روپوں پر مشتمل تھی۔ یہ روپے نانک شاہی (فرخ آباد) اور سکہ روپیہ۔ پہلی قسم کم حیثیت کی تھی اور جب ایلرڈ نے رقم واپس کی تو اس نے نانک شاہی میں کی' جبکہ اس نے سکہ وصول کیا تھا۔

اس مسئلے پر بہت سے پیچیدگیاں موجود ہیں۔ یہ فرق تقریباً 700 روپے کا تھا مگر رقم ایلرڈ کی موت کے بعد بھی واپس نہیں کی گئی۔ اس کا بھتیجا بینجمن ایلرڈ (Allard Bonjamin) جو کہ فرانس سے ریاست کے امور چلانے آیا تھا' اس نے ایلرڈ کی ہندوستان میں کل جائیداد جو کہ 25,000 روپے کی تھی اس میں سے رقم کے پیسے واپس کئے۔

اس کے لاہور پہنچنے پر رنجیت سنگھ نے ایلرڈ کا بڑی گرم جوشی سے استقبال کیا اور ان تمام اشیاء کو بھی خوش آمدید کہا جو وہ ساتھ لایا تھا۔ اسے نہ صرف ان اشیاء کی پوری قیمت ادا کی گئی بلکہ رخصت ہوتے وقت 30,000 روپے بھی دیئے گئے۔ اس

قدر غیر متوقع نوازشوں کی بارش کے پیش نظر جنرل ایلرڈ مندرجہ ذیل جذباتی الفاظ بول پڑا جو کہ اس نے فارسی زبان میں مہاراجہ کی خوشی کے لئے ادا کئے تھے یا پھر یہ اس حد درجہ سخاوت کے زیر اثر ایک نظم ہی تھی۔

اے خدا' میرا بادشاہ لمبی زندگی جیئے
خدا کرے کہ آسمان اس کی خدمت میں ایک غلام کی مانند ہو
خدا کرے میں اس کے دربار میں پہنچوں اور عزت پاؤں
اور اگر کبھی میں اس کے حکم کی نافرمانی کروں
تو خدا کرے کہ مجھے موت آ جائے
اگر میں مروں تو میری قبر لاہور میں ہو
اور میرے جسم کے باقیات انارکلی میں دفن ہوں

ایلرڈ اور برطانوی حکومت کے درمیان فرانس کے بادشاہ کو مخاطب کئے گئے کچھ تعریفی کلمات پر انحصار کرنے سے بدمزگی پیدا ہو گئی۔ ایلرڈ کا خیال تھا کہ رنجیت سنگھ لاہور میں اپنا کوئی نمائندہ رکھنا چاہتا ہے۔ اور اس کے نتیجے میں وہ بادشاہ لوئی فلپ (Louis Philippe) کی جانب سے ایک خط کے ہمراہ خود کو اس عہدے کے لئے منتخب کرتے ہوئے آیا۔ اس خط کی ایک نقل حکومت ہند کو بھجوا دی گئی جس نے بڑی شدت سے کسی بھی یورپی براعظم کے نمائندے کی اپنی سرحدوں کے بیچ نامزدگی پر تشویش کا اظہار کیا۔ اور ایلرڈ کو اپنے ارادے ترک کرنے پر مجبور کیا گیا اور اس بات کی وضاحت کرنے کو کہا کہ یہ بادشاہ لوئی فلپ کی جانب سے رنجیت سنگھ کو ایک دوستانہ خط ہی تھا۔

ایلرڈ کے زیر انتظام مسلح گھڑ سوار اب خصوصی توجہ کے حامل تھے کیونکہ نئی توپوں نے مہاراجہ کو اس قدر متاثر کیا تھا کہ اس نے حکم جاری کئے کہ دو رجمنٹوں کو مزید ان سے مسلح کر دیا جائے۔ نئی تیار کی جانے والی توپوں کے لئے وزیر آباد میں وزن کیا گیا اور ان نمونوں کو دیکھتے ہوئے جو ابھی تک قائم تھے یہ کام کافی مہارت مانگتا تھا۔ لاہور کے پرانے اسلحہ ڈپو میں فرانس کی تیار کردہ کچھ توپیں موجود ہیں۔ اور ان کو پرانے انداز کی توپوں سے مختلف کیا جا سکتا ہے۔ تاکہ یہ دیکھا جا سکے کہ وہ سیکنی میں

واقع کلنگ گیسل میں 5 سال قبل بنے تھے اور تقریباً سیکنڈ ہینڈ تھے۔

انہی رجمنٹوں کے متعلق وڈ (Wood) اور بہت سے دوسروں نے تعریفی کلمات کہے ہیں۔ ان کی عمدہ تربیت اور معیار کا تمام تر سہرا ان کے جنہیں ایلرڈ اپنے ساتھ لایا تھا جو کہ سابق کپتان ماؤٹن (Mouton) کے سر جاتا ہے۔

ایلرڈ 23 جنوری 1839 کو حرکت قلب بند ہو جانے سے فوت ہو گیا۔ اس کی آخری خواہش کے پیش نظر اس کا جسم پشاور سے لاہور لایا گیا۔ ہر اس سٹیشن پر توپوں کی سلامی دی گئی جہاں سے ایلرڈ کا جسد خاکی گزرا۔ اور لاہور پہنچنے پر شاہدرہ سے انارکلی کا تین میل کا راستہ فوجیوں کی قطاروں سے بھرا پڑا تھا۔ اور جسد خاکی کے اپنی آخری آرام گاہ کی جانب کے دوران کچھ کچھ فاصلے پر توپوں کی سلامی دی گئی۔ بار (Barr) جو کہ لاہور اسی وقت پہنچا تھا' ایلرڈ کے کیریئر کے اختتامی منظر کو یوں بیان کرتا ہے:

"جونہی ہم شہر کی جانب بڑھے ہم نے ایک توپ کی گرج سنی اور پھر ہمیں بتایا گیا یہ جنرل ایلرڈ کے اعزاز میں چلائی گئی تھی' جو کہ پشاور میں فوت ہوا اور اب اس کا جسد خاکی تدفین کے لئے دارالخلافہ میں لایا جا رہا ہے۔ فوجی رجمنٹوں نے اس کے اعزاز میں پریڈ کی کیونکہ وہ یورپین اور ہندوستانیوں کی محبوب شخصیت تھی۔ وہ 23 جنوری 1839 کو 52 سال کی عمر میں فوت ہوا اور اپنے پیچھے ایک بیوی اور بچے فرانس میں چھوڑ گیا۔ وہ مہاراجہ کا بھی منظور نظر تھا اور مہاراجہ کی بگڑتی ہوئی صحت کے باعث وہ مہاراجہ کو ایلرڈ کی موت کی خبر سنانے سے بھی ڈرتے تھے۔"

"ہم مہاراجہ کے ڈاکٹر' ڈاکٹر بینٹ (Dr. Benet) کے ہمراہ ایلرڈ کی سرکاری رہائش گاہ پر بھی گئے جہاں اس کا جسد خاکی مدفن تھا۔ یہ رہائش گاہ یورپی مسلح گھڑسوار' پیادوں کی بڑی بڑی تصویروں سے سجی ہوئی ہے۔ بڑے بڑے برآمدوں میں بھی ایسی ہی تصاویر لگی ہوئی ہیں۔ یہاں کچھ فاصلے پر فوارے بھی ہیں جو کہ رہائشی حصے کو گرمیوں میں ٹھنڈا رکھتے ہیں۔ بالائی منزل کے تمام کمروں میں دیدہ زیب شیشے لگے ہوئے ہیں اور ان کے کونے میں ہوا دار اور پرسکون کمرے آرام کے لئے ہیں۔ ڈاکٹر بینٹ نے ہمیں وہ شال دیکھائی جو کہ ایلرڈ نے 3,000 روپے خرچ کر کے فرانس کی ملکہ کے لئے بنوائی

تھی۔ جبکہ ایلرڈ کی اپنی تصویر اسے ایک مضبوط اور قوت فیصلہ کے حامل شخص ایک خوبصورت اور سخی شخصیت کے طور پر پیش کرتی ہے۔ وہ توپ خانے کے افسران کی طرح کی وردی پہنا کرتا تھا۔ جس پر دو اعزازات تمغہ حسن کارکردگی اور رنجیت سنگھ کا ایک خصوصی اعزاز سجے ہوئے تھے۔ ایک اور تصویر میں اس کی کشمیری بیوی اور بچوں کے خوبصورت چہرے اپنے ملک کے لباس میں موجود ہیں جو کہ سب ہی سے داد وصول کرتے ہیں۔

شاید کسی دن اس عظیم فوجی اور مہم جو کے باقیات پر اس کے ہم وطن کوئی یادگار تعمیر کریں۔

(یہ مضمون سی۔ گرے کی کتاب سے ترجمہ کیا گیا ہے)

حوالہ جات

1. Masson's travels in Afghanistan, etc. Volume I, Pages 405 and 432.
2. Letters from India Volume II Page 64.

جین بپٹسٹ وینچورا، کاؤنٹ ڈی منڈی

Jean Baptiste Ventura, Count de Mandi

سی۔ گرے/ سعود الحسن خان

رنجیت سنگھ کے یورپی سپاہیوں میں سب سے زیادہ تربیت یافتہ سپاہی کی پیدائش، اس کے اجداد اور اس کے ابتدائی فوجی کردار کے بارے میں درج ذیل معلومات بھی نامکمل اور جزوی ہی ہیں۔

ہمیں ڈاکٹر وولف (Dr. Wolff) کے اس بیان کو نظرانداز کرنا پڑے گا کہ اس کا اصل نام روبن ابن تورا (Reuben bin Toora) تھا اور وہ موڈینا (Modena) کا یہودی تھا کیونکہ یہ بات ثابت نہیں ہو سکی ہے اور پھر اس کے برعکس شہادتیں بھی موجود ہیں۔ ہم یہ نتیجہ اخذ کر پائے ہیں کہ اگر وینچورا (Ventura) ہی اس کا اصل نام ہے (اور محض Adventura یا Adventurer کی بگڑی شکل نہیں ہے) تو پھر وہ حقیقتاً موڈینا کا پیدائشی مسیحی باشندہ تھا۔ اس بارے میں اس کا اپنا بیان موجود ہے جو اس نے مسز میکنزی (Mrs. Meckenzie) کے روبرو 1849ء میں دیا تھا کہ اس کا اپنا "بھتیج پوتا" (grand-nephew) ایک ڈومینیکن راہب (Dominican monk) تھا جو پیوس نہم (Pius IX) کا پرائیویٹ سیکرٹری تھا۔ اس کے مسیحی ناموں کا فرانسیسی تلفظ اس حقیقت کی غمازی کرتا ہے کہ اس نے اٹلی سے روانگی کے وقت اپنی اطالوی شہریت ترک کر دی تھی اور وہ پھر کبھی اٹلی واپس نہیں آیا۔

یوں معلوم ہوتا ہے کہ وہ 93-1792 میں پیدا ہوا تھا اور جوزف بوناپارٹ (Joseph Bonaparte) نے نپولین کے لئے جو اطالوی فوج تیار کی تھی اس کو اس کے موڈینائی امدادی فوج میں شامل کر لیا گیا تھا۔ اس نے اس فوجی ٹکڑی میں رہتے ہوئے

کئی جنگوں میں حصہ لیا۔ جس میں جنگ واگرام (Battle of Wagram)' جنگ روس 1812ء اور سب سے آخر میں جنگ واٹرلو (Battle of Waterloo) بھی شامل تھی۔ اس کو کراس (Cross) کہاں پر عطاء کیا گیا؟ اس بارے میں تو کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ لیکن غالباً لیجن آف آنر (Legion of Honour) ہمیں اس بارے میں کچھ تفصیل فراہم کر سکتا ہے اور نپولین کے لئے اس کی خدمات پر کچھ روشنی بھی ڈال سکتا ہے۔

پرنسپ (Prinsep) کہتا ہے کہ ونچورا نپولین کی ماتحتی میں پیادہ فوج میں کرنل تھا اور ممکن ہے کہ یہ بات درست ہو کیونکہ نپولین کی ابتدائی فتوحات میں بہت زبردست جانی نقصان ہوا اور جو باقی بچے تھے ان کو بڑی تیزی سے ترقی دی گئی۔ یوں ان کو بیس کا کرنل اور تیس کا جرنل تک بنا دینا کوئی غیر معمولی بات نہیں ہے۔ نپولین کے زوال کے بعد اس کے معاونین اپنے اپنے ممالک کو لوٹ گئے۔

موڈینائی باشندوں کے بارے میں بیرن ہیوگل (Baron Hugel) رقم طراز ہے کہ:

"ان کے ساتھ خصوصی بدسلوکی کی گئی حالانکہ باقی اطالوی سپاہیوں کو عام معافی دے دی گئی تھی۔ اس میں اطالوی فوج کی مشروط اطاعت کی اصطلاحات بھی شامل تھیں۔ ان چیزوں میں وہ لوگ آسٹریا کے سپاہیوں کے ساتھ شامل کئے گئے تھے" ____

(نپولین کی سلطنت کی حدود کے اندر عمومی تقسیم کے وقت اٹلی پر اس کا بھائی جوزف (Joseph) حکمران ہوا اور پھر اٹلی کو آسٹریا کے ساتھ شامل کر دیا گیا اور انیسویں صدی کے وسط تک اس ملک کی حالت یوں ہی رہی۔ یوں اس فوج کے وہ افسران جو نپولین کے ماتحت خدمات سر انجام دیا کرتے تھے ان کو الگ شناخت نہ کیا جاتا تھا بلکہ آسٹروی افواج میں شمار ہوتے تھے)۔

ہم یہ تو دریافت نہیں کر سکتے کہ ونچورا نے 1816ء اور 1820ء کے درمیانی برس کس طرح گزارے تھے۔ البتہ سینور اومز (Senor Oms) نے چند برس قبل ایک موقع پر ڈاکٹر مرے (Dr. Murray) سے قسطنطنیہ میں ونچورا کی ملاقات کا تذکرہ کیا ہے اور بتلایا ہے کہ اس نے کئی بار ترکی اور مصری افواج کے ساتھ خدمات سر انجام دیں۔

خاندان بوناپارٹ کے اکثر افسران نے ایسا ہی کیا تھا۔

وہ اور ایلرڈ (Allard) ایران کس طرح سے پہنچے اور انہوں نے وہاں سے کوچ کیوں کیا؟ اس کی بابت ایلرڈ کی یادداشتوں میں درج ہے۔ اس سفر میں ان کو چھ ماہ لگ گئے اور اس ضمن میں ہمیں ہنری لارنس (Henry Lawrence) کے اٹھائے گئے سوال کے علاوہ کسی اور کا بیان پیش کرنے کی ضرورت نہیں کہ کیا وہ دونوں کابل اور پشاور کے بازاروں میں بھیک مانگنے پر مجبور ہو گئے تھے۔ البتہ اس بات کی وقائع نویس (نیوز رائٹر) کے اس بیان سے اس طرح تردید ہوتی ہے کہ جب وہ دونوں رنجیت سنگھ کے دربار میں پہنچے تو انہوں نے اس کے درباریوں کو سونے کی اشرفیاں دکھائیں تھیں۔ لارنس یہ بھی کہتا ہے کہ انہوں نے "پشاور کی مسجد میں موذن کی خدمات سرانجام دیں"۔ اس حوالے سے علاوہ اس کے اور کچھ بحث کرنے کی ضرورت نہیں کہ مؤذن کا پیشہ عام طور پر موروثی ہوتا ہے اور ہر حال میں اس کی مشق کی ضرورت ہوتی ہے۔

وہ لوگ 10- مارچ 1822ء کو شاہدرہ میں جہانگیر کے مقبرے سے ملحقہ سرائے میں پہنچ گئے جو لاہور سے صرف تین میل کے فاصلے پر ہے۔ ہم اپنا مضمون وقائع نویس کی فراہم کردہ اطلاعات کے ساتھ جاری رکھیں گے کیونکہ یہ اطلاعات کافی اور مکمل ہیں :

"لاہور اخبار : 12- مارچ 1822ء____ "گزشتہ روز مہاراجہ نے مجھے ایک پروانہ بھیجا کہ مغربی سمت سے دو فرنگی معہ کئی ملازمین کے کابل اور رام نگر سے ہوتے ہوئے لاہور کے مقابل شاہ ڈیرہ پر آن پڑے ہیں۔ ان میں سے ایک تو عام آدمی ہے جبکہ دوسرا گورا (سفید سپاہی) ہے میں (وقائع نویس) نے جواب دیا کہ مسٹر مور کرافٹ (Mr. Moorcraoft) کے علاوہ مجھے ان میں سے کسی کی آمد کی اطلاع نہیں ہے۔

میں نے موہن لال کو شاہ ڈیرہ روانہ کیا کہ وہ مزید معلومات لائے۔ ان دونوں نے نہ صرف فارسی میں بات کی بلکہ فرانسیسی یا انگریزی میں سے بھی کوئی زبان استعمال کی۔ وہ ایران سے بذریعہ کابل یہاں آئے تھے تاکہ تفریح بھی کر سکیں اور [illegible] بھی حاصل کر لیں۔ ان کا ارادہ دو یا تین ماہ تک لاہور میں ٹھہرنے کا ہے۔ انہوں نے مسٹر مور کرافٹ (جو اس عہد کا انگریز سیاح تھا) کے بارے میں پوچھا۔ اور یہ بھی دریافت کیا

کہ وہ کسی فوج کے ساتھ بھی گیا ہے۔ موہن لال نے نفی میں جواب دیا اور کہا کہ مسٹر مور کرافٹ تجارتی مقاصد سے آیا تھا۔ انہوں نے پوچھا کہ یہاں سے دہلی کتنی دور ہو گا۔ انہیں بتایا گیا کہ 225 کوس کے فاصلے پر ہے۔"

16 مارچ 1822ء ____ مہاراجہ نے صاحب سنگھ' صدر ہرکارہ' کو حکم دیا کہ چونکہ ان دونوں آدمیوں کے بارے میں اطلاع نہ دی گئی ہے جو اس کی سرحد پر پہنچ چکے ہیں لہٰذا ان کو وہیں روک لیا جائے۔ ہرکارے نے جواب دیا کہ اسے اس کا علم نہیں' ان فرنگیوں نے لاہور میں رہائش کی غرض سے مکان کے لئے کہا ہے اور اگر انہیں مکان نہیں دیا جائے گا تو وہ وہیں شاہ ڈیرہ پر ٹھہرے رہیں گے۔

"16 مارچ 1822ء ____ مہاراجہ نے منشی سندھا رام کو حکم دیا کہ دونوں فرانسیسی حضرات الر اور ونٹور (یعنی ایلرڈ اور ونچورا) کو بلایا جائے۔ وہ دونوں حاضر ہوئے اور سو روپے نذرانہ پیش کیا۔ مہاراجہ نے مترجم رام داس سے کہا کہ یہ دونوں لوگ ہندی نہیں جانتے۔ مہاراجہ چونکہ قالین پر بیٹھا ہوا تھا لہٰذا اس نے ان دونوں سے وہیں پر بیٹھ جانے کی درخواست کی۔ ان سے ان کی صحت کے بارے میں دریافت کیا۔ اس کے بعد پوچھا کہ وہ کہاں سے آئے ہیں اور آگے ان کے ارادے کیا ہیں۔ انہوں نے جواب دیا کہ "ہم فرانسیسی ہیں اور روم (قسطنطنیہ)' بغداد' ایران' قندھار' کابل' پشاور اور اٹک سے ہوتے ہوئے لاہور آئے ہیں۔ مہاراجہ نے ان سے پوچھا کہ کیا وہ ایک حربی جوڑ توڑ والی ماہر فوج تیار کرنے کی مہارت رکھتے ہیں۔ انہوں نے مثبت جواب دیا کہ ان کا پیشہ جنگ تھا اور وہ فوجی تھے۔

مہاراجہ نے کہا کہ "اگر میں اپنا توپ خانہ اور کچھ بٹالین تمہیں دوں کہ تم خراسان فتح کرو تو کیا تم ایسا کر سکتے ہو۔" انہوں نے جواب دیا کہ "جی ہاں" مگر یہ بھی بتایا کہ موسم گرما شروع ہو چکا ہے جو یورپیوں کے لئے بڑا کٹھن ہوتا ہے۔ بعدازاں مہاراجہ نے ان سے کہا کہ وہ اس کی توپیں چلا کر دکھائیں۔ انہوں نے کہا ہم گولہ انداز (توپچی) نہیں ہیں مگر ہمارے پاس کچھ ماتحت توپچی ہیں جو ہماری ہدایات پر توپ چلا سکتے ہیں۔" تب مہاراجہ نے کہا کہ سکھ بہترین گھڑ سوار ہیں جو ایک سانت (دو گھنٹوں) میں

بیں بار بندوق سے نشانہ بازی کر سکتے ہیں۔ پھر اس نے پوچھا کہ کیا وہ یعنی فرانسیسی بھی گھڑ سواری میں مہارت رکھتے ہیں۔ انہوں نے جواب دیا کہ "ہم گھوڑے پر سوار ہو کر نہ صرف تلوار اور پستول استعمال کر سکتے ہیں بلکہ ایک سانت میں 300 گولیاں بھی داغ سکتے ہیں۔"

مہاراجہ نے ان سے پوچھا کہ کیا وہ (فرانسیسی) انگریزوں سے بھی زیادہ حربی صلاحیت کے حامل ہیں۔ انہوں نے جواب دیا کہ جنگی تربیت اور مہارت میں انگریزوں کے پائے کا کوئی نہیں ہے۔ اس کے بعد مہاراجہ نے پوچھا کہ وہ لوگ اس کے ہاں قیام کرنے یا پھر چلے جانے میں سے کیا پسند کریں گے۔ انہوں نے جواب دیا کہ انہیں ملازمت کا شوق نہیں ہے بلکہ وہ تو یہ چاہتے ہیں کہ موسم گرما لاہور میں گزار دیں اور پھر ہندوستان میں ان کا نصیب ان کو جہاں لے جائے گا وہ چلے جائیں گے۔

دوپہر کو مہاراجہ نے ان کو ہدایت دی کہ وہ یورپی انداز میں اس کی بٹالینوں کو تربیت دیں۔ انہوں نے جواب دیا کہ "تمہاری بٹالینوں نے جو سیکھنا تھا وہ سیکھ لیا۔ ہم ان کو کچھ نہیں سکھا سکتے کیونکہ جب کسی شال کو ایک بار ایک طریقے سے بن لیا جائے تو پھر وہ کسی دوسرے طریقے سے بنی نہیں جا سکتی۔ اگر مہاراجہ ہمیں نئے سپاہی بھرتی کر کے دے گا تو ہم انہیں اپنی مشقیں سکھا سکیں گے۔ اور جب تک ہم ایک پوری بٹالین کو سکھا نہ دیں اور مہاراجہ تو اس کی حقیقی پریڈ اور مشق دکھا کر خوش نہ کر دیں تب تک ہم نہ تو کچھ قبول کر سکتے ہیں اور نہ ہی کریں گے۔ جب مہاراجہ ہمارا کام دیکھ لے اور اس کی توثیق کر دے تو پھر وہ ہمارے لئے معقول معاوضہ مقرر کر سکتا ہے۔"
مہاراجہ نے مجھے اشارے سے کہا کہ اپنے اطوار اور گفتگو سے وہ دونوں اعلیٰ عہدیدار اور نتیجہ خیز شخصیت معلوم پڑتے ہیں۔"

فرانسیسیوں کا یہ تبصرہ کہ پہلے سے کسی خاص نظام میں تربیت یافتہ لوگوں کو کسی دوسرے نظام کے تحت تربیت دینا اور انہیں ماہر بنانا کافی مشکل ہے' دراصل بالکل درست بات ہے۔ جو سپاہی ایک خاص نظام میں ماہر ہو جائے تو وہ دوسرے کسی نظام کو قبول کرنے میں رجعت سے کام لیتا ہے۔

"انہوں نے بڑی تنخواہ کا مطالبہ کیا یعنی فی ڈیئم (diem) کے لئے دس سونے کی اشرفیاں اور گھوڑوں و ملازمین کا مشاہرہ الگ سے مانگا۔ مہاراجہ خاموش ہو گیا۔ دوپہر کو مہاراجہ نے دھونکل سنگھ کی بٹالین کو پریڈ کرنے کا حکم دیا۔ اس میں آدھے سکھ تھے اور آدھے یورپی لوگ تھے۔ اس نے فرانسیسیوں کو بلوایا اور ان سے پوچھا کہ ایرانی اور درانی افواج کی استعداد کیسی ہے۔ انہوں نے جواب دیا کہ درانی' ایرانیوں سے زیادہ بہتر سپاہی ہیں بلکہ اول الذکر یکدل و متفق تھے اور اس دنیا میں جو کچھ ہوتا ہے وہ تنظیم اور اتفاق سے ہوتا ہے۔ مہاراجہ نے پھر سے پوچھا کہ "کیا میری بٹالین یورپی انداز میں تربیت حاصل کر سکتی ہیں؟"

"انہوں نے کہا کہ اس ملک میں سکھوں کی بٹالین مقابلتاً" اچھی ہیں۔"

"پھر مہاراجہ نے کہا کہ میری فوج بہت جنگ جو ہے اور انگریزوں سے زیادہ طاقتور ہے۔"

"پریڈ شام تک ہوتی رہی۔"

"لاہور اخبار' 18 اپریل 1822ء____ میں (وقائع نویس) دربار گیا اور نوروز کے موقع پر ایک نذر پیش کی۔ مہاراجہ نے فرانسیسیوں کا تذکرہ کیا اور مجھ سے پوچھا کہ کیا میں نے کیپٹن مرے سے پوچھا ہے کہ وہ کون لوگ ہیں۔ میں نے نفی میں جواب دیا۔ مہاراجہ نے بڑی خوشی سے بتایا کہ انہوں نے خود کو فرانسیسی اور فرانس کے بادشاہ بونا پارٹ کا مصاحب بتایا ہے۔ یہ وہاں دوسرے درجے (کرنل) کے افسران ہیں اور انہیں فی ڈیم کے لئے 50 سونے کی اشرفیاں ملتی تھیں۔"

"جب بونا پارٹ کو شکست ہو گئی تو وہ روم (قسطنطنیہ) چلے گئے۔ پھر ایران اور کابل ہوتے ہوئے وہ وہاں سے بحیثیت تاجر لاہور کو آ گئے۔ مہاراجہ نے کہا کہ "میں نے انہیں دس روپے فی ڈیم کی پیش کش کی تھی جس پر وہ یہ کہتے ہوئے بالکل راضی نہ ہوئے کہ بونا پارٹ کی ملازمت میں 50 سونے کی اشرفیاں فی ڈیم ملا کرتی تھیں۔ اگر آپ ہمیں 10 سونے کی اشرفیاں فی یوم ادا کریں گے تو یہ کافی ہوں گی اور اگر تم ہمیں صرف خرچہ دینے کے خواہش مند ہو تو ہمیں اس کی ضرورت نہیں۔ اس کے بعد

انہوں نے اپنی تھیلیوں میں سے کئی سونے کی ٹکڑیاں (چھوٹے سکے جو تقریباً 5 روپے کا ایک ہوتا ہے) دکھائیں تاکہ یہ ثابت کریں کہ وہ پیسے کے محتاج نہیں ہیں۔

کچھ دیر تک اسی طرح کی باتیں اور بے نتیجہ بحث و مباحثے چلتے رہے یہاں تک کہ مہاراجہ کو اعتماد میں لینے کے لئے ان دونوں نے فرانسیسی زبان میں اس کے نام خط تحریر کیا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ کوئی دستاویز حاصل کر کے لدھیانہ میں موجود برطانوی ایجنٹ کو بھیجی جائے تاکہ اس سے یہ رائے لی جائے کہ آیا یہ دونوں لوگ فی الحقیقت فرانسیسی ہیں یا پھر اس کو یہ ظاہر کیا جائے کہ وہ برطانوی جاسوس ہیں یا کم از کم مشکوک ہیں:

"یکم اپریل 1822ء

بخدمت عزت ماب مہاراجہ لاہور

جناب عالی!

ہماری اس دارالحکومت میں آمد کے ساتھ ہی عزت ماب نے جو مہربانی و کرم ہم پر کیا ہے وہ بے اندازہ ہے اور جتنا ہم نے جناب کی فیاضی کا اندازہ لگایا تھا وہ اس سے بھی بڑھ کر ہے۔ عزت ماب بہت عظیم المرتبت شخص ہیں اور لافانی اقتدار اعلیٰ کے حامل ہیں۔ جناب جب ہم آپ عزت ماب کے روبرو پہلی بار پیش ہوئے تو ہم نے آپ کے سامنے اپنے سفر کا مقصد بیان کیا۔ آپ کی جانب سے ملنے والے جواب سے ہم مطمئن تو ہو گئے ہیں لیکن ہمارے غیر یقینی مستقبل کا احساس ہے۔

..... اس لئے ہم نے فقیر نورالدین کی ہدایت پر اپنی درخواست فرانسیسی زبان میں پیش کی ہے۔ یہ ہمارے دربار کی شناسا زبانوں میں سے ایک ہے۔ ہم عزت ماب سے ایک بار پھر گزارش کرتے ہیں کہ آخری احکامات جاری فرمائے جائیں جس کے لئے ہم ہمیشہ تابعدار رہیں گے اور آپ کی عزت کرتے رہیں گے۔

ہم تہہ دل سے آپ کے بہت مؤدب، بہت شکر گزار، بہت فرمانبردار اور نہایت مخلص خادمین ہیں۔

سی ایچ ونچورا ــــ سی ایچ ایلرڈ

اس خط کی اصل دہلی روانہ کر دی گئی۔ یہ ذکر کہ لاہور دربار میں ایک شخص فرانسیسی جانتا ہے غالباً درست نہیں کیونکہ اگر کوئی ہوتا تو اسے پہلے ہی سامنے لے آیا جاتا۔ دہلی سے جواب آنے تک مہاراجہ نے ان دونوں کی وفاداری اور ان کی حربی صلاحیت کا مزید جائزہ لیا' آگے جو باتیں ہم بیان کریں گے وہ بہت حیران کن اور دلچسپ ہیں۔ اس خط سے مہاراجہ کی وہ ذہنیت جھلکتی تھی جسے عام طور پر چالاکی سے تشبیہ دی جاتی ہے۔

"لاہور اخبار۔ 5 اور 6 مئی 1822ء : ____ مہاراجہ نے ایک پوربی موہن لال اور دیگر قابل اعتماد لوگوں کو ہدایت کی وہ اپنے حاصل شدہ کل اختیارات یہ سے پتہ چلائیں کہ آیا یہ دونوں شخص فرانسیسی ہی تھے یا پھر انگریز تھے۔ موہن لال ان کے بارے میں صرف اتنی معلومات لا سکا کہ وہ دونوں فرانسیسی افسران تھے۔ لیکن چونکہ مہاراجہ کے ذہن میں شکوک و شبہات تھے اور وہ ان کو انگریز ہی خیال کرتا تھا اس لئے اس نے ایک پوربی جیمز صاحب جونیئر (James Sahib Junior) کو حکم دیا کہ مسٹر مور کرافٹ کی جانب سے ایک خط ان فرانسیسیوں کے نام تیار کرے اور مہاراجہ کے نام مسٹر مور کرافٹ کے پرانے خطوط میں سے کسی خط پر موجودہ مہر پھاڑ کر اس پر لگا دے۔ اس نے ایسا ہی کیا اور مہر لگا دی اور ایک ہرکارے کے ذریعہ اسے دونوں یورپی حضرات کے نام بھیج دیا۔

اس خط کے اندر صرف یہ لکھا تھا کہ مسٹر مور کرافٹ کو یہ سن کر بہت خوشی ہوئی ہے کہ وہ دونوں خیریت سے لاہور پہنچ گئے ہیں اور یہ کہ وہ خود اب لداخ میں ہے۔ اور ان کے مستقبل کے بارے میں جاننا چاہتا ہے اور یہ بھی کہ وہ یہاں کیسے آئے ہیں؟ کشمیری ہرکارے کو ہر بات وضاحت سے سمجھا کر ان فرانسیسیوں کے پاس بھیج دیا گیا۔ خط کو دیکھ کر اور ہرکارے پر نظر ڈال کر انہوں نے کہا: "ہم بچے نہیں ہیں کہ تم لوگ ہمارے ساتھ کھلواڑ کرو۔ ہرکارے نے کہا کہ وہ ان کے لئے یہ خط لداخ سے لایا ہے۔ اور ان سے استدعا کی کہ وہ اس کو پڑھ کر ضرور خوش ہوں گے اور کچھ جواب بھی لکھ دیں تاکہ وہ واپس ہو سکے۔ انہوں نے جواب دیا کہ "مور کرافٹ تو ہمیں جانتا ہی

نہیں۔ ہم اس کے ملک کے بھی نہیں ہیں اور نہ ہی کبھی اس سے خط و کتابت ہوئی ہے اور نہ ہی کبھی ذاتی طور پر اس سے ملے ہیں۔" انہوں نے جس طرح سے خط وصول کیا تھا اسی طرح سے واپس کر دیا۔ ساتھ ہی پیغام بھجوا دیا کہ ایک آدمی لداخ سے ایک خط لایا تھا اور غالباً وہ مہاراجہ کے لئے ہی تھا کیونکہ وہ خود تو اجنبی تحریر پڑھ نہیں سکتے تھے۔"

اس خط سے مہاراجہ کی اصلی ذہنیت واضح ہو جاتی ہے کہ وہ شکی مزاج اور چالاک آدمی تھا۔ نیز جن باتوں کا اسے تجربہ نہیں تھا ان باتوں میں بہت احتیاط برتا کرتا تھا۔ اس سے استبدادی بادشاہ کی تصویر سامنے آتی ہے کہ جس کی انگلیوں کے اشارے پر اس کی رعایا کی جانیں اٹکی ہوتی ہیں۔ وہ ایک بدنام یورپی دیہاتی کے ساتھ قالین پر براجمان ان بناوٹی یورپیوں کو چکر دینے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس کا برسوں تک ایشیائی قوم کے لوگوں سے واسطہ رہا تھا۔

مہاراجہ کے خیمے میں کشمیری چادریں بڑی ترتیب سے لگی ہوئی تھیں اور فرش پر بیش قیمت قالین بچھے ہوئے تھے جن پر ایک یورپی "جیمز صاحب جونیئر" بیٹھا تھا۔ وہ ایک خط کو لفظ بہ لفظ ترجمہ کر کے مہاراجہ کو سنا رہا تھا۔ مہاراجہ ان کو سمجھ کر نفی میں یا اثبات میں سر ہلا رہا تھا۔ رنجیت سنگھ کے مکروہ چہرے کا اندازہ کر لیجئے۔ اسی نے مور کرافٹ کی پرانی مہر کو خط پر چسپاں کیا تھا۔ اب آپ فرانسیسی لوگوں کے تصویر سامنے لائیے کہ وہ خط وصول کر رہے ہیں اور اس دھوکہ دہی پر اپنی توہین محسوس کر رہے ہیں پھر وہ گرجدار آواز میں ہرکارے کو خط کا جواب دیتے ہیں۔ "کیا ہم بچے ہیں کہ تم اس طرح سے ہمارے ساتھ کھلواڑ کرو گے؟" پھر وہ مور کرافٹ کے بارے میں ہر قسم کی معلومات سے انکار کر دیتے ہیں خواہ وہ ان کے پاس ہو یا ان کے لئے لائی گئی ہو۔

اگلے خط سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ دہلی سے یہ اطلاع آنے پر کہ یہ لوگ واقعی فرانسیسی ہیں، شکوک کے بادل چھٹ گئے ہیں اور یوں یہ مہم جو آدمی مہاراجہ کے زیر سایہ آ جاتے ہیں۔

"لاہور اخبار۔ 17 مارچ و 18 مارچ 1822ء_ فرانسیسی افسران مسٹر الور اور ونچورا

کے ساتھ کئی ایک عام موضوعات پر بات چیت ہوئی۔ مہاراجہ نے ان کو بتایا کہ مسٹر روس (Mr.Ross) نے اس کے وکیل کے ساتھ بڑی مہربانی کا سلوک کیا ہے مہاراجہ نے فرانسیسی افسران سے کہا کہ وہ خوش ہو جائیں اور یہ کہ جلد ہی وہ ان کے لئے ملازمت کا بندوبست کر دے گا۔ ساتھ ہی حکم دیا گیا کہ دیوان میسور چند (Dewan Misur Chand) کے کیمپ سے پانچ سو گھڑ سواروں کو یورپی مشقوں کی تعلیم کی غرض سے مسٹر ایلرڈ اور ونچورا کے ساتھ روانہ کر دیا جائے۔"

"لاہور اخبار۔ 21 اور 23 مئی 1822ء ___ مہاراجہ نے فرانسیسی افسران کو مطلع کیا کہ شیخ بساؤں کی بٹالین جو سکھوں اور پوربیوں پر مشتمل ہے وہ معہ بندو قچیوں کے ان کی ماتحتی میں کر دی جائے گی اور شیخ بھی یورپی افسروں کا حکم مانے۔ مہاراجہ نے مسٹر ایلرڈ کو پیغام بھیجا کہ وہ جا کر گھڑ سواروں کا معائنہ کرے۔ مسٹر ونچورا کو شیخ بساؤں کی بٹالین کا معائنہ کرنے کے لئے روانہ کیا۔ بٹالین کے بندو قچیوں اور پوربیوں کی دو کمپنیوں کو حکم دیا گیا کہ وہ دو گھڑی (40 منٹ) تک فائرنگ کریں' مہاراجہ نے ان کی گھڑ سواری کا جائزہ لیا۔

جب دونوں فرانسیسی افسران آ گئے تو مہاراجہ نے ان سے پوچھا کہ ان مشقوں کے بارے میں کیا خیال ہے تو انہوں نے جواب دیا کہ مشقیں بہت اچھی تھیں۔ مہاراجہ نے ان سے کہا کہ وہ اپنے طریقے سے گولہ اندازوں (توپچیوں) کو تربیت دیں۔ شیخ بساؤں کو حکم دیا گیا کہ وہ فرانسیسی افسران کے خیمے میں رہے اور ان کے حکمیہ الفاظ سیکھے۔ مہاراجہ نے کہا کہ "میں چاہتا ہوں کہ اپنی بٹالینوں' پیادہ افواج اور رسالے کو تمہارے (ایلرڈ اور ونچورا کے) ساتھ پہلے پشاور پر حملے کے لئے بھیجوں اور اس کے بعد کابل اور قندھار پر قبضے کے لئے روانہ کروں۔ انہوں نے جواب دیا کہ مہاراجہ کے سرداروں میں سے بہت سے ایسے ہیں جو بہت باصلاحیت اور ہوشیار ہیں۔ اور ان لوگوں کو ہی اس خدمت پر مامور کرنا مناسب ہو گا۔ البتہ جو کچھ بھی ان کو حکم دیا جائے گا وہ اسے پورے تن و من سے بجا لانے کو تیار ہیں۔"

"مہاراجہ نے ان کو بتایا کہ تھوڑی سی دیر میں پانچ سو گھوڑے آ جائیں گے اور

کئی بٹالینیں اور توپیں ان کی نگرانی میں دے دی جائیں گیں۔ مہاراجہ کا ذہن ان لوگوں سے بالکل مطمئن تھا جس کی وجہ سے مقامی افسران فوج کو بہت تکلیف پہنچی اور اکثر یہ کہا جاتا ہے کہ وہ (مہاراجہ) یورپی اطوار کو دیکھنے کے بعد ہمارے طریقوں کی کب حمایت کرے گا۔ وہ مہاراجہ کو یہ بھکانے کی کوشش کرتے کہ ایلرڈ اور ونچورا برطانوی لوگ ہیں اور ان کو ہندوستان میں انگلش فوج کے ساتھ دیکھا گیا ہے۔

"شام کو شیخ بساؤوں اور اس کا منشی فرانسیسی افسران کا انتظار کرتے رہے۔ مؤخرالذکر حضرات نے منشی کو حکمیہ الفاظ کی وضاحت کی جو انہوں نے فارسی زبان میں تحریر کر لی۔ آج صبح بٹالینوں نے کالی وردیوں میں مشقیں کیں۔ مہاراجہ' جناب ایلرڈ اور جناب ونچورا بھی موجود تھے۔ مہاراجہ نے منشی کو ہدایت کی کہ وہ ان فرانسیسی حکمیہ الفاظ کو پڑھے جو اس نے ضبط تحریر کر لئے ہیں۔ وہ اس میں ناکام رہا کیونکہ وہ کسی ایک لفظ کی بھی وضاحت نہ کر سکا تھا' مہاراجہ بہت ناراض ہوا اور اس نے فرانسیسیوں سے استدعا کی کہ وہ دونوں ہندوستانی یا پنجابی زبان سیکھ لیں تاکہ "میں آپ کے ساتھ اکیلے میں بات چیت کر سکوں۔" انہوں نے جواب دیا کہ وہ ایسا ضرور کریں گے۔ وہ ہمیشہ دربار میں حاضر رہتے تھے۔"

"لاہور اخبار 26 و 28 مئی 1822ء ____ مہاراجہ نے فرانسیسی افسران کو بتایا کہ وہ ہولکر (Holkar) سے پندرہ ہزار سے بیس ہزار کے درمیان گھوڑے طلب کرے گا اور ان پر مشتمل ایک اور فوجی دستہ تیار کرے گا۔ انہوں نے جواب دیا: "مہاراجہ پر خدا کا سایہ قائم رہے اور جو کچھ وہ کہے وہ ضرور عمل میں لائے اور اس کی رفاقت خیر ہو۔" مہاراجہ نے کہا کہ وہ موسم برسات کے بعد کابل فتح کرنے کا ارادہ رکھتا ہے۔ انہوں نے کہا کہ کابل سے قندھار تک راستہ صاف ہے اور مہاراجہ کی فوج کے آگے کوئی سی بھی افغان فوج ٹھہر نہیں سکتی۔ دراصل یہ ملک بغیر لڑے ہی فتح ہو جائے گا۔ مہاراجہ نے ان سے کہا کہ وہ خوش باش رہیں۔ وہ ایک فوجی دستہ ان کی ماتحتی میں بھی کر دے گا۔ مہاراجہ نے ان کے خیمے میں 600 روپے بھیجے اور انہیں بتایا کہ اس نے ان کے استعمال کی غرض سے شراب کی 160 بوتلیں لدھیانہ منگوا لی ہیں۔"

"لاہور اخبار- 28 مئی 1822ء ___ مہاراجہ نے فرانسیسی افسران کو بلا کر کہا کہ "میرے سپاہی کہتے ہیں کہ فرانسیسی مشقیں تو بالکل وہی ہیں جو وہ سیکھ چکے ہیں اور اگر انہیں مزید تمہاری نگرانی میں رکھا گیا تو وہ سب کچھ بھول جائیں گے جو کچھ انہوں نے سیکھا ہے-" انہوں نے جواب دیا کہ "ہم نے پہلے بھی کہا تھا اور اب پھر دہراتے ہیں کہ ہمیں نئے سپاہی دیئے جائیں-" مہاراجہ نے کہا کہ "ایسا ہی ہو گا-" اس کے ساتھ ساتھ اس نے مقامی فوجیوں اور ان کی مشقوں کی تعریف کی- افسران نے کہا کہ مہاراجہ نے کبھی بھی صحیح طرح سے فرانسیسی یا انگریزی مشقوں کو ہوتے نہیں دیکھا ہے اور اسی لئے وہ اپنے ہی فوجیوں کی مشقوں سے خوش ہوتا ہے: "یہ بے چارے مقامی فوجی تو بچوں کی طرح کھیلتے ہیں-" مہاراجہ نے جواب دیا کہ "وہ افغانوں میں دہشت پھیلانے کے لئے بہت کچھ کر سکتے ہیں-"

اگلے خط میں ان دو دیگر یورپیوں کا تذکرہ ہے جو مہاراجہ نے اپنی ملازمت میں رکھ لئے اور ان دونوں کے بارے میں ہم پہلے ہی بات کر چکے ہیں-

"لاہور اخبار- 16 و 17 جولائی 1822ء ___ فرانسیسی افسران کو 700 روپے بھیج دیئے گئے اور ہندوستانی گھوڑوں کی دو فوجی ٹکڑیاں ان کی ماتحتی میں کر دی گئیں- ان پر مہاراجہ کی بڑی مہربانی ہے- مہاراجہ نے انہیں بتایا کہ ایک اور بریگیڈ ان کی ماتحتی میں دے دیا جائے گا..... مہاراجہ نے موہن لال سے کہا کہ دونوں فرانسیسی افسران اور ان کی رجمنٹوں کو بلایا جائے- مسٹر ایلرڈ اور مسٹر ونچورا دونوں ہی اپنی الگ الگ چار چار کمپنیوں کے ساتھ آ گئے- ہر کمپنی میں 100 سپاہی تھے اور یہ کمپنیاں سکھوں پر مشتمل تھیں- ہر کمپنی نے سات بار کارتوس چلائے اور اپنی مشقیں دکھائیں- مہاراجہ نے مقامی فوجیوں کے ساتھ مل کر پوری پریڈ کو دوبارہ سے دیکھا اور بہت خوش ہوا- اس نے اعلان کیا کہ جو کچھ فرانسیسی مشقوں کے بارے میں سنا گیا تھا وہ سب بالکل درست تھا-

"مہاراجہ بے حد خوش تھا- اس نے ان سے کہا کہ وہ اس کے گھر کو اپنا ہی گھر سمجھیں اور انہیں بتایا کہ ان گھر سوار دو رجمنٹوں سے الگ' ایک اور کمپو (بریگیڈ)

برطانوی حکومت سے ملنے والی قلیل پنشن پر گزارہ کرنا پڑا۔ اس کے ظاہری خدوخال کے بارے میں مسز میکنزی یوں رقم طراز ہے:

"میڈم ونچورا بہت خوبصورت آرمینیانی خاتون ہے اور ہسپانوی خواتین سے رنگت میں ذرا ہی کم ہے۔ وہ کیتھولک ہے مگر غالباً اس نے بعد میں یہ مذہب قبول کیا تھا کیونکہ وہ کیتھولک مذہبی رسومات سے کافی الگ تھلگ دکھائی دیتی ہے۔" ونچورا کی بیٹی 1837ء میں اپنے باپ کے ساتھ فرانس چلی گئی تاکہ وہاں تعلیم حاصل کر سکے اور پھر کبھی ہندوستان واپس نہیں آئی۔ اس نے ایک فرانسیسی امیر سے شادی کر لی۔ اس کی اولاد تاحال موجود ہے۔ چند برس قبل ہی انہوں نے حکومت پنجاب سے ونچورا کے اس بیش بہا خزانے کی بابت استفسار کیا تھا جو وہ پنجاب سے جاتے ہوئے وہیں چھوڑ گیا تھا۔

نئی فرانسیسی تربیت یافتہ فوج سب سے پہلے 1823ء میں جنگ نوشہر میں سامنے آئی جس میں اس نے عقب سے حملے کا حکم دیا تھا۔ اس سے مہاراجہ کو بہت فائدہ ہوا کیونکہ مہاراجہ کا آگے سے کیا ہوا حملہ پسپا ہو چکا تھا۔ جنگ کے بعد ونچورا کا بریگیڈ اس فوج میں بھی شامل ہو گیا کہ جس نے پشاور کو فتح کر لیا اور تب تک ان کے قبضے میں رہا جب تک کہ افغانوں نے جرمانہ یا تاوان ادا نہ کر دیا۔ پشاور سے یہ فوجی دستہ وادی کانگڑہ اور دیگر مقامات پر گیا اور وہاں سے خراج وصول کیا اور اس پر سود بھی لیا گیا۔ بعدازاں ڈیرہ جات سے ہوتا ہوا یہ دستہ کچھ عرصہ کے لئے لاہور واپس آ گیا۔

اگلی مہم کوٹلہ کی فتح کی تھی جو وادی کانگڑہ کے شروع پر واقعہ بہت بڑا پہاڑی قلعہ ہے۔ گو کہ اس سے قبل تمام حملوں میں یہاں پر بڑی مزاحمت ہوئی تھی مگر اس بار ایک چھوٹی سی مہم کے بعد یہ فتح ہو گیا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ ونچورا نے اس دریا کو کاٹ دینے کی تجویز دی تھی جو پہاڑی کے نیچے بہتا تھا۔ اور اس سے قلعہ کو پانی ملا کرتا تھا۔ اس کامیابی سے اس کے اثر و رسوخ میں بڑا اضافہ ہوا جس سے سردار متنفر ہو گئے۔ چنانچہ لاہور واپسی پر انہوں نے بغاوت کر دی اور فوجی دستوں سے کہا کہ وہ ان کی (سرداروں کی) اتباع کریں۔ البتہ یہ بغاوت مختصر سی تھی کیونکہ رنجیت سنگھ نے قلعہ سے اپنے ذاتی فوجی دستوں کو بھی واپس بلا لیا۔ اور انارکلی میں باغی فوجیوں کا

محاصرہ کر لیا۔ اس نے بڑے بڑے باغی لوگوں کو برطرف کر دیا اور باقی لوگوں پر بھاری جرمانہ عائد کر دیا۔ غالباً کسی بھی موقع کے ہاتھ آنے پر جرمانہ وصول کرنا خزانے میں اضافہ کرنے کا بہترین طریقہ ہوتا تھا۔

اگلی مہم جمعدار خوشحال سنگھ کے ساتھ تھی تاکہ ضلع گنڈ گڑھ میں ایک بغاوت کو فرو کیا جائے اور پھر سری کوٹ کے قلعہ پر قبضہ کر لیا جائے جہاں پر پٹھانوں نے بڑی زبردست بغاوت کی ہوئی تھی۔ یہ امور سرانجام دینے کے بعد وہ لوگ پشاور گئے اور یار محمد خان سے بھاری جرمانہ وصول کیا کیونکہ رنجیت سنگھ کا خیال تھا کہ اسی نے اس بغاوت کو ہوا دی تھی۔ ایک برس کے بعد ونچورا پھر پشاور گیا۔ اس دفعہ اس کو اس غرض سے بھیجا گیا تھا کہ وہ افغان گورنر سے اس کا مشہور گھوڑا "لیلی" (Laili) حاصل کر لے۔ رنجیت سنگھ چونکہ عمدہ گھوڑوں کا دلدادہ تھا لہٰذا وہ ہر حال میں یہ گھوڑا حاصل کرنا چاہتا تھا۔

اس دفعہ یہ کوشش ناکام رہی اور ونچورا سے یہ کہہ کر معذرت کر لی گئی کہ گھوڑا فوت ہو گیا ہے۔ البتہ بعد میں وہ اس گھوڑے کے حصول میں کامیاب ہو گیا۔ اس جانور کی جانب ہی رنجیت سنگھ نے کیپٹن آسبورن (Captain Osborne) کو اشارہ کیا تھا یعنی جس کے ساتھ اس نے اسے دیکھا تھا کہ اس کے حصول کی خاطر بارہ ہزار آدمیوں کی قربانی دینی ہو گی اور چھ لاکھ روپیہ ادا کرنا ہو گا۔ ہم ان باتوں پر اعتبار کر بھی سکتے ہیں اور نہیں بھی کر سکتے کیونکہ یہ سب بڑی عجیب و غریب باتیں ہیں۔

جب رنجیت سنگھ پر فالج گرا تو اسے یورپی ڈاکٹر سے علاج کرانے کی خواہش پیدا ہوئی اور اس کی درخواست پر لاہور سے ڈاکٹر مرے کو روانہ کر دیا گیا۔ اس ڈاکٹر نے جو رپورٹیں ارسال کی ہیں ان میں سے ہم ان یورپی مہم جوؤں کے بارے میں بڑی خاص اور دلچسپ باتیں بیان کر سکتے ہیں جو اس وقت مہاراجہ کی ملازمت میں تھے۔ ونچورا کے بارے میں وہ تحریر کرتا ہے کہ:

"7 جنوری 1827ء ____ ونچورا کی ماتحتی میں موجود بٹالینوں میں سے ایک بٹالین اپنے کیمپ سے آئی ہے۔ راجہ نے مجھے دوپہر کو بلا بھیجا۔ بٹالین کو تین درجوں میں

ان کی ماتحتی میں دے دیا جائے گا۔ نورالدین کو حکم دیا گیا کہ ہر ایک سو ملازمین پر پانچ سو افراد مقرر کئے جائیں تاکہ نئی چھاؤنیاں اور رہائشی کوارٹر بنائے جا سکیں' مہاراجہ نے مسٹر گارون (گارڈن) جو رضا کار کمپنی کو مشقیں سکھاتا تھا' اسے ایک گھوڑا دیا اور مسٹر جیمن جو توپوں کے بارے میں طریقہ کار سکھایا کرتا تھا' اس کو سونے سے بنے ہوئے بازو بند کا جوڑا دیا۔ یہ چیزیں انہیں ان کی خدمات کے عوض دی گئیں۔

پریڈ کے بعد مہاراجہ اور فرانسیسی افسران کے درمیان لمبے مذاکرات ہوئے۔ جب وہ چلے گئے تو بادشاہ نے 600 روپے ان سکھوں میں تقسیم کرنے کے لئے ارسال کئے جن کو وہ دونوں مشقیں کرایا کرتے تھے۔ اب ان کو مزید اچھے طریقے سے مشقیں کرنی تھیں۔ اس نے حکم دیا کہ فوراً" پانچ بٹالین تیار ہو جائیں اور مشقیں کریں۔ رنجیت کے دربار کے حکام نے ان پر بڑی توجہ دی اور تحائف عطاء کئے۔" (بظاہر انہوں نے ہوا کے رخ کا اندازہ کر لیا تھا)۔

دونوں دوستوں کے تغیرات و نشیب و فراز اور قسمت کے کھیل کو کھیلتے ہوئے اب ہم آگے صرف ونچورا کے کردار کا جائزہ لیں گے۔ شک کے بادل امنڈ آنے کے باوجود بھی مہاراجہ کی حمایت 1824ء تک جاری رہی۔ فرانسیسی دستہ یا فوج خاص (شاہی بریگیڈ) کو بڑھا کر انفنٹری کی چار بٹالین پر تیار کر دیا گیا جو ونچورا کے ماتحت میں رکھی گئی۔ اس میں رسالے کی دو رجمنٹیں بھی داخل کر دی گئیں جو ایلرڈ کے ماتحت تھیں اور توپ خانے کی ایک ٹکڑی ایک مسلمان کمانڈر کی ماتحتی میں تھی جس میں مختلف طرح کی 24 توپیں تھیں۔

ونچورا کو چونکہ ہمیشہ شاہی حمایت اور اعتماد حاصل رہا تھا اس لئے یوں لگتا تھا کہ ایلرڈ کے ساتھ اس کی دوستی بلکہ رفاقت زیادہ عرصہ تک نہیں رہے گی کیونکہ جب وہ زیادہ مستحق اور حمایت یافتہ ہو گیا تو اس کے نزدیک دوسرے لوگ کم تر درجے کے حامل ہو گئے۔

ماہانہ پانچ سو روپے سے شروع ہونے والی اس کی تنخواہ 1826ء میں بڑھ کر 3000 ہو گئی اور وقتاً" فوقتاً" اس میں جاگیروں سے مزید آٹھ سو روپے ماہانہ شامل ہو جاتے اور

یوں اس کی تنخواہ کافی اچھی ہو گئی تھی۔ مگر یہ بات ابھی حل طلب ہے کہ آیا اسے کبھی پوری تنخواہ بھی ملی یا نہیں کیونکہ رنجیت کے تمام ملازمین خواہ وہ کسی بھی عہدے پر ہوں' ان کے بقایا جات رہ جایا کرتے تھے۔ جیک مونٹ (Jacquemont) کہتا ہے کہ 1836ء میں ونچورا کے کم از کم 150,000 روپے یا دو سال سے بھی زیادہ کی تنخواہ دربار کی جانب باقی رہتی تھی۔

1825ء میں ونچورا نے لدھیانہ میں ایک آرمنی خاتون سے شادی کر لی جو امتزاجی نسل کی حامل تھی۔ اس کا باپ فرانسیسی تھا جو بیگم سمرو (Begum Sumru) کی ملازمت میں تھا۔ اس کی بہن جو بعد میں والٹر ڈوبیگنون (Walter Dubuignon) کی بیوی بنی' وہ بیگم کے ذاتی رسالے کی رسالہ دار تھی۔ کہا جاتا ہے کہ لکھنؤ سے ایک کیتھولک پادری نے آ کر اس کی شادی کرائی تھی مگر بدقسمتی سے ایسا ناممکن نظر آتا ہے کیونکہ کیتھولک ارباب اختیار کے رجسٹر میں ان کی شادی کا اندراج نہیں ہے۔ غالباً یہ رسومات پوری کرانے والا کوئی مبلغ پادری ہو گا اس لئے اس نے کسی سرٹیفکیٹ کی نقل ارسال کرنے کی تکلیف برداشت نہیں کی۔

محمد لطیف کے مطابق مہاراجہ اور سرداروں نے اس شادی پر جو تحائف دیئے وہ چالیس ہزار روپے کی مالیت کے تھے اور غالباً یہ بات ہے بھی درست۔ کیونکہ ابتدائی دشمنی ختم ہونے کے بعد سے ونچورا درباریوں میں ہمیشہ ہردل عزیز رہا ہے۔ گو کہ میڈم ونچورا اپنے شوہر کے ساتھ دس برس رہی اور اس سے اس کی ایک بیٹی بھی ہوئی۔ مگر اس کی ازدواجی زندگی خوشگوار نظر نہیں آتی۔ کیونکہ شادی کے بعد بھی ونچورا نے اپنی بیوی کو لاہور میں رکھا اور یوں اس کی (ونچورا کی) بے وفائیوں کے بارے میں بہت سی باتیں معلوم ہوئیں' ان باتوں کو بنیادی وجہ بناتے ہوئے اس کی بیوی نے اسے چھوڑ دیا۔

علیحدگی کے بعد سے میڈم ونچورا مستقل طور پر لدھیانہ رہنے لگی یہاں پر وہ 1870ء میں انتہائی کسمپرسی کی حالت میں فوت ہو گئی۔ ونچورا اس کے لئے جو مستقل آمدنی چھوڑ گیا تھا وہ ونچورا کی وفات کے ساتھ ہی ختم کر دی گئی تھی جس کے بعد اسے

بانٹ رکھا تھا اور اس میں تقریباً 700 افراد تھے۔ سب فوجی اوسط قد کے حامل پنجابی تھے اور حربی جسامت کے حامل نظر آتے تھے۔ انہوں نے چست لال کوٹ' سفید پاجامے' پیلی پگڑیاں اور کالے چمڑے کے جوتے پہنے ہوئے تھے۔ بٹالین نے پریڈ کا مظاہرہ کیا۔ دوپہر پانچ بجے بٹالین کو فائرنگ کرنے کے لئے پھر سے بلایا گیا جو بڑے اعلیٰ انداز میں سر انجام دی گئی۔ دراصل میں نے ایسی کارکردگی اپنے سپاہیوں کے کسی دستے میں نہیں دیکھی تھی۔

گزشتہ روز دوپہر کو مسٹر ونچورا کی ایک اور بٹالین کو بلا لیا گیا۔ یہ لوگ زیادہ تر گورکھے تھے اور اسی لئے انہیں گورکھا پلٹن کہا جاتا ہے۔ انہوں نے گہرے سبز کوٹ پہنے ہوئے تھے۔ ان کے چہرے سرخ تھے اور وہ یورپی انداز میں حرکت کر رہے تھے۔ دیگر معاملات میں یہ بٹالین اسی بٹالین کی طرح تھی جو میں نے اس سے ایک روز قبل دیکھی تھی۔ ان کی کارکردگی بھی ویسی ہی تھی۔"

یہ بات قابل ذکر ہے کہ برطانوی ملازمت میں گورکھے اب جو وردی پہنتے ہیں وہ سب سے پہلے ونچورا نے رائج کی تھی تاکہ وہ اپنے گورکھوں کو دوسروں سے ممتاز کر سکے۔

"16 جنوری 1827ء ____ مسٹر ونچورا بہت اچھا آدمی دکھائی دیتا ہے۔ اس کی عمر تقریباً 33 سال ہے اور وہ لباس اور جسم کے حوالے سے بہت صاف ستھرا شخص ہے۔ اس کی داڑھی کافی لمبی ہے۔ فرانسیسی میں اچھی خاصی باتیں کر لیتا ہے۔ اس نے بتایا کہ اسی کے زور دینے پر بادشاہ نے میری اس سے ملاقات کے لئے رضامندی ظاہر کی ہے کیونکہ یہ شک اپنی جگہ قائم تھا کہ میں اس پر اور اس کے دوست (ایلرڈ) پر اپنا غیر ضروری اثر و رسوخ ڈالنے کی کوشش کروں گا..... جب میں نے بیوہرنائی (Beauharnais) کی وفات کا ذکر کیا تو اسے بڑا دھچکا لگا۔ اس نے مجھے بتایا کہ وہ روسی جنگ میں اس کی ماتحتی میں کام کر چکا تھا۔ 15 منٹ کے بعد مہاراجہ نے اسے واپس بھیج دیا اور بڑی بے تابی سے مجھ سے پوچھا کہ کیا میرے خیال میں وہ واقعی فرانسیسی ہے اور شریف آدمی ہے۔ میں نے اسے بتایا کہ اس میں بہت ہی کم شبہ ہے کہ وہ انتہائی

شریف آدمی ہے اور جہاں تک میرا خیال ہے وہ فرانسیسی ہی ہے۔ اس پر وہ بہت خوش ہوا اور کہا کہ بعض لوگ یہ بتاتے ہیں کہ وہ اور اس کا دوست اصلی صاحبان نہیں بلکہ گورے اور حقیقی فرانسیسی نہیں ہیں۔

1828ء میں ونچورا اور سینور اومس (Senor Oms) کے بریگیڈ کو شیر سنگھ کی ماتحتی میں کانگڑہ روانہ کیا گیا تاکہ وہ سنسار چند (Sansar Chand) کی وفات کی وجہ سے ان خالی علاقوں کو پنجابی ریاست میں شامل کر لیں چونکہ یہاں پر سنسار چند کے بیٹے کا قبضہ تھا لہٰذا پتراہ' ریاہ اور پلھاڑ کے قلعوں پر قبضے کے لئے کافی جنگ ہوئی۔ پھر ان پر قابض ہونے کے بعد یہ بریگیڈیں لاہور چلی آئیں۔ اس کے بعد وہ ایک مشہور جنونی سید احمد غازی کے خلاف جنگ میں شیر سنگھ کے ساتھ شامل ہو گیا۔ وہ شخص کمپنی بہادر کے توپخانے میں ایک سپاہی کی حیثیت سے اٹھ کر اب سرحد پر بہت بڑی طاقت بن چکا تھا۔ اس کا ایک بڑے علاقے پر قبضہ ہو گیا تھا اور اب وہ پشاور اور نواحی اضلاع کے لئے خطرہ بن گیا تھا۔ دراصل پشاور پر تو اس کا قبضہ تھا ہی مگر رنجیت سنگھ کی افواج کی آمد پر وہ وہاں سے چلا گیا اور 1832ء تک وہ درد سر ہی بنا رہا یہاں تک کہ مئی 1832ء میں بالاکوٹ کی جنگ میں شیر سنگھ اور ونچورا نے اسے اور اس کی پوری فوج کو بالکل تباہ و برباد کر دیا۔

اسی سال فرانسیسی سیاح جیک مونٹ (Jacquemont) نے لاہور کا دورہ کیا اور چند ماہ تک ونچورا کے ساتھ ٹھہرا رہا۔ اس نے ہمارے لئے ونچورا اور رنجیت سنگھ کی ملازمت میں موجود دیگر مہم جو لوگوں کے بارے میں اہم تحریریں چھوڑیں ہیں جن کا ہم الگ موقع پر تذکرہ کریں گے۔ اس وقت ونچورا کو ڈیرہ جات روانہ کیا گیا تاکہ وہ نواب بہاولپور کے ذمہ واجب الادا ڈھائی لاکھ روپے کی رقم وصول کر سکے۔ اس نے یہ ضلع رنجیت سنگھ سے حاصل کیا تھا۔ ونچورا نے فوجی حصہ داری میں چھ لاکھ کا حساب کتاب نکالا۔ اس وجہ سے مہاراجہ اس سے اتنا خوش ہوا کہ اسے ڈیرہ جات کا گورنر بنا دیا۔ اس عہدے کے ساتھ شرط یہ بھی تھی کہ وہ ہر موسم میں ساڑھے گیارہ لاکھ کا مالیہ ادا کرے گا اور تین سو فوجی فراہم کرے گا۔ اس ضلع سے گھوڑے بھی بہت آتے تھے۔

گو کہ رقم بعض اوقات اس سے بھی بہت زیادہ ہوتی تھی جتنی کہ بہاول خان سے طلب کی جاتی تھی مگر ونچورا باشندگان پر کوئی سختی کئے بغیر ہی اس رقم کی ادائیگی کا انتظام کر لیا کرتا تھا۔ اس نے ملتان شہر کو بھی بہت ترقی دی جیسا کہ الکزینڈر برنس (Alexander Burnes) نے اس کی توثیق کی ہے۔ وہ 1836ء میں تحریر کرتا ہے کہ :

"ملتان شہر کی ظاہری حالت بہت اچھی ہے جس کا خراج تحسین ایم۔ ونچورا کو جاتا ہے جو ابھی تک اس پر حاکم مقرر ہے۔ بہاول خان کے ماتحت افسران تو کافی بربادی کے ذمہ دار ہیں۔ مگر 1832ء سے یعنی کہ جب سے سکھوں نے اس پر قبضہ کیا ہے اس جگہ کی بحالی کے لئے کافی کام ہوا ہے۔"

محمد لطیف اس پر یوں اضافہ کرتا ہے کہ : "رنجیت نے جنرل ونچورا پر پوری نظر رکھی ہوئی ہے۔ اس کا خیال ہے کہ وہ (ونچورا) ڈیرہ جات کی اپنی چراگاہ سے کافی اچھی رقم حاصل کر سکتا ہے۔ البتہ ان اضلاع میں اس کی نمایاں خدمات اور نفیس انتظام کے عوض میں مہاراجہ ایک ایسے افسر کے خلاف اپنی حرص کو پورا کرنے سے باز رہا جس کی لوگ بھی اتنی ہی عزت کرتے ہیں جتنی کہ افسران اور حکومت کرتی ہے۔"

اس اعزاز و تعظیم اور ایویٹا بائیل (Avitabile) کی جانب سے پیدا کئے گئے خوف و ہراس میں بہت بڑا تضاد ہے۔ اس کی بڑی وجہ غالباً ایک کا ڈیرہ جات کا باشندہ ہونا ہے اور دوسرے کا پشاوری یا خیبری ہونا ہے۔ یہ بات بڑی مشتبہ ہے کہ آیا ونچورا نے کبھی ضلع پشاور کا بھی اس طرح سے انتظام کیا تھا جس طرح سے کہ اس نے ڈیرہ جات کا کیا تھا۔

غالباً اسی کامیابی نے رنجیت سنگھ کو اس بات پر آمادہ کیا کہ وہ ونچورا کو کشمیر کی حکومت کی پیش کش کرے اور وہاں سے مان سنگھ کو ہٹا دے جو اس کے خیال میں حکومت کو ادا کئے جانے والے مالیے میں غبن کرتا تھا۔ ریکارڈ میں اس طرح کی بہت سی باتیں ہیں لیکن وہ سب مشکوک ہیں۔ ہم 1835ء کے کلکتہ جنرل میں سے ایک ایسے اقتباس کا حوالہ دیتے ہیں جو ایک ایسے اطلاع نامے سے نقل کیا گیا ہے جو ہمارے ہاتھ آ چکا ہے۔ وہ یوں ہے :

"مسٹر ونچورا نے تجویز دی کہ اگر مان سنگھ کو یاد دہانی کرانی ہے تو کشمیر کے لئے پندرہ لاکھ روپے کا لگان عائد کرنا چاہئے- دربار میں اس بات کی نشاندہی کی گئی کہ مان سنگھ نے چونکہ کشمیر کو بہت ترقی دی ہے اس لئے اس طرح کی کاروائی سراسر ناانصافی ہو گی- اس بات سے حکومت کے دیوانی معاملات میں ونچورا کی مداخلت ختم ہو گئی البتہ ہم دیکھتے ہیں کہ بیرن ہیوگل نے اس بات پر زور دیا ہے کہ ونچورا 1835ء سے 1837ء تک لاہور میں قاضی یا چیف جج رہا تھا- اس بیان کی حمایت میں پنجاب ریکارڈز میں قطعاً" کوئی چیز نہیں ملتی اور ہمارے خیال میں بھی یہ بات غلط ہے کیونکہ کسی یورپی کو اتنے اہم عہدے پر مقرر کرنا ہو تو برطانوی حکومت اپنے وقائع نویس کے ذریعہ اس کا اندراج ضرور کرتی-

اور نہ ہی ہمیں ہیوگل کے اس اصرار کا کوئی ثبوت ملتا ہے کہ ونچورا خالصہ فوج کا سپہ سالار اعلیٰ تھا کیونکہ اس فوج میں خود حکمران کے علاوہ کوئی اور کبھی اس عہدے پر نہیں رہا' یہ غلط فہمی غالباً اس حقیقت کی وجہ سے پیدا ہوئی ہے کہ جب 1836ء میں پہلی بار رنجیت سنگھ نے کچھ جرنیلوں کا عہدہ شروع کیا تو اس نے ان میں بعض کو ونچورا کی ماتحتی میں دینے پر زور دیا- ونچورا نے مہاراجہ کو سونے اور جواہرات کے بنے ہوئے تحائف دیئے اور اس کو یقین دلایا کہ وہ سب اعلیٰ عہدیداروں کی تعظیم کرتا رہے گا- ایلرڈ اور ونچورا کی آمد کے کچھ ہی عرصہ بعد وہ دونوں انارکلی کے پرانے مقبرے میں رہائش پذیر ہوئے- جس سے قبل رنجیت سنگھ کو یہاں سے ایک سکھ سردار کو بے دخل کرنا پڑا- مگر یہ انتظام سراسر عارضی تھا کیونکہ دونوں نے ہی شادی کر لی اور ونچورا نے ایک زنان خانہ الگ سے بنایا' مگر ایک ہی عمارت میں دو چیزیں ناممکن تھیں لہٰذا ونچورا کی درخواست پر رنجیت سنگھ نے نقدی اور جنس کی شکل میں نئی رہائش گاہوں کی تعمیر میں شراکت کی- ان میں سے ونچورا نے جو تعمیر کی تھی وہ ابھی تک حکومت پنجاب کے عظیم دفاتر کے عین وسط میں باقی ہے- ونچورا نے پرانے مقبرے کو زنان خانے کے طور پر استعمال کیا اور یہ بھی کہا جاتا ہے کہ اس کی فرانس روانگی کے بعد دو برس تک بھی اس کے گھر والوں نے یہ عمارت خالی نہ کی- یہ سوچ

کر بھی رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں کہ یہ قدیم مقبرہ جو اکبر کی بیوی کے ظالمانہ قتل کے بعد اس کی یادوں کو تازہ رکھنے اور اس کی ہڈیوں کو محفوظ کرنے کی غرض سے بنایا گیا تھ۔ اس کو بڑی آسانی سے پہلے توپ خانہ بنا لیا جائے گا اس کے بعد یہ ایک سکھ سردار کی رہائش گاہ بن جائے گا' پھر دو یورپیوں کا گھر' اس کے بعد ایک زنان خانہ' پھر ایک مسیحی چرچ اور اب یہ سکھ حکومت اور جانشین حکومت کے آثار قدیمہ کا ٹھکانہ بن گیا ہے۔

ونچورا کے دور میں اس کی ساخت کے بارے میں ہمارے پاس کئی بیانات ہیں' بیرن ہیوگل (1839ء میں) تحریر کرتا ہے کہ:

"جنرل ونچورا کا گھر جو اس نے خود تعمیر کرایا ہے' گو کہ وہ بہت بڑے رقبے پر نہیں ہے مگر مشرقی طرز تعمیر کی یورپی رہائش گاہ کا حسین امتزاج ہے۔ داخلے کی دیواروں پر پہلی منزل کے ستونوں سے قبل ایک تصویر لگی تھی' جس میں رنجیت سنگھ کو دو فرانسیسی افسران کا استقبال کرتے دکھایا گیا تھا۔ ان کے علاوہ ہزاروں افراد بھی موجود تھے۔ دوسرے کمرے میں فریموں میں آئینے جڑے ہوئے تھے جو اچھا تاثر پیدا کرتے تھے۔ تیسرا کمرہ بہت بڑا ہال ہے جو تمام کمروں جتنا چوڑا ہے اور خواب گاہ پر جا کر ختم ہوتا ہے۔

"مقبرے کے عقب میں کچھ فاصلے پر قدیم قبر موجود ہے جس پر ایک بہت اونچا گنبد بنا ہوا ہے (جو انارکلی گنبد ہے)۔ یہ جگہ یورپی افسران نے کرائے پر لی ہوئی ہے۔ اور یہ باغ کے عین وسط میں ہے۔ اور اردگرد کے ماحول کے بالکل برعکس ہے۔"

بار (Barr) جس نے اس گھر کا دس برس بعد دورہ کیا۔ وہ مصوری دیکھ کر بہت زیادہ حیران ہوا: "طعام گاہ کے ساتھ ایک اور کمرہ ہے۔ جو اوپر سے نیچے تک آئینوں سے مزین ہے۔ اس کا دیکھنے والوں پر بڑا اچھا اثر پڑتا ہے۔ بعد ازاں ہمیں تصویروں والا کمرہ دکھایا گیا۔ اس میں وہ تصویر بھی سجی ہوئی ہے جن میں ایلرڈ اور ونچورا کو جنگیں لڑتے دکھایا گیا ہے۔ ان پر مقامی فن کاروں نے چونا پھیرا ہوا ہے۔ ان واقعات کی منظر کشی بہت بہترین ہے۔ ملتان کی فتح میں توپچیوں کی توپیں خالی ہونے کے بعد پھر

سے بھرتے ہوئے دکھایا گیا ہے۔"

1837ء میں ونچورا دو سال کی چھٹی پر یورپ چلا گیا اور تب تک وہیں رہا جب تک کہ اسے رنجیت سنگھ کی خراب حالت کی خبر نہ ملی۔ یہ خبر ملتے ہی اس نے پنجاب لوٹنے میں بہت جلدی کی۔ وہ لدھیانہ پہنچا تاکہ فوراً" پشاور کی جانب پیش قدمی کرنے کے احکامات حاصل کر سکے۔ اور اس مقام (لدھیانہ) پر فوج کی کمان حاصل کر لے۔ اسے اس فوج کی سربراہی کا بھی انتظار تھا جو برطانیہ' رنجیت سنگھ اور شاہ شجاع کے درمیان اتحاد سہ گانہ کے نتیجے میں قائم ہوئی تھی کہ شاہ شجاع جو برسوں سے تخت سے محروم ہے۔ اسے تخت پر بٹھانے میں مدد دی جائے گی۔

اس کام کو خالصہ فوجی بہت سخت ناپسند کرتے تھے کیونکہ وہ پہلے تو عرصے تک برطانیہ کے خلاف لڑتے رہے تھے مگر اب انہیں ان کے ساتھ لڑنا پڑ رہا تھا۔ اور اس وجہ سے بھی کہ کیپٹن ویڈ (Captain Wade) نے سکھ فوجیوں کی خراب حالت کا اندازہ ہونے کے باوجود ونچورا کو ان پر مختار کل بنانے کا کہا۔ اس کے علاوہ سکھ فوج کے کسی بھی یورپی افسر کی نسبت اس پر زیادہ انحصار کرنے کا بھی کہا۔

دربار کی افواج کی صحیح حالت کے بارے میں پنجاب ریکارڈز اور ہم عصری کتب میں بہت کچھ تحریر ہے اور ان سے ہمیں کچھ زیادہ نہیں بلکہ صرف ایک حوالہ ملا ہے کہ جس میں جنرل ونچورا کا بھی تذکرہ ہے:

"اپریل 1839ء جنرل ونچورا بڑی تیزی سے لاہور سے آیا جب تک کہ وہ وہاں رہا تھا تب تک مختلف جماعتوں میں اس کی موجودگی نے اس کی اہمیت کو اور زیادہ کر دیا تھا۔ وہ کابل جانے کے لئے ہماری معاونت میں فوجیں اکٹھی کرنے میں بہت سرگرم ہے اور خود بھی اس میں شامل ہونا چاہتا ہے مگر اسے اس کی اجازت نہ دی جائے گی۔ جب جنرل ونچورا کی فوج کے گورکھا سپاہی بغاوت میں شامل ہوئے تو ہمیں زیادہ عرصہ تک کولسر (Koulsar) میں حالات کا صحیح علم نہ ہو سکا۔ اس نے اپنے ایک ماتحت افسر کو گرفتار کر لیا تھا۔ مگر چونکہ سب لوگ اسے پسند کرتے تھے (یعنی ماتحت افسر کو) اس لئے انہوں نے اسے زبردستی چھڑانے کا فیصلہ کیا۔

بہت بڑا مجمع حوالات کی جانب گیا اور اس کی رہائی کا مطالبہ کیا۔ ونچورا نے انکار کر دیا۔ اس نے اپنے محافظوں اور گورکھاؤں کو حکم دیا کہ بندوقیں بھر لیں مگر گورکھوں نے اس حکم کو ماننے سے انکار کر دیا اور کیمپ میں واپس جا کر اپنے خیموں کو توڑ دیا اور رنگ اڑاتے ہوئے اور باجا بجاتے ہوئے ٹینٹ سے بھاگ گئے اور اپنے ساتھ دو بٹالینوں کی توپیں بھی لے گئے۔ وہ پشاور چلے گئے جہاں پر وہ کھلم کھلا بغاوت کرتے رہے جبکہ ان کے اس عمل کے بارے میں اطلاع لاہور بھی بھیج دی گئی (جس کی وجہ سے انہیں ذرا سی ہی پریشانی لاحق ہوئی)

بار' ونچورا کے بارے میں ذاتی معلومات بھی فراہم کرتا ہے۔ اس کے خیال میں وہ بہت شریف آدمی نظر آتا تھا اور بڑے اعلیٰ کردار کا حامل تھا۔ اس کے مزاج میں مزاح بھی شامل تھا۔

تاہم رنجیت سنگھ کی وفات کی وجہ سے پشاور میں اس کا قیام مختصر ہو گیا اور اسے انہیں وجوہات کی بنا پر لاہور واپس آنا پڑا کہ جن وجوہات کی وجہ سے وہ پشاور گیا تھا یعنی فوجیوں پر اس کا "اثر و رسوخ" وہ کافی عرصہ لاہور میں ہی رہا یعنی اس کے جانشین کھڑک سنگھ کے مختصر عہد میں مگر نونہال سنگھ کی وفات کے فوراً بعد یہ خیال کیا جانے لگا کہ لاہور میں متعین افواج کی تعداد گھٹا دی جائے اور یوں ونچورا کو منڈی اور کولو کے اضلاع کا انتظام سنبھالنے پر لگا دیا گیا۔

ان اضلاع پر آپریشن جون میں شروع کیا گیا جو دسمبر تک جاری رہا اور 200 کے قریب پہاڑی قلعے فتح کر لئے گئے جن میں کملا گڑھ (Kumlagarh) کا مضبوط قلعہ بھی شامل تھا جو حقیقتاً بیس میل کے رقبے پر پھیلا ہوا قدرتی پہاڑی قلعہ تھا۔ اس سلسلے میں اس کی خدمات کے عوض دربار کی جانب سے اس کا شکریہ ادا کیا گیا اور اسے خلعت سے نوازا گیا۔ اپنے آپریشن کی تفصیلات بیان کرتے ہوئے وہ کہتا ہے کہ فوجوں کے درمیان بے راہ روی کی حوصلہ شکنی کرنے کی غرض سے پکڑے جانے والے ملزموں کی ناکیں کاٹ دی گئیں اور ان کا منہ کالا کر کے پھرایا گیا۔

درایں اثناء تمام معاملات لاہور میں طے پانے لگے۔ رانی چند کور جو نونہال سنگھ کی

وفات کے بعد حکمران بنی تھی۔ وہ ونچورا کے پرانے ساتھی شیر سنگھ کی برطرفی کے بعد سے فوجیوں میں غیر مقبول ہو گئی اور اسے شیر سنگھ کو بحال کرنا پڑا۔ مؤخرالذکر بٹالہ چلا گیا جو لاہور سے پچاس میل کے فاصلے پر ہے۔ وہاں اس نے ان فوجیوں اور بڑے عہدیداروں سے صلاح مشورہ شروع کر دیا جن کی حمایت اسے حاصل تھی۔

ان تمام خوفناک معاملات میں ونچورا دیگر تمام یورپی افسران کی طرح سے غیر جانبدار رہا مگر جب قلعہ پر قبضہ کر لیا گیا جو اس نے راجہ گلاب سنگھ کو بلا نقصان پہنچے قلعہ سے نکلنے میں اپنا اثر استعمال کیا۔ اس کے اثر و رسوخ کے بارے میں ہنری لارنس (Henry Lawrence) کی درج ذیل تحریر کافی ہے۔

"قلعہ فتح ہونے کے بعد ونچورا بھی ان میں شامل ہو گیا اور اس نے فوجیوں میں تھوڑی سی رقوم تقسیم کر دیں۔ اس نے اپنی نرم دلی اور چالوں کے ذریعہ اپنا اثر و رسوخ استعمال کرتے ہوئے فوج پر اپنا اختیار استعمال کیا۔"

اس وقت اور آئندہ بھی چند یوم وہ ہمیں کئی جانیں بچاتے ہوئے نظر آتا ہے خاص طور پر دربار عام کے اراکین کی اور جنرل تیجا سنگھ کی جو اس وقت پشاور کا گورنر تھا..... ونچورا شیر سنگھ کا دست راز تھا اور اس وقت اس کے کردار میں اس کا بڑا دخل تھا۔ اس نے شہر کا دورہ کیا۔ فوجیوں کو دھونس دے کر قابو کیا اور بتدریج کچھ احکامات جاری کئے۔

مگر جلد ہی تمام حالات کسی بھی شخص کے قابو سے باہر ہو گئے کیونکہ آزادی کا جوش ہر شخص میں اس قدر سما گیا تھا کہ ہر شخص یہ سوچتا تھا کہ نظم و ضبط کے دن گزر گئے اور یورپی افسران کی حیثیت اب بڑی غیر یقینی تھی۔ اس کے علاوہ ونچورا کو گلاب سنگھ کی دشمنی بھی مول لینی پڑی کہ جس کو قلعہ کی فتح کے بعد اس نے اپنی مداخلت کے ذریعہ بچایا تھا۔ ان تمام تر باتوں کو مدنظر رکھتے ہوئے اس نے استعفیٰ دینے اور پنجاب سے چلے جانے کا فیصلہ کیا۔

شیر سنگھ نے استعفیٰ قبول نہ کیا تاہم اس نے اس بات کی اجازت دے دی کہ وہ لاہور میں اپنا ذاتی اثر و رسوخ استعمال کرے۔ اس کے بعد ونچورا نے لدھیانہ جانے کی

غرض سے چھٹی لے لی اور وہاں پر اس نے اپنے گھر کے علاوہ (کہ جہاں اس کی بیوی رہتی تھی) اپنا تمام سامان بیچ دیا اور جاگیریں بھی برطانوی حکومت کو فروخت کر دیں۔ اس کے ہاتھیوں' کشتیوں اور گھوڑوں وغیرہ کی فروخت سے اسی (80) ہزار روپے کا تخمینہ لگایا گیا ہے۔ اس کے بعد وہ لاہور واپس آیا۔ غالباً اسے یہ امید تھی کہ حالات بہتر ہوں گے۔ لیکن 15_ ستمبر 1843ء کو شیر سنگھ کے قتل کے بعد اسے اس طرح کی تمام امیدوں کو ختم کرنا پڑا اور آخر کار اس نے پنجاب چھوڑ دیا۔

وہ اکتوبر 1844ء تک شملہ میں رہا اور ان جاگیروں سے متعلق اپنے مسائل طے کرتا رہا جو ستلج دوآبہ میں تھیں۔ اس کے بعد برطانوی حکومت کو ان جاگیروں کا انتظام سنبھالنے کی جانب راغب کر کے نومبر 1844ء میں بذریعہ بحری جہاز فرانس روانہ ہو گیا۔ جانے سے قبل اس نے 250 روپے ماہانہ کی جاگیر سے ہونے والی آمدنی میڈم ونچورا کے لئے مختص کر دی مزید یہ کہ صوبہ بہار میں جس جاگیر میں وہ شراکت دار تھا اس سے ہونے والے 100 روپے ماہانہ بھی میڈم ونچورا کے لئے مختص کر دیئے۔

فرانس میں برے معاشی حالات کی وجہ سے اس نے اپنی ہندوستانی جاگیروں پر واپس جانے کا سوچا یا پھر اپنی بیٹی کے ہاں جانے کا۔ اس کا خیال تھا کہ وہ لاہور میں اپنے گھر چلا جائے گا اور اس امید کے ساتھ وہ 1848ء میں پنجاب واپس آیا۔ مگر نہ تو اسے پنجاب حکومت کی جانب سے کوئی تحفظ دیا گیا اور نہ ہی اس کی حوصلہ افزائی کی گئی۔ اس کی آمد کو بڑے شک و شبہ سے دیکھا گیا۔ چنانچہ جب اس نے فتح ملتان کے لئے اپنی خدمات پیش کیں تو پہلے تو اسے کوئی جواب نہ دیا گیا۔ اور پھر جب اس نے اس پر زور دیا تو اسے منفی میں جواب دیا گیا۔ ساتھ ہی یہ اطلاع بھی دی گئی کہ اس موقع پر اس کی موجودگی کی کوئی خواہش نہیں ہے۔

تاہم اس نے سب سے آخر میں اپنے معاملات نمٹانا چاہے۔ برطانوی حکومت اسے بیس ہزار پونڈ کے اندازے سے رقم دے رہی تھی۔ علاوہ ازیں اسے اپنے گھر اور اپنی بیٹی کی جاگیر کے لئے 300 پونڈ کا مشاہرہ بھی مل رہا تھا۔ اس نے پندرہ ہزار روپیہ وہ بھی وصول کر لیا جو سکھ دربار کے ذمہ واجب الادا تھا پھر وہ واپس فرانس چلا گیا اور

وہیں پر 3_ اپریل 1858ء کو فوت ہو گیا۔ اسے 1841ء میں پہاڑی جنگوں میں حصہ لینے پر کاؤنٹ ڈی منڈی (Count de Mandi) کا خطاب ملا تھا اور فرانس میں عموماً اس خطاب سے پہچانا جاتا تھا۔

آخر میں ہمیں فرانس میں مشہور اس روایت کو بیان کرنے کی اجازت دیجئے کہ ان مہم جوؤں نے لاہور میں اپنے بعد بہت بڑی رقم چھوڑی تھی۔ ونچورا کے حوالے سے گزشتہ سال اس کے نسلی وارثان کی جانب سے وہ درخواست لاہور میں موصول ہوئی تھی کہ جس میں یہ دعویٰ کیا گیا تھا کہ میڈم ونچورا جو برطانوی حکومت کی ایک پینشنر کی حیثیت سے انتہائی غربت میں فوت ہوئی تھی' اس نے بہت خطیر رقم چھوڑی ہے۔

(یہ مضمون سی۔ گرے کی کتاب سے ترجمہ کیا گیا ہے)

Reference

1. Life in Mission, Camp and Zenana, P. 170.
2. In this campaign the Italian contingent was commouded by Eugene de Beanharnais, Napoleon's stepson-vide infra.
3. Ranjit Singh, Page. 133.
4. Travels in Kashmir etc. P. 356.
5. Lawrence: Adventures in the Punjab.
6. Lahore, Akhbar.
7. Punjab Records. Book no. 93, Letters no. 46 & 106.
8. Ibid.
9. Prinsep: Rise of Sikh Power, P. 132.
10. Punjab Records Book no. 94, Letter no. 55.
11. Punjab Records, Book no. 93, Letter no. 62.
12. Ibid., Letter no. 55.
13. Ibid., Letter no. 64.
14. Ibid. Letter no. 104.

15. Kalsa Durbar Records. P. 16. Vol. I.
16. History of the Punjab. P. 439.
17. History of the Punjab. P. 433.
18. Life in Mission, Camp and Zenana. P. 87.
19. Murray's Letters no. 68, Vol. I, Range 125.
20. Ibid., Vol. 16. Range 125.
21. Ibid., Vol. 18. Range 125.
22. Eugene de Beauharnais,d 1824.
23. Cabool, P. 182.
24. History of the Punjab. P. 465.
25. Calcutta Journal 1835. P. 407.
26. Travels in Kashmir. P. 317.
27. Machinnon's Military Services in Afghanistan. P. 70.
28. Tavels in Kashmir etc. P. 283-84.
29. Barr: Journal of a March, etc. P. 78-80.
30. Ibid. P. 294-95.
31. Calcutta Review. 1844. P. 486-88.
32. Punjab Records, Ventura file no. 22/A/53.
33. 1927.

اقتباس از تاریخ پنجاب

مفتی تاج الدین مرحوم

(یہ مضمون اورئنیل کالج میگزین مئی 1936ء سے لیا گیا ہے۔ اس سے رنجیت سنگھ کے انتظام سلطنت کے بارے میں معلومات ملتی ہیں)

مفتی تاج الدین بن مفتی امام الدین بن قاضی نظام الدین (1) بن قاضی عبدالباقی زمیندار بیرا (کذا) نے اپنا نسب بیان کرنے کے بعد کتاب مذکور کے دیباچہ میں لکھا ہے کہ اس کے بزرگ قصبہ سودہرہ ضلع سیالکوٹ کے رہنے والے تھے۔ عہد اورنگ زیب میں وہ عہدہ قضای لاہور و دہلی پر سرفراز ہوئے اور خطاب خانی مقرر ہوا' بعد انقلاب سلطنت چغتائی بھی لقب اور عہدہ اس کے بزرگوں کا بنا رہا۔ 1849ء میں بعد مہاراجہ دلیپ سنگھ (1845 تا 1849) وہ خود بھی عدالت میں جا کر مقدمات شرعیہ مفوضہ عدالت کو بحکم شرعی فیصل کرتا رہا' انگریزی عہد میں بھی وہ مختلف عہدوں پر فائز رہا' اکتوبر 1849ء میں وہ ضلع جہلم میں ڈپٹی کمشنر کا روبکار نویس اور فروری 1850ء میں سرشتہ دار مقرر ہوا۔ لیکن 1853ء میں بیمار ہو کر وطن کو واپس آیا' پانچ سال بعد وہ نائب سرشتہ دار و اظہار نویس درجہ اول مقرر ہو کر ضلع گوجرانوالہ میں رہا مگر اسی سال کے آخر میں مستعفی ہو گیا۔ 1867ء میں اس کو کتاب حالات ضلع لاہور مرتب کرنے کو آ گیا' مگر اسی اثناء میں صاحب ڈپٹی کمشنر کی سفارش سے اس کو چیف کورٹ میں مثل خواں کا عہدہ مل گیا۔ اور چونکہ بہ سبب اس کی کم فرصتی کے تکمیل کتاب میں دیر ہو رہی تھی۔ صاحب ممدوح نے (خان) محمد برکت علی خان کو ارشاد فرمایا کہ تکمیل کتاب میں مدد دیں۔ چنانچہ ان کی امداد سے کتاب ختم ہوئی' کتاب غالباً 1872ء کے نواح میں ختم ہوئی اس لئے کہ "نام رئیسان لاہور" کے عنوان سے اس نے (ورق 93 بے

بعد) پر دیوان رتن چند اور فقیر شمس الدین کی موجودگی کا ذکر کیا ہے' یہ دونوں رئیس 1872ء میں فوت ہوئے (دیکھو روسائے پنجاب مرتبہ گرفن ومیسی' اڈیشن 1930ء ص 86 و 85)

مصنف نے ضلع لاہور کے حالات لکھنے سے پہلے ایک باب حالات پنجاب پر لکھا ہے جو ایک مقدمہ اور چار فصلوں میں منقسم ہے' آخری دو فصلوں میں سکھوں کا حال دیا گیا ہے جو قیمتی معلومات پر مشتمل ہے۔ اس لئے کہ مصنف نے یہ حالات عینی مشاہدے سے لکھے ہیں یا معتبر معاصروں سے لئے ہیں۔ افسوس ہے کہ اس نسخے میں جو میرے سامنے موجود (2) ہے۔ کتاب کا یہ حصہ ناقص ہے اور فصل سوم کا بہت سا حصہ اور فصل چہارم تمام کی تمام ناپید ہے۔

ذیل کا اقتباس موجودہ نسخہ کے باب اول کے آخری اوراق سے لیا گیا ہے جو باب ا کی فصل 3 کے ضمن 3 کا تذکرہ 2 ہے' اس تذکرہ کا عنوان ہے:

شروع ریاست مہاراجہ رنجیت سنگھ تا وفات آن' مہاراجہ کے انتقال کا حال درج کرنے کے بعد مصنف نے اس کے عہد کے انتظامی حالات دیئے ہیں۔ جو حسب ذیل ہیں۔ مصنف کے بیان میں زبان کی بعض خامیاں ہیں جن سے قاریان کرام کو صرف نظر واجب ہے۔ (3)

کاروائی عدالت اور انتظام ملک اور ریاست کا بیان

کاروائی عدالت

یہ حسن انتظام عدالت بعمل سرکار انگریزی ہے۔ مہاراجہ صاحب کی عملداری میں نہ تھا۔ یعنی نہ تو کوئی مثل مرتب ہوتی تھی اور نہ کسی ضابطہ کی پابندی اور نہ کوئی محکمہ مرافعہ کا تھا۔ صرف زبانی گفتگو پر حق رسی مدعی کی اسی وقت ہو جاتی تھی۔ جن سرداروں کو دعوی وزارت و قرب مصاحبت حاصل تھا۔ جیسا کہ جمعدار خوشحال سنگھ و راجہ دھیان سنگھ و راجہ گلاب سنگھ و سردار عطر سنگھ سندہانوالیہ و سردار ہری سنگھ و سردار جوالا سنگھ بھڑانیہ و سردار دیسا سنگھ مجیٹھیا و راجہ سوچیت سنگھ اور نہال سنگھ اٹاری والہ اور بعد اس کے شام سنگھ ان کو اپنے ملک میں اختیار کلی تھا جیسا چاہتے تھے انتظام کرتے تھے اور انہوں نے اپنے بڑے بڑے (37 ب) کارداروں کو سب طرح کا اختیار دیا ہوا تھا۔ جس پر کاردار تعدی کرتے تھے اس کی حق رسی جاگیردار کرتا تھا اور جس پر جاگیردار تشدد کرتے تھے اس کی داد دہی مہاراج کرتا تھا۔ اور صوبہ (4) کشمیر اور ملتان اور پشاور اور امین الملک جالندھر کو بجائے خود اختیارات خود حکمی حاصل تھے۔ لاہور میں ایک عدالتی صدر مقرر رہتا تھا۔ مگر ہر ایک سردار نامی کو اپنے اپنے گزاروں کا اختیار بجائے خود حاصل ہوتا تھا۔ عدالتی کو اس میں کچھ دخل نہیں ہوتا تھا۔ چنانچہ چونے منڈوی و جزوے موتی بازار کی عدالت متعلق جمعدار کے رہتی تھی و کذلک علاقہ ہیرا منڈی و سید مٹھہ متعلق حویلی راجہ دیہان (کذا) سنگھ کے اور بازار ٹبی تابدروازہ ٹکسالی متعلق راجہ سوچیت سنگھ اور لاہوری منڈی متعلق حویلی شہزادہ کھڑک سنگھ کے تھی۔ مقدمات چوری و رہزنی و خونریزی و دیگر خرخشہ ہای زد و کوب میں اکثر سزا یابی ہوتی تھی۔ خصوص واسطے مقدمات خون کے ایک پٹی علیحدہ مقرر رہتی تھی جس میں زر خون بہا جمع ہوتا تھا۔ ایسے مقدمات میں ایک ہزار روپیہ تک زر جرمانہ کیا جاتا تھا اور

کبھی قصاص کا حکم دیا جاتا تھا۔

مقدمات چوری و دیگر فوجداری

اور مقدمات چوری میں سزا مختلف تھی۔ کسی کے ہاتھ کٹوائے جاتے تھے۔ اور کسی کا ناک اور کسی کو پھانسی دیا جاتا تھا اور کسی کو چند روز قید کر کے چھوڑ دیتے تھے' اور چور کے ہمراز اور مددگار چور کو بھی وہی سزا دی جاتی تھی جو اصل چور کے واسطے تجویز کی جاتی تھی۔ جو شخص ایک دفعہ گرفتار ہو کر اور رہا ہو کر دوبارہ چوری میں گرفتار ہوتا تھا۔ تو اس کے ہاتھ یا ناک اور کان کٹوائے جاتے تھے اور علاوہ اس کے لوٹ لیا جاتا تھا یا بعد تشہیر جلاوطن کیا جاتا تھا یا قیدیان بلا معیاد میں کوتوالی میں قید رہتا تھا۔ راجہ دھیان سنگھ اکثر چوروں کی بن شتالنگ کٹواتا تھا' اور کبھی کبھی مقدمات جعل اور حلف دروغ میں بھی ہاتھ کٹوائے جاتے تھے' اور زنا میں صرف جرمانہ کی سزا مقرر تھی' اور نمک حرام اور باغی اور مفسد کو قلعہ کانگڑہ یا گوبند گڑھ وغیرہ میں مدت العمر قید کر دیا (جاتا) تھا اور وظیفہ ہر ایک کا مقرر ہو جاتا تھا مگر قیدیان کوتوالی سے بھیک منگوائی جاتی تھی اور متسلسل ہونا قیدی کا خصوصیت کسی ضابطہ سے نہیں رکھتا تھا۔ مقدمات داد ستد میں بھی مدعا علیہ مدیون کو پابزنجیر یا پابہ ترب (5) کر دیتے تھے۔

مقدمات دیوانی

مقدمات دادستد میں کوئی حد سماعت مقرر نہ تھی۔ حقیقت حال پر لحاظ کیا جاتا تھا اور در صورت راستی قرضہ باپ کا بلکہ دادے کا بیٹے اور پوتے سے باوصف گزرنے عرصہ سو برس کے دلایا جاتا تھا۔ جس مقدمہ میں مدعی علیہ اقبال نہیں کرتا تھا اکثر حلف مدعی یا مدعی علیہ یا ثالث آدمی پر فیصلہ ہوتا تھا اور درانحال (38 الف) کہ مدعی علیہ نے بدنیتی سے جائیداد چھپائی ہو علاوہ ایصال (6) زر دعوی جرمانہ لیا جاتا تھا وکذا اگر مدعی یا مدعی علیہ جھوٹے دعوے یار و جواب پیش کرتا تھا تو بے جرمانہ کسی کو نہیں چھوڑا جاتا تھا وبصورت نادہندی تشدد کیا جاتا اور مدیون مفلس اکثر معاف رہتا تھا۔

آمد مقدمات دیوانی

بعد ایصال زر دعویٰ چہارم دعویٰ حق سرکار ہوتا تھا اور تین ربع حق دعویدار کا۔

قاضی _ مفتی اور پنڈت کا بیان

مقدمات نکاح اور طلاق و ہبہ و تقسیم وراثت و فرائض مسلمانان و دیگر خرخشہ ہائے مذہبی باستفتاء قاضی ہوتی تھی اور قاضی کو علاوہ فیصلہ مقدمات شرعیہ اجرای قبالہ جات بیع و رہن و تقسیم و ابراء و صلح و نکاح و طلاق کا اختیار تھا اور اپنے موہر سے تحقیقات کر کے اجرا کرتا تھا۔ جو کوئی شخص قبالہ بے موہر قاضی لکھواتا سند نہیں سمجھا جاتا تھا' اور طریق اجراء قبالہ جات کا اس طرح پر تھا کہ اول بیعنامہ لکھا جاتا تھا اور صرف اس میں نام اور سکونت اور قومیت فریقین مقراور مقرلہ اور تعداد مبیعہ لکھا جاتا تھا اور وہ معرفت محلّہ دار برسر موقع حسب شفعاء کو سنایا جاتا تھا اور ایک میعاد دی جاتی تھی کہ جس کو کچھ استحقاق ہو حاضر ہو کر دعویٰ کرے۔ پس اگر سب لوگ اس پر گواہی کر دیتے تھے تو قبالہ بلا دیر و درنگ لکھا اور مکمل کیا جاتا تھا اور جو لوگ گواہی کرنے سے عذر کرتے تھے ان کی انتظار کی جاتی اور حقیقتہ الحال پر خیال کیا جاتا تھا یعنی اگر دعوی مدعی واجبی ہوتا تھا تو قبالہ اجرا نہیں پاتا تھا اور دیگر صکوک میں بھی پہلے معرفت محلّہ دار اہل کوچہ کو سب امر سے متنبہ کیا جاتا تھا اور اہل محلّہ ہی کی گواہی اور پنچایت پر اکثر فیصلہ عمل میں آتا تھا۔ پانچ روپیہ سینکڑہ حق قاضی و مفتی و صکاک و محلّہ دار ہوتا تھا اور تین روپے سینکڑہ حق پیائش واسطے پیائش کرنے والوں کے علاوہ اس کے دو روپیہ یومیہ عدالت میں واسطے قاضی کے مقرر تھا چنانچہ نامہ نگار عہد مہاراجہ دلیپ سنگھ میں لیتا رہا اور اس طرح کا چرچہ محکمہ شرعیہ کا الی خاتمہ مہاراجہ دلیپ سنگھ (1845ء تا 1849) بنا رہا اور پنڈت کے واسطے بھی مواجب مقرر تھا۔ 1884 (1827ء) میں موہرہائے شرعیہ جس میں کھودا (7) ہوا ہوتا تھا نام شریعت کا ضبط کر کے موہرہای اکال سہای عنایت ہوئیں۔ اور ساتھ مہر قاضی کے ایک موہر پنڈت کی اور (38 ب) کی اور (38 ب) ایک موہر سید کی اور پشت (8) قبالہ پر موہر چبوترہ کی کہ .تحویل بیبہ ہری سنگھ رہتی تھی شروع ہوئی۔

عدالت کمان افسران

کمان افسروں کو عدالت فوج میں بذات خود اختیار تھا اور رپٹ ہر روزہ عدالت اور خبر عافیت اور ضروریات مصارف فوج کی راجہ دھیان سنگھ سنتا تھا اور اس میں سے کوئی امر جو اہم مطالب ہوتا تھا مہاراج کے گوش گزار کیا جاتا تھا۔ مہاراج کو خفیہ تحقیقات کرنے کا بڑا ڈھب تھا اور عدالتی کا حال اکثر غربای لاہور سے اور کارداروں کا حال زمینداران دیہات سے پوچھ لیا کرتے تھے۔ جو کوئی فریادی کسی صوبہ یا امین الملک یا کسی کاردار پر آتا تھا۔ اسی وقت پروانہ اس کاردار یا صوبہ کے نام اس کی حق رسی کے واسطے لکھا جاتا تھا۔ سب صوبوں اور مالگزاروں سے دیوان ساون مل بہت نیک نام آدمی تھا اور مہاراجہ (9) صاحب بھی اس سے خوش رہے۔ جو مقدمہ گھر میں خود بخود فیصلہ پاتا تھا اس میں اہلکاران عدالت کو کچھ سروکار نہیں ہوتا تھا مگر چہارم سرکاری لی جاتی تھی اور بعضے عدالتی مخبر رکھ کر اکثر لوگوں کو ایسے معاملات میں گرفتار کر لیتے تھے اور چند رسمیں بموجب استحباب اکثر اقوام اولے الاسلام برخلاف (10) شرع مقرر تھیں۔ چنانچہ اقوام جٹاں میں بھرجائی بیوہ بے اجازت دیور اور جیٹھ کے دوسرے کسی سے نکاح نہیں کر سکتی تھی اور در صورتیکہ بیوہ بیوہ ہو کر بیٹھنا قبول کرتی تھی اس پر بطور تحکم اور جیٹھ بھی زبردستی نکاح نہیں کر سکتا تھا (کذا)

دوسری یہ کہ جو کوئی عورت بیوہ اپنے خاوند متوفی کے حق سے نکل کر کسی آدمی سے نکاح پڑھا لیتی تھی اکثر قوموں میں وراثت شوہری سے محروم ہو جاتی تھی۔

تیسری مانند ہنود کے بعضی اقوام مسلمانان جٹ میں رسم تھی کہ جائداد پوری سے بنات کو ورثہ نہیں دیتے تھے اور اقوام راجپوتاں و اولاد گوروان میں بنات کو وقت ولادت قتل کر دیتے تھے' سب عدالتیوں سے شہزادہ شیر سنگھ اور ونتورا صاحب بہت اچھے عدالتی لاہور میں ہوئے۔ کہتے ہیں کہ سنہ 1892 (1835ء) پلٹن میں بعهد عدالت شہزادہ شیر سنگھ ایک سپاہی ونتورا صاحب کا چھاؤنی انارکلی سے لاہور میں آ کر وقت واپسی کے دو پیسہ کا جغرات دونے میں لے گیا۔ ڈیرہ میں جا کر اس کو کم پایا اور مقدمہ کم وزنی کا دائر ہو کر جغرات فروش لاہور سے بلایا گیا اور اس سے جرمانہ لیا گیا اور جوتیوں کی مار علاوہ کی گئی۔ بعد رہائی کے دہی فروش پاس شہزادہ صاحب کے جا کر داد خواہ ہوا اور شہزادہ صاحب نے اس سپاہی کو چھاؤنی سے طلب کرا کے مقدمہ کا حال دیکھا اور سنا اور

سوچا کہ کمی دہی کے بسبب متقاطر ہونے کے ہوئی ہو گی۔ چنانچہ اس امر کی تصدیق کے واسطے ایک آدمی کو لاہور بھیج کر دونے میں دہی منگوایا گیا اور بسبب متقاطر ہونے کے اس موقع پہنچنے تک کم پایا گیا۔ آخر سپاہی (39 الف) پر جرمانہ ہوا اور سابق جرمانہ جو دہی فروش پر ہوا تھا واپس دلایا گیا' مہاراج کے روبروی جو عدالت ہوتی تھی اکثر اس میں فریقین کی طرف امرای دربار حامی ہوتے تھے اور اس عدالت میں سب کو عبرت ہو جاتی تھی۔ اکثر مہاراجہ صاحب نے مجرمان خونی کو باوصف اقرار مصلحتہ" چھوڑ دیا۔ چنانچہ میاں دیہان (کذا) سنگھ اور گلاب سنگھ جو سواروں میں نوکر تھے اپنے باپ کے قاتل کو .بقصاص پدری قتل کر کے از خود روبروی مہاراج کے آ کر اقراری ہوئے اور معاف کئے گئے بلکہ اس راست گوئی میں ان کی ترقی ہوئی اور اس قتل کو فعل غیرت سمجھا گیا۔
جس زمانہ میں بی موراں طوائف کو رتبہ مصاحبت حاصل تھا اور مہاراج اس کی محبت میں انواع تکالیف گوناگوں اپنے اوپر گوارا رکھتے تھے۔ بی موراں نے ایک کشمیری کی لڑکی کو جو بہت شکیلہ تھی اس کے وارثوں سے چھین لیا اور کشمیری بحضور مہاراجہ صاحب داد خواہ ہوا اور مہاراجہ صاحب نے اس لڑکی کو روبروئے اپنے طلب کر کے برخلاف مقتضای بی موراں اس کا نکاح ساتھ ایک داروغہ اصطبل کے کر دیا اور اس کے گزارہ کے واسطے روپیہ یومیہ لگا دیا بعد چندے بی موراں نے ایک ہندو کو مسلمان کیا۔ اور مہاراجہ صاحب نے برخلاف مقتضای صحبت (کذا) و اکابر ہنود بی موراں سے اس امر میں کچھ نہ کہا اور نہ کوئی چشم نمائی کی' برہمنوں نے اس حقارت مذہب کو ناپسند کر کے بہت انبوہ کیا اور دریا پر واسطے بربادی مہاراج کے پریوگ (11) بیٹھے مگر مہاراج نے کچھ پرواہ نہ کی۔

بیان نظامت

ابتدا عمل میں نہ کوئی دفتر تھا اور نہ کوئی دیوان اور نہ تشخیص اس امر کی کہ مشخصہ از روئی حیثیت دیہہ کتنا چاہیے' صرف زبانی گفتگو پر کارداروں کو ایک جمع پر ملک دیا جاتا تھا نہ کوئی قاعدہ ایصال معاملہ تھا نہ کوئی ضابطہ تشخیص محال کا اور جمع خرچ بھی اکثر زبانی بھگتایا جاتا تھا اور کاردار اپنی مرضی سے اپنے حکم سے جس کسی کو چاہتے تھے بطور

جاگیر یا انعام یا دھرم ارتھ زمین دے دیا کرتے تھے۔ خواہ دوسرا کاردار اس کو منظور کرے، یا رکھے بعد جانی جسونت (12) رائے مرہٹہ کے بموجب رسم و سیاق باہتمام دیوان دیوی داس اور بھوانی داس اور بعد اس کے دیوان دینا ناتھ ترتیب دفتر کی ہوئی۔ جو ملک۔ مصاحبوں کو سپرد ہوتا تھا اس میں کچھ گزارہ اس کی سرداری کا ہوتا تھا اور کچھ حاضری فوج کی لی جاتی تھی اور کچھ بطور اجارہ مشخصہ پر دیا جاتا تھا' امیروں نے اپنی طرف سے کاردار مقرر کر رکھے تھے۔ مگر ہم انجام کارداروں کا (39 ب) ہمیشہ بد دیکھتے رہے۔ اکثر کاردار خیانت یا تغلب مال سرکار یا بقیہ زر مشخصہ میں ماخوذ ہو کر در دفتر پر مہینوں اور برسوں تک جوتے چٹخاتے تھے اور جو کوئی روپیہ دینے میں عمداً" ایام گزاری کرتا تھا بانواع عقوبت ہائے رنگا رنگ گرفتار اور پامال رہتا تھا اور نہایت بدنام نہایت سختی میں مبتلا رہتا تھا اور جس کی سفارش پہنچ جاتی تھی یا روپیہ ادا کر دیتا تھا۔ قید سے رہا ہو کر بدستور سابق سرفرازی پاتا تھا اور لاوارث آدمی کا خدا حافظ!

واسطے مطالبہ زر محاصل کے کوئی وقت مقرر نہ تھا اور نہ رسم اقساط کی۔ بسااوقات تو ایسا ہوتا تھا کہ کاردار جب اپنے مالک پر پہنچ جاتا تھا۔ متعاقب اس کے بھیہ سرکاری یک تنخواہ لے کر حاضر ہوتا تھا۔ اگر کاردار اس شخص کو کچھ دے کر راضی کر دیتا تھا تو چار دن کی سہولت حاصل کر لیتا تھا ورنہ وہ بھیہ واسطے اس کے بے عزت کرنے کے کافی ہوتا تھا' اور رسم تھی کہ کاردار لوگ اپنے ملک میں جا کر سرگاؤں ایک روپیہ نذرانہ اپنا اوگرا (اگاہ) لیتے تھے اور جو شخص نہیں دیتا تھا بے عزت ہوتا تھا اور لکڑی ور گھاس اور بھوسے کا تو کوئی دام نہیں دیتا تھا۔ جو اجارہ دار کاردار ہوتے تھے ان کی کوئی تنخواہ نہیں ہوتی تھی۔ مگر جو کاردار امین ہوتے تھے وہ ضرور نوکری پاتے تھے اور معاملہ بموجب کنکوت لیا جاتا تھا۔ بظاہر تو حق سرکار چہارم حصہ مقرر تھا۔ مگر درحقیقت زمیندار کے پلے میں روپے سے 4 بھی نہیں رہتا تھا۔

رقم فروعی کا بیان

سوئے زر مشخصہ کے ایک رقم فروعی ہوتی تھی۔ ہمچو آمدنی عدالت و دیگر ٹھیکہ ہائے و رسوم و جرمانہ ہائے تجاوز حدود ماموره و بهته۔ (13) علاوہ اس کے اور کئی طرح

کے مطالبے تھے چنانچہ واسطے چارے ہاتھیوں کے فیل بان اور چر کٹے جدا جاتے تھے اور حسب مرضی شکم سیر اور مطلب بر آر ہو کر واپس آتے تھے۔ اہل حرفہ پر بھی طرح طرح کے محصول تھے جیسے کہ اب آمدنی دھرت و چنگی و چوکی وارہ مقرر ہے۔ مگر یہ رقمیں امور واجبی ہیں اور باسلیقہ وصول کی جاتی ہیں۔ اس وقت نہ کوئی سلیقہ ایصال کا تھا اور نہ لحاظ حیثیت حال محال پر' لاہور میں ایسی آمدنیوں کا اجیر.ھیہ ہری سنگھ تھا اور اجارہ دینا اور معاف کرنا یا گھٹانا یا بڑھانا رقموں کا بہ اختیار راجہ دھیان سنگھ تھا۔

تفصیل محالوں کی تو میں نہیں لکھ سکتا کہ صدہا تھے۔ مگر چند محال بطور مشتے نمونہ خروار لکھے جاتے ہیں۔ چنانچہ جو چاندی سونے کا کام کرتا تھا۔ سب محصول دیتا تھا۔ و علیٰ ہذالقیاس سب اہل حرفہ پابند ادا تھے۔ ایک رقم کنجروں پر مقرر تھی کہ جو کوئی طوائف کسی طوائف یا میراثی قوم سے آشنائی کرتی تھی پانچ سو روپے جرمانہ دیتی تھی۔ او امرتسر میں کنجروں پر ایک اور رسم تھی کہ انکم ٹیکس ان کی معاش سے کچھ لیا جاتا تھا۔ جو سوسی کا پاجامہ پہنتے تھے وہ کم دیتے تھے اور جو گلبدن (40 الف) پوش رہتے تھے ان سے زیادہ لیا جاتا تھا۔ کنجروں کو اپنے گھر کا اختیار تھا۔ یہ ممکن نہیں تھا کہ کوئی کنیزک اپنی ذات کو مختارہ سمجھ کر دوسری جگہ جا بیٹھے۔ موچیوں پر سوائے محصول حرفہ ایک اور رسم تھی کہ جو کوئی لاہور میں جوتا جھوٹے کام کا بناتا تھا اس سے جرمانہ لیا جاتا تھا۔ بیوہ عورت بھی بے ادائے زر محصول سرکار نکاح نہیں کرا سکتی تھی۔ قمار باز بھی قمار بازی کا ٹھیکہ دیتے تھے۔ بردہ فروشی کی بھی کوئی ممانعت نہ تھی۔ بلکہ یہ بھی ایک محال تھا۔ البتہ ایک شراب اور افیون پر کچھ محصول نہ تھا۔

صوبہ (14) پشاور۔ صوبہ کشمیر اور صوبہ ملتان کو تو ہر امر میں اختیار کلی تھا۔ راجہ دھیان سنگھ بھی بحکم خود ان پر تحکم نہیں کر سکتا تھا۔ سب ملکوں سے ملک پشاور اور ہزارہ اور ڈیرہ غازی خان و ڈیرہ اسمٰعیل خان' بنوں بہت سخت تعلقے تھے۔ ہمیشہ واسطے ایصال بقایا کے فوج کو وہاں جانا پڑتا تھا۔ کشمیر (15) میں ابتدا عملداری میں دیوان موتی رام صوبہ اور ساتھ اس کے شیخ غلام محی الدین معتمد کل بنا کر بھیجا گیا اس وقت بہ سبب قلت جمع کشمیر رعیت آسودہ اور حساب بیباق رہا۔ بعد ان کے سردار ہری سنگھ گیا۔ وہ بھی تھوڑی مدت رہ کر چلا آیا۔ اور بجائے اس کے کہ چونی لال مالیر کو ٹلیہ بھیجا

گیا۔ اس سے محاصل سرکاری ادا نہ ہو سکا اور نہ رئیت راضی رہی۔ اس واسطے تھوڑی ہی مدت میں واپس بلایا گیا اور دیوان کرپا رام ولد دیوان موتی رام بھیجا گیا کہ چند برس تک رہا۔ اس نے رعیت کو آباد کیا اور محاصل بھی بڑھایا۔ سرکار سے صرف تیس لاکھ پر ملک لے گیا تھا اور بہ حساب 42 لاکھ بھیجتا رہا۔ بعد اس کے بھما سنگھ (16) اردلی بھیجا گیا۔ اس سے بھی انتظام نہ ہو سکا اس لئے بعد اس کے شہزادہ شیر سنگھ اور ساتھ اس کے دیوان بیساکھا سنگھ بھیجا گیا۔ مگر بہ سبب شکایت بے انتظامی مہاراج نے بیساکھا سنگھ کو بلوا کر قید کر لیا اور جمعدار خوشحال سنگھ کو مدارالمہام قرار دے کر بھیجا۔ اتفاقاً ایسی قحط سالی ہوئی کہ آدمی کو آدمی کھانے لگا اور ہزارہا آدمی بھوک سے مر گئے۔ حتیٰ کہ محاصل بھی جاتا رہا۔ پس مہاراج نے ان کو بھی بلوا لیا اور بجائے ان کے سم 1890 (1833ء) میں کرنیل میہان سنگھ کو (40 ب) بھیجا گیا۔ جو سمت 1898 (1841ء) تک رہا۔ اس کے عمل میں بھی رعیت آسودہ رہی۔

ملک کانگڑہ کوہستان شرقی و دامن کوہ سپرد سردار لہنا سنگھ مجیٹھیا کے تھا آمدنی اس ملک کی زیادہ (17) انیس بیس لاکھ کے رہی۔ اس میں کچھ فوج کی حاضری لی جاتی تھی اور کچھ زر نقد اور کچھ واسطے گزارہ کے معاف تھا۔

قصبہ ڈیرہ نانک و دیگر علاقہ ہائے گرد و نواح قریب چار پانچ لاکھ کی آمدنی بابا صاحب سنگھ بیدی اور بعد اس کے بابا بکرما سنگھ اس کے متبنیٰ کو معاف رہی۔

علاقہ بٹالہ بعد از رانی سدا کور' شہزادہ شیر سنگھ کو عنایت ہوا۔ اس سے بھی کچھ حاضری فوج کی لی جاتی تھی۔

اور تخمیناً سولہ لاکھ روپے کا ملک آن روی دریائے ستلج واقع تھا اور اس کا روپیہ معرفت وکلائے مقیمی فیروز پور ولودیانہ آتا تھا۔

علاقہ کریانوالہ اور کبھی کبھی سیالکوٹ بھی کشمیرا سنگھ اور پشورا سنگھ کو معاف تھا اور قصور اور کچھ ملک ماجھہ سردار شام سنگھ اٹاریوالہ کے پاس اور باقی اضلاع اور تعلقوں پر اجیریا کاردار امین مقرر تھے۔ مگر ملک دوآبہ اکثر بتحویل شیخ غلام محی الدین یا مصر رام کشن کے رہا۔

تخمیناً چہارم حصہ کل ملک کا بطور جاگیر یا دھرم ارتھ معاف تھا اور سہ ربع مال

خالصہ تھا۔ ریزہ ریزہ معافی بھی بہت تھی تھی اور کوئی تعلقہ خالی از معافی و جاگیر نہ تھا۔ چودھریان دیہات کے واسطے بھی عوض حق چودھرات کے اکثر زمین معاف ہوتی تھی اور کچھ نقد بھی پاتے تھے۔

ملک وزیر آباد پر عرصہ دراز تک اوی طویلہ صاحب امین الملک مقرر ہوا۔ اور اس کے زیر حکومت رعیت نے بہت آرام پایا اور صورت محاصل پیدا ہوئی پہلے یہ شخص پہاڑ میں امین تھا پیچھے اس ملک میں آیا۔ عدالت مانند سر رشتہ انگریزی کے بلا رو و رعایت اور بہ ترتیب مثل کرتا تھا۔ اور چوروں اور رہزنوں اور نمک حراموں کو خوب پہچانتا تھا۔ وزیر آباد کو مقطع اور خوش وضع اسی نے بنایا۔

بیان خزانہ مہاراجہ صاحب

ابتدا عملداری کاروائی مہاراج کی آئی چلائی پر تھی یعنی جیسا روپیہ آتا تھا ویسا خرچ ہو جاتا تھا اور چونکہ آمدنی خرچ سے کم تھی اس لئے اکثر احتیاج قرض کی رہتی تھی۔ پھر چند مدت تک خزانہ سپرد مہاجنوں کے رہتا رہا' بعد نصیحت جسونت رای ہولکر کے صرافوں سے لین دین موقوف کر کر مخزن مقرر کیا' ضرب روپیہ مہاراج کی اس شعر پر تھی فرد

دیغ (18) (دیگ) تیغ و فتح و نصرت بید رنگ
یافت از نانک گورو گوبند سنگھ

حالت تعشق میں مہاراج نے ضرب بنام بی موراں لگوائی۔ (19) اور وہ روپیہ بھی برابر رائج رہا' ایک خزانہ اندر قلعہ کے تھا۔ جس پر مصر بیلی رام افسر تھا اور دوسرا خزانہ باہر قلعہ کے تھا۔ جس پر مصر لعل سنگھ مختار تھا مگر گران بہا شے قلعہ والے خزانہ میں رکھی جاتی تھی اور کچھ روپیہ نقد موتی مسجد میں جس کو موتی مندر کہتے تھے جمع تھا۔ بعد تیاری۔

حوالہ جات

1- ظفرنامہ ص 17 پر ہے کہ 1801ء میں مہاراجہ رنجیت سنگھ نے مفتی نظام الدین کو

خلعت قضا دی اور انفصال مخاصمہ وراثت و عقود انکحہ اہل اسلام کا کام سپرد کیا نیز دیکھو تاریخ لاہور مصنفہ کنہیا لال صفحہ 53 حاشیہ صفحہ ہذا۔

2- یہ نسخہ غالباً مصنف کا خود نوشتہ ہے اس لئے کہ اس میں جابجا جک و اصلاح موجود ہے جس پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ خود مصنف نے نظرثانی کرتے وقت کتاب میں ترمیم کی ہے' اس کے علاوہ جلد پر کاتب کتاب کے خط میں مسودہ تاریخ پنجاب لکھا ہوا ہے۔

3- مصنف نے ہر جگہ اوس' اویں' اوپر' اوسکو' بولوایا لکھا ہے' یعنی اعراب بالحروف دیا ہے۔

4- بمعنی صوبہ دار

5- مصنف نے پہلے لکھا تھا "سوائے اس کے ایک ترب چوبی ہوتا تھا جس میں پاؤں قیدی کا بند کر کے قیدی سے حرکت کراتے تھے" پھر اس کو قلمزن کر دیا ہے۔

6- بمعنی وصولی زر استعمال ہوا ہے۔

7- مغلوں کے عہد میں قاضی کی مہر پر "خادم شرع شریف فلاں کھدا ہوا ہوتا تھا۔ اس کی طرف اشارہ ہے۔"

8- اصل: قیالہ کی پشت قیالہ پر۔

9- دیکھو ظفرنامہ ص 247-

10- اصل: چند رسمیں برخلاف۔

11- ظفرنامہ ص 172: پریوگ کہ در ہند زمین رسم ہنود از عبادات متعدد ممتحنہ می باشد۔

12- یہ واقعہ 1805ء کا ہے دیکھو ظفرنامہ ص 34-

13- اصل: بہتہ' مشکوک ہے۔

14- یعنی صوبہ دار۔

15- Stockvis نے ج 1 ص 242 پر سکھوں کے عہد کے گورنران کشمیر کی فہرست حسب ذیل ہے:

1- موتی رام 1820-1819 2- ہری سنگھ نلوا 1822-1820

3- موتی رام	1823-1822	4- گورمکھ سنگھ	1825-1823
5- کرپا رام	810-1825	6- بھما سنگھ	1831-1830
7- شیر سنگھ	1833-1831	8- میہان سنگھ	1841-1833
9- غلام محی الدین	1845-1841	10- امام الدین	1846-1845

16- ظفر نامہ ص 162 سے معلوم ہوتا ہے کہ 1834ء میں دیوان موتی رام کو کشمیر سے معزول اور بھان سنگھ کمیدان کو اس کی جگہ متعین کیا گیا' پھر چونی لعل ساڑھے ستائیس لاکھ کے اجارہ پر ناظم مقرر ہوا۔ ص 176 پر وقائع 1826ء میں لکھا ہے کہ چونی لعل و گورمکھ سنگھ کمیدان کو معزول کیا گیا' اور دیوان کرپا رام کو ناظم کشمیر بنایا گیا۔ اجارہ 26 لاکھ روپیہ سوائے اخراجات و جاگیرات قرار پایا۔ دیوان نے شیخ غلام محی الدین کلال ہوشیار پور کو اپنا نائب قرار دے کر خوب بندوبست ملک کا کیا' نیز دیکھو ص 222_

17- اصل : زیادہ زیادہ

18- دیکھو ظفر نامہ ص 17-

19- دیکھو تاریخ لاہور ص 182-

سکھ عہد میں حویلیوں کی تعمیر

غافر شہزاد

ڈاکٹر سیف الرحمٰن ڈار نے سکھ عہد کو تین واضح ادوار میں تقسیم کیا ہے

1-رنجیت سنگھ سے پہلے کا دور (1768-1798)

2-رنجیت سنگھ کا دور (1798-1838)

3-رنجیت سنگھ کے بعد کا دور (1838-1849)

رنجیت سنگھ سے پہلے کا دور جو تین دہائیوں پر محیط ہے اس میں سکھوں کی بارہ مثلوں کے ہاتھوں پنجاب کے مختلف حصوں میں قتل و غارت گری اور ڈاکہ زنی کی لرزہ خیز وارداتوں کا بکثرت ذکر ملتا ہے۔ شہروں کے شہر اور قصبوں کے قصبے لٹے پھٹے اور تباہ حال دکھائی پڑتے ہیں۔ احمد شاہ درانی غریب اور کمزور رعایا کو لوٹ مار اور استحصال سے بچانے اور سکھوں کی سرکوبی کی غرض سے سات مرتبہ ہندوستان پر حملہ آور ہوا۔ انہی مقاصد کے حصول کے لئے شاہ زمان بادشاہ نے بھی دو مرتبہ پنجاب پر حملہ کیا مگر معاملات گرفت میں نہ آسکے اور انتہائی مایوسی کا سامنا کرنا پڑا حتیٰ کہ یہ علاقہ شاہان کابل کی حاکمانہ سرپرستی سے محروم ہو گیا۔ اور یوں سکھوں کیخلاف کسی قسم کی مزاحمت نہ رہی۔

کنہیا لال ہندی نے سکھوں کی ان بارہ مثلوں کا تذکرہ نہایت تفصیل کے ساتھ اپنی کتاب "تاریخ پنجاب" مطبوعہ 1877ء میں کیا ہے۔ سکھوں کی ان بارہ مثلوں کے کم وبیش تمام بانی سکھ ابتدائی طور پر عسرت و ناداری اور کسمپرسی کی زندگی کے ہاتھوں تنگ آ کر کسی سکھ گرو سے پاہل لیتے ہیں ان کو ایک گھوڑا، زین اور کرپان ملتی ہے وہ لوٹ مار کے لئے جی داروں کا گروہ بناتے ہیں، وارداتیں کرتے ہیں نصف حصہ خود رکھتے ہیں، نصف حصہ سردار کو جمع کرواتے ہیں

یوں لگتا ہے جیسے ان تین دہائیوں میں قتل و غارت' لوٹ مار اور رہزنی نے باقاعدہ پیشے کی شکل اختیار کر لی ہے۔ اور بارہ مثلوں کے سرداروں کی قابلیت محض ان کا جری' بہادر' بے رحم اور جی دار ہونا ہی نظر آتا ہے۔ ان میں بارہویں مثل سکر چکیوں سکھوں کی ہے' جس کی بنیاد سردار چڑت سنگھ نے رکھی تھی اور اسی مثل سے سردار رنجیت سنگھ ہوا۔

احمد شاہ درانی نے ہندوستان جانے سے قبل کریم داد خان کو جس زمانے میں لاہور کا امیر بنایا تھا' اس دوران امرتسر میں سکھ سرداروں' سنگھ آلووالیہ' جیت سنگھ' کنہیا و گوجر سنگھ' بھنگی ولہنا سنگھ نے باہم مل کر لاہور پر قبضہ کا منصوبہ بنایا اور دس ہزار سکھ جوانوں کو ساتھ لے کر لاہور پر حملہ آور ہوئے چونکہ حفاظتی پیش بندی کے طور پر کریم داد خان نے فصیل کے دروازے بند کرا دیئے لہذا سکھ نواحی آبادیوں پر حملہ آور ہوئے۔

کنہیا لال ''تاریخ لاہور'' میں لکھتے ہیں ''جب سامان منقولہ لٹ چکا تو حویلیوں پر آفت آئی' چھتوں کی کڑیاں' دروازوں کے کواڑ' جو اچھے دیکھے جاتے' مکانات میں سے اتار لیے جاتے' باقی مکان کو آگ لگا دی جاتی' کئی روز تک یہ نازنین شہر جلتا رہا' غرض باہر کی سب آبادیاں جل کر خاکستر ہوئیں تو سکھوں نے اندرونی شہر کی طرف توجہ دی''۔

کریم داد خان نے صلح کے لئے خالصہ جی کے کڑاہ پرشاد کی خاطر تین ہزار روپے ادا کیے تب جان چھوٹی۔

1798 تک شہر قدیم سردار لہنا سنگھ، سردار گوجر سنگھ اور سردار سوبھا سنگھ کے قبضہ میں تین حصوں میں منقسم تھا۔ رعایا ان تین سرداروں کے ظلم و ستم کا شکار تھی شہر کا ایک حصہ آباد اور دو تہائی ویران پڑا تھا بیرونی نواحی آبادیاں پہلے ہی تہس نہس ہو چکی تھیں۔ مہاراجہ رنجیت سنگھ کے قبضہ کے بعد سکھ عہد حکومت کا زریں دور شروع ہوا۔ لوگ دوبارہ شہر میں آ کر آباد ہونے لگے۔ رنجیت سنگھ نے شہر کی آباد کاری کی طرف خصوصی توجہ دی اور تعمیر و توسیع کا کام شروع ہوا۔ مہاراجہ نے ذاتی طور پر شہر کے گرد دوہری فصیل بنوائی، دوہرے دروازے بنوائے' دفاعی نظام کو موثر بنانے کیلئے دونوں فصیلوں کے درمیاں گہری چوڑی خندق کھدوائی یوں لوگوں میں قدرے سکھ اور تحفظ کا احساس پیدا ہوا۔

سکھ عہد مجموعی طور پر عدم تحفظ اور غارت گری کا عہد تھا۔ ان آٹھ دہائیوں میں اندرونی

شہر گلیاں بازار کوچے و محلے انتہائی گندے تھے جہاں کوڑا کرکٹ کے انبار پڑے بدبو پھیلاتے رہتے اگر کوئی جانور مرجاتا تو کئی کئی مہینے تک اس کا مردہ جسم پڑا گلتا سڑتا رہتا' گلیوں اور بازاروں میں کیچڑ اور جگہ جگہ گندا پانی سڑانڈ دیتا رہتا، البتہ جب خوب کھل کر بارش ہوتی تو گلیوں کا یہ گند بلا صاف ہوجاتا۔ کنہیالال نے لکھا ہے "چونکہ بازاروں میں گھوڑے اور ہاتھی امراء کی سواریوں کے بکثرت چلتے تھے ان کے سم جب موریوں میں پڑتے تو اتنی چھینٹیں اڑتی تھیں کہ لوگوں کے کپڑے رنگین ہوجاتے"

کنہیالال ہندی نے شہر قدیم کے اندر حویلیوں کی کل تعداد چونسٹھ بتائی ہے جن میں آج سوائے چند ایک کے' باقی سب دست برد زمانہ کا شکار ہوچکی ہیں۔ان حویلیوں کو دو گروہوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔اولین وہ حویلیاں ہیں جو عہد مغلیہ کی یادگار تھیں مگر "جہاں ہے جیسے ہے" کی بنیاد پر سکھوں کے قبضہ میں آئیں۔دوسرے حصے میں ان حویلیوں کا تذکرہ ہوگا جو عہد سکھی میں ہی تعمیر ہوئیں اور ان کے معماروں نے حسب توفیق ان کے ظاہری خدوخال میں سکھ عہد کا تشخص اجاگر کرنے کی کمزور سی سعی کی۔

نواب سعد اللہ خان شاہ جہاں کا وزیر تھا اس نے اپنی رہائش کیلئے حویلی میاں خاں تعمیر کی جس کے تین درجے تھے ایک حویلی زنانہ' دوسری مردانہ جس کو رنگ محل بھی کہتے تھے اور تیسرا قلعی خانہ۔کنہیالال لکھتے ہیں

"جب یہاں سکھا شاہی زمانہ آیا اور اس حویلی کے وارث جا بجا نکل گئے تو لوگوں نے اسے گرانا شروع کردیا۔جس کے ہاتھ میں کوئی عمارت آگئی' گرا کرلے گیا۔مہاراجہ رنجیت سنگھ کی عملداری میں وارث اس حویلی کے آموجود ہوئے اور انہوں نے لاکھوں روپے کی عمارت کو کوڑیوں کے بھاؤ فروخت کیا۔زمین تو دو دو اور چار چار اور چار چار پانچ پانچ منڈلہ اور آنے گز والا عمارت فروخت کی جن کا دو دو تین تین گز آثار تھا۔اس بے رحمی کے ساتھ مال مفت دل بے رحم اس حویلی کو وارثان سنگ دل نے ضائع کردیا۔چار سنگین سرخ پتھر کے دالان مع ستونوں اور مرغولوں وغیرہ کے جن کا ارتفاع پانچ پانچ گز بلند تھا' میر نورالدین وارث نے میر عبدالرحمٰن کے پاس فروخت کرڈالے اور وہ اب تک اسکی حویلی میں' جو اسی حویلی کے اندر بنی ہوئی ہے' موجود ہیں" (صفحہ 363)

نواب سعد اللہ خان کی دوسری حویلی "پتھراں والی حویلی" کے نام سے مشہور ہے کہ اس حویلی میں کالا پتھر لگا ہوا تھا۔ یہ حویلی موچی دروازے کے قریب واقع ہے۔ کنہیا لال لکھتے ہیں مہاراجہ رنجیت سنگھ نے بارود کا کارخانہ اس میں جاری کیا۔ کئی من بارود اس میں ہر وقت بھری رہتی ایک صبح آگ لگی گئی ایسا دھماکہ ہوا کہ کئی کہنہ مکانات گر گئے اس حویلی کی دیواریں اور پتھر ہوا میں اڑ کر پانچ پانچ کوس تک باہر جا پڑے۔ اس حویلی کی سلیں جس مکان پر جا کر پڑیں، مسمار کر دیا۔ قریب دو سو آدمی کی جانیں تلف ہوئیں چند سال یہ حویلی کھنڈرات کی حالت میں رہی پھر عام لوگوں نے اس زمین پر آبادی کر لی۔"

"مبارک حویلی" جو تین بھائیوں میر بہادر علی، میر نادر علی اور میر بابر علی نے تعمیر کروائی تھی، سکھ عہد کے آخری سالوں میں سردار کہر سنگھ سندھانوالیہ کے زیر تصرف آ گئی اس دوران اس کی عمارات میں بے شمار تغیر و تبدل کیا گیا۔ مشرق کی طرف بڑا دروازہ نکالا گیا۔ بڑے بڑے دالان و صحن و عمارات جدید بنوائی گئیں۔

وزیر خان نے شاہ عالمی دروازے کے اندر پری محل کے نام سے ایک حویلی تعمیر کروائی۔ اس کے دو درجے تھے ایک زنانہ اور دوسرا مردانہ۔ سکھ عہد کے اولین دور میں پہلے تو تین سکھ سرداروں نے اس کے پتھر نکلوائے اور فروخت کیے۔ جب مہاراجہ رنجیت سنگھ کا دور آیا تو اس نے اس حویلی میں فوج اور گولہ بارود رکھا۔ اس کی بڑی بڑی عمارات گرا کر کھلا میدان بنا دیا گیا۔ انگریزی عہد میں محمد سلطان ٹھیکیدار نے اسکو خرید کر یہاں سے اینٹیں نکلوائیں اور پھر لنڈا بازار و سرائے کی عمارات تعمیر کروائیں۔

حویلی کلو بائی المشہور حویلی اہلووالیہ جو یکی دروازے کے اندر واقع ہے، نواب زکریا خان نے اپنی پسندیدہ مغنیہ کے لئے تعمیر کی۔ مہاراجہ رنجیت سنگھ نے اس کے وارثوں سے یہ حویلی چھین کر سردار فتح سنگھ اہلووالیہ رئیس کپورتھلہ کو دے دی۔

قدیم عمارات میں ایک "اندھی حویلی" ہے چونکہ اس کی مسقف ڈیوڑھی میں بہت اندھیرا رہتا تھا، اسلئے اندھی حویلی کے نام سے مشہور ہوئی۔ شاہجہاں کے عہد میں نواب وزیر خان کی نظامت کے وقت یہ حویلی ایک امیر ہندو نے تعمیر کروائی۔ سکھ عہد کی غارت گری کے وقت اسکے وارث حویلی سے نکل گئے۔ لاہور شہر جب تین سرداروں کے قبضہ میں تھا آرائیں خاندان

کے تیس افراد اس حویلی پر متمکن ہو گئے۔ کنہیا لال نے لکھا ہے "مہاراجہ رنجیت سنگھ کے وقت بھائی مہان سنگھ نے چاہا کہ باغبانوں کو نکال دیوے مگر آرائیں نہ نکلے اور مقدمہ مدت تک ہوتا رہا آخر آرائیں مغلوب ہوئے اور جزوی کرایہ حویلی کا بھائی مہان سنگھ کو دینا انہوں نے قبول کیا کوئی دو روپئے کوئی تین روپئے کوئی چار روپے سال کرایہ دیتا تھا"

نواب زکریا خان کے عہد میں میر جواد نے حویلی میر جواد دہلی دروازے میں تعمیر کروائی مہاراجہ رنجیت سنگھ نے پنڈت گنگا رام کو یہ حویلی دی جو اس کا مالیاتی امور کا وزیر تھا۔ اسکی وفات کے بعد دیوان اجودھیا پرشاد کا بیٹا یہاں رہنے لگا اس نے کئی عمارات کا اضافہ کیا اس کے مرنے کے بعد دیوان بیج ناتھ کا بیٹا اس حویلی پر قابض ہو گیا۔

مغل عہد کے آخری فرمانروا محمد شاہ (48-1719) کے عہد میں دیوان جسپت رائے اور دیوان لاکھ پت رائے نے اپنی حویلیاں شاہ عالمی دروازے کے اندر تعمیر کروائیں۔ مہاراجہ رنجیت سنگھ نے یہ حویلیاں ملتان کے نواب سرفراز خان کو رہائش کے لئے دے دیں۔ ان حویلیوں سے ملحقہ طویلہ کا نصف حصہ خرید کر کنہیا لال نے اپنی رہائش کے لئے حویلی بنوائی۔ شہر قدیم کے وسطی حصہ چوک رنگ محل کے نزدیک چوک ڈبی اور موتی بازار کے درمیان میں کابلی مل نے اپنی حویلی تعمیر کی جو اس وقت (67-1763) لاہور کا گورنر تھا۔ مغل عہد کے آخری سالوں میں شہر قدیم کے نواح بیگم پورہ میں بے شمار حویلیاں امرائے و رؤسائے شہر نے تعمیر کروائیں۔ "عمل صالح" کے خالق صالح محمد کنبوہ نے موچی دروازے کے اندر مسجد کنبوہ بنوائی اور اس سے ملحقہ اپنی حویلی بھی تعمیر کی۔ یمین الدولہ آصف خان جو شاہ جہاں کا سسر بھی تھا، نے اپنے عہد حکومت میں پرانے نخاس خانے کے مشرق میں اونچی حویلی تعمیر کی۔

رنجیت سنگھ نے جب 1798ء میں تین سکھ سرداروں سے شہر قدیم چھینا تو ایک مرتبہ پھر لوگ شہر قدیم میں آ کر آباد ہونے لگے، اور شہر قدیم کی حیثیت بحال ہوئی، امن و سکوں ہوا اور رعایا کو سکھ چین نصیب ہوا۔ رنجیت سنگھ کے عہد کی چار دہائیوں میں تینوں مذاہب کی مذہبی عمارات مساجد، مندر اور گوردوارے کی تعمیر ہوتی رہی اور امرائے سلطنت نے اپنی رہائش کیلئے حویلیوں کی تعمیر کی۔

رنجیت سنگھ کے عہد میں لوہاری دروازے کے اندر مہاراجہ کھڑک سنگھ نے حویلی تعمیر کی

اس کے ایک طرف کونے میں مسجد تھی، کھڑک سنگھ نے اپنی حویلی کی عمارت میں خم ڈال لیا مگر مسجد کو نہ گرایا بلکہ جب تک زندہ رہا امام مسجد کیلئے دس روپے ماہوار وظیفہ مقرر کئے رکھا انگریزی عہد میں سرکار نے حویلی کو گرا کر اینٹیں اور پتھر فروخت کر ڈالا۔

مہاراجہ کھڑک سنگھ کے فرزند کنور نونہال سنگھ نے موری دروازے کے قریب اپنی حویلی تعمیر کروائی جس میں بڑے بڑے دالان، شہ نشین، تہہ خانے اور بالا خانے بنائے گئے۔ چھتوں پر طلائی اور شیشے کا کام کروایا۔ بوقت تعمیر حویلی کی وسعت کیلئے رعایا کے مکانات زبردستی لے لئے گئے۔

مستی دروازے کے اندر جہاں چونا منڈی ہے، جمعدار خوشحال سنگھ نے رنجیت سنگھ کے عہد میں بہت وسیع و بلند بالا حویلی تعمیر کروائی بقول کنہیا لال ''تعمیر کے وقت رعایا کے مکانات مفت چھین لئے''۔ اس حویلی کی جنوبی و غربی دیواریں اسقدر بلند اور مضبوط بنائی گئی ہیں بقول کنہیا لال ''گویا قلعہ لاہور کے سامنے دوسرا قلعہ بنا ہوا ہے۔''

حویلی خوشحال سنگھ سے ملحقہ جمعدار خوشحال سنگھ کے بھتیجے راجہ تیجا سنگھ نے اپنی بلند، کثیر منزلہ اور بیش قیمت حویلی تعمیر کی۔ حویلی آصف خان کی جگہ پر سردار سوچیت سنگھ نے اپنی حویلی از سر نو تعمیر کی اور طویلہ بنایا۔ وقوع اس حویلی کا وہی تھا جہاں آج کل تھانہ ٹبی ہے، کہتے ہیں اس حویلی میں معلق باغات بھی تھے۔

بھاٹی دروازے کے اندر بازار حکیماں میں فقیر خاندان کے تین بھائیوں سید عزیز الدین، سید نور الدین اور سید قمر الدین نے اپنی حویلی تعمیر کی۔ اس کے کچھ حصے میں آج کل فقیر خانہ میوزیم بنا دیا گیا ہے۔ سکھ عہد کے کشمیر کے گورنر نواب امام الدین خان نے لوہاری دروازے کے پاس ہی اپنی حویلی نواب امام دین تعمیر کی۔ دہلی دروازے کے اندر چوک وزیر خان کے قرب میں سکھ عہد میں حویلی راجہ ناتھ تعمیر کی گئی۔

سکھ عہد میں تعمیر کی جانے والی حویلیوں کے فن تعمیر کا اگر جائزہ لیا جائے تو کئی پہلو سامنے آتے ہیں اور ان حویلیوں کے فن تعمیر کی بنتی بگڑتی شناخت کے خدوخال واضح ہونے لگتے ہیں۔

ڈاکٹر سیف الرحمٰن ڈار نے لکھا ہے کہ یہ حویلیاں وقوع کے اعتبار سے یا تو قلعے کے

قریب ہیں یا پھران کی جائے تعمیر شہر پناہ کے دروازوں کے قرب میں ہے۔ امراء ورؤساء نے جو حویلیاں تعمیر کیں ان کا تسلسل بھی گھروں کی طرح تعمیر در تعمیر کے سلسلے سے جاملتا ہے۔ سکھ عہد میں امرائے سلطنت نے زیادہ تر لوگوں سے مکانات چھین کر ایک بڑا قطعہ اراضی تشکیل دیا اور پھر وہاں حویلی تعمیر کی۔ یہ الگ بات ہے کہ جب بیرونی حملہ آوروں کے خوف اور قتل وغارت گری سے، حویلی ویران ہوگئی تو نام نہاد لواحقین نے اونے پونے داموں مرلوں کے حساب سے حویلی کو بیچا اور یوں گزر بسر کی اور ایک حویلی کے دامن میں کئی چھوٹے چھوٹے مکانات تعمیر ہوئے اور یوں ایک بڑا یونٹ درجنوں چھوٹے چھوٹے یونٹ میں منقسم ہوگیا۔

اپنے مجموعی تناظر میں حویلی دراصل ایک مکھ والے چھوٹے گھر سے مشابہہ ہوتی ہے فرق صرف اسکیل کا ہوتا ہے۔ حویلی میں بڑا سا صحن یا باغ اور پھر اسکے چار اطراف کمروں کی تعمیر اور پھر ان کمروں کی تخصیص مردان خانہ' زنان خانہ وغیرہ کی جاتی ہے۔ سکھ عہد کی حویلیوں میں لکڑی کی چھتوں پر نقاشی' شیشے کا کام اور دیواروں پر تزئین و آرائش کے بہت اعلیٰ نمونے دیکھنے کو ملتے ہیں جو اپنی صناعی مہارت اور دلکشی میں اپنی مثال آپ ہیں۔ یہ دراصل انفرادی و ذاتی کوششوں کا حاصل ہیں ان میں کاریگروں کی دل جمعی اور مالکان کی ذاتی دلچسپی اور لگن دکھائی پڑتی ہے آج اتنی صدیاں گزرنے کے بعد بھی عہد کہنہ کی یہ یادگاریں اور عہد پارینہ کے یہ مٹتے ہوئے نقوش، بہت دلکش اور نظر گرفتہ ہیں۔

سکھ عہد میں تعمیر ہونے والی ان حویلیوں میں تہہ خانہ کی موجودگی ایک لازم جزو کے طور پر ہے۔ یہ تہہ خانے جہاں اثاثے نقدی وزیور وغیرہ کے لئے محفوظ جگہیں تھیں وہاں ان کا کردار پناہ گاہ کا بھی تھا۔ بیرونی حملہ آوروں اور سکھوں کی قتل وغارت گری اور لوٹ مار سے بچنے کے لئے یہ تہہ خانے بہت محفوظ جگہیں رہی ہیں۔

حویلیوں کے روکار کے مجموعی تناسب میں ہمیں ایکسز عمارت کے درمیانی حصہ میں نظر نہیں آتا بلکہ ایک رخ کے روکار میں کئی ایکسز نظر آتے ہیں۔ درمیانی حصے میں بالکونی یا جھروکا اور پھر اس کے دائیں بائیں قدرے چھوٹی کھڑکیاں گلیوں کے منظر نامے میں تعمیر و توسیع کی چغلی کھاتی ہیں۔ گویا جمالیات جزوی سطح پر موجود ہے' عمارت کا روکار کلی سطح پر اس سے تہی ہے۔ حویلیوں میں مہمان خانہ' مردان خانہ' زنان خانہ اور فیل خانہ وغیرہ کی واضح تقسیم ان کی سرگرمیوں کو

ایک دوسرے سے قطعی الگ کر دیتی ہے۔

حویلیوں کے داخلی دروازوں کی اونچائی کا پیمانہ ہاتھی کو بنایا گیا ہے جبکہ ان داخلی دروازوں سے ملحقہ زیریں اور بالائی منزلوں پر مہمان خانے تعمیر کیے گئے۔ اس کے بعد صحن اور پھر صحن کے بقیہ تین اطراف رہائش کے لئے عمارات تعمیر کی گئیں۔ سکھ عہد کی حویلیاں ماسٹر پلان میں مربع یا مستطیل رقبہ پر مشتمل نہیں ہیں۔ حویلیوں کی تعمیر میں پرانی اینٹوں کا استعمال بکثرت نظر آتا ہے یہ اینٹیں اپنی ساخت' سائز اور ہیت کے اعتبار سے کئی اقسام کی ہیں۔ عمارتوں کی تزئین و آرائش اور چھتوں کی نقاشی میں جہاں انفرادی ہنر کاری نظر آتی ہے وہاں مجموعی تناظر میں کوئی ایسی قابل قدر جمالیات نہیں بنتی۔

سکھ عہد کی ان حویلیوں کی چار دیواریاں بہت مضبوط قلعہ نما اور بہت بلند ہوتی تھیں جس کا مقصد بیرونی حملہ آوروں کے خلاف دفاعی نظام کو مضبوط بنانا تھا۔ گویا یہ حویلیاں چھوٹے چھوٹے قلعے تھے۔

یہ حویلیاں تعمیر و توسیع کا مرکب تھیں۔ یہی وجہ ہے کہ مجموعی فن تعمیرات میں واحدنیت اور ہم جنسیت نظر نہیں آتی۔ جس کی وجہ سے ہم عمارت کو ایک ہی عہد کی تعمیر قرار دے سکیں۔ تعمیر میں زیادہ تر چھوٹی اینٹ کا استعمال ہی نظر آتا ہے۔

سکھ دور دراصل اندرونی و بیرونی خلفشاروں کا دور تھا اور جس طرح لوٹ مار اور ڈاکہ زنی کو سکھ سرداروں نے باقاعدہ پیشے کے طور پر اپنا لیا تھا' اس افراتفری اور لوٹ مار کے دور میں تعمیر کی جانے والی عمارتوں میں بھی یہ اکھڑا پن جھلکتا ہے۔ سکھ عہد کی عمارتیں اپنی شکل وشباہت اور تناسب کے اعتبار سے اگر اپنی الگ شناخت رکھتی ہیں تو صرف یہ کہ ان کی کوئی قابل قدر شناخت نہیں ہے۔ بیرن چارلس ہیوگل نے اپنی کتاب 'سیاحت نامہ کشمیر و پنجاب' کے صفحہ 355 پر رنجیت سنگھ کے تعمیراتی ذوق کے حوالے سے کیا خوب لکھا ہے

''رنجیت سنگھ نے ان میں کئی اور عمارتوں کا اضافہ تو ضرور کیا ہے جو اپنے غیر معمولی ہونے میں یا ان پر گرانقدر رقم صرف کرنے میں تو کسی طرح کم نہیں لیکن ان میں بدذوقی نمایاں ہے ان جدید وقتوں کی بے ربط سی عمارتوں کا اگر ان محلات سے موازنہ کیا جائے تو ہم پر اس کا پس منظر عیاں ہو جائے گا کہ یہ سب اس شخص کی پسند کے مطابق ہیں جو کسی ذوق کی تربیت کے بغیر

یک لخت ملک پر قابض ہو گیا ہو۔"

1849ء میں برطانوی تسلط کا باقاعدہ آغاز ہوا۔ ہیرا منڈی میں واقع حویلی دھیان سنگھ کو آرٹلری کے افسروں کی رہائش کے لئے مختص کر دیا گیا۔ حویلی خوشحال سنگھ کو قلعہ کا حصہ قرار دیتے ہوئے محل قرار دے دیا گیا جہاں آرمی کے جوانوں کا داخلہ ممنوع تھا۔ موری دروازے کے اندر واقع حویلی نونہال سنگھ کو بھی افسروں کی رہائش کے لئے استعمال کیا گیا۔ اورینٹل کالج کا قیام پہلے پہل حویلی دھیان سنگھ میں ہی عمل میں آیا۔ کچھ عرصے کے بعد اورینٹل کالج کے لئے کھڑک سنگھ کی حویلی بھی حاصل کر لی گئی جو لوہاری دروازے کے اندر واقع تھی۔ 1872ء میں گورنمنٹ کالج کی ابتدائی جماعتیں حویلی دھیان سنگھ میں ہی شروع ہوئیں۔

ملتان اور سکھ

عمر کمال خان ایڈووکیٹ

باباگورو نانک اور ملتان (1)

باباگورو نانک نے اپنی زندگی کے 22 سال سفر میں گزارے ان سفروں کا حال جنم ساکھی میں محفوظ ہے صرف سال کا اندازہ نہیں ہوتا۔ چنانچہ جنم ساکھی کے مطابق بابا گورو نانک دو مرتبہ ملتان تشریف لائے پہلی مرتبہ گورو نانک لودھیوں کے آخری دور حکومت میں ملتان سے گزرے۔ اس سفر کی ابتداء میں بابر بادشاہ سے ان کی ملاقات بھی ہوئی بابر نے ابھی لودھیوں کو شکست نہ دی تھی۔ بابر سے ملاقات اور دلچسپ مکالمہ کے بعد وہ سیالکوٹ تشریف لے گئے اور واپسی پر وہ جنوبی پنجاب کے سفر پر روانہ ہوئے وہ دیپالپور سے پاک پٹن وہاں سے ستلج عبور کر کے چشتیاں صاحب کے مزار پر گئے واپس ستلج عبور کر کے ملتان تشریف لائے۔ ملتان میں ان کی سرگرمیوں کی تفصیل نہیں ہے ملتان سے وہ کوٹ مٹھن گئے وہاں مسالم عالم بیان مٹھا کے ساتھ ان کا مکالمہ محفوظ ہے وہاں سے واپس ملتان آئے اور دیوان چاؤلی مشائخ واقعہ چک نمبر 317 تحصیل وہاڑی تشریف لے گئے وہاں جن اشخاص سے ان کا مکالمہ ہوا وہ بھی جنم ساکھی میں محفوظ ہے وہاں سے وہ لاہور تشریف لے گئے۔

دوسری مرتبہ باباگورو نانک حج بیت اللہ سے واپس آتے ہوئے ملتان تشریف لائے اور یہاں کی ایک خانقاہ کے سجادہ نشین سے جو ان کا مکالمہ ہوا تھا وہ جنم ساکھی میں محفوظ ہے۔ ملتان میں کچھ روز قیام کرنے کے بعد گورو صاحب کرتار پور واپس چلے گئے۔

پنجاب میں سکھ گردی

مغلوں کے آخری دور میں جہاں مغلوں کی ریاست کا نظام زوال پذیر تھا وہاں پنجاب کے معاشرتی حالات بھی دگرگوں تھے اس دور میں سکھوں کے مغل حکمرانوں کے ساتھ تنازعات پیدا ہو گئے تھے۔ ان تنازعات کو گورو گوبند سنگھ کی شہادت کے بعد بندہ بیراگی نے حکومت دشمنی سے مسلم دشمنی میں تبدیل کر دیا گیا۔ جو کہ سکھ گوروؤں کا مقصد نہ تھا۔ نہ ہی سکھ گوروؤں نے لوٹ مار اور قتل عام کی اجازت دی تھی۔ بندہ بیراگی کی مسلم دشمنی کے زیر اثر گرنتھیوں نے گورو گرنتھ صاحب میں تحریف کر کے مسلمانوں کے خلاف پر از نفرت اشلوک شامل کر کے سکھ مسلمان دائمی خلیج قائم کر دی بندہ بیراگی نے سکھ جو ایک محنت کش عبادت گزار اور خدا پرست قوم تھی' کو لوٹ مار ظلم و تعدی اور بدامنی کا راہ دکھا کر پنجاب میں بدامنی اور لوٹ مار کا دور دورہ قائم کر دیا جس کی وجہ سے زراعت تباہ ہو گئی سکھوں کے لئے روزگار کا ذریعہ صرف اور صرف لوٹ مار باقی رہ گیا۔ چنانچہ پنجاب 1700ء سے لے کر 1800ء تک یعنی ابتداء حکمرانی مہاراجہ رنجیت سنگھ تک سکھ گردی اور بدامنی کا شکار رہا۔

ملتان کا پہلا معروف سکھ خاندان

تذکرۃ الملوک عالی شان مصنفہ علی محمد خان خرکہ سدوزئی کے مطابق ولومل کھتری اول سلطان حیات سدوزئی اور اس کے بیٹے باقر خان کی جائیداد کا منشی تھا 60 روپے ماہوار تنخواہ پاتا تھا اس کے بڑا بیٹا کوڑا مل نے باقر خان کے ڈیرہ پر پرورش پائی خواندہ لائق باہوش صاحب تمکین نوجوان تھا اس کی تنخواہ پندرہ روپے ماہوار تھی۔ جب نواب عبدالصمد خان دلیر جنگ گورنر ملتان مقرر ہوا تو اس نے باقر خان ملتانی سے کوڑا مل کو اپنے لئے مانگ لیا اور وہ اس کا ملازم ہو گیا اور حکومت لاہور کا ملازم ہو جانے کے بعد اس نے دن دونی ترقی کی۔ شاہنواز خان سدوزئی کی صوبہ داری میں وہ عہدہ [illegible] پر متمکن تھا۔ بعدازاں نواب معین الملک کے دور میں اسے مہاراجہ بہادر کا خطاب بھی ملا۔ نواب معین الملک کا بے حد چہیتا تھا جس کی وجہ سے ادینہ بیگ خان اور دیگر مغل سردار اس سے حسد کرتے تھے اور اس کے مخالف تھے۔ اس مہاراجہ کوڑا مل ملتانی نے

جوانی میں پہل لے کر سکھ مت اختیار کر لیا۔ تذکروں کی رو سے مہاراجہ کوڑا مل ملتانی معروف پہلا ملتانی سکھ تھا۔ (2)

پہلا سکھ گورنر ملتان

جیسا کہ پہلے ذکر ہوا ہے کہ مہاراجہ کوڑا مل جوانی میں سکھ مت اختیار کر چکا تھا بلکہ سکھ مت سے اس کا تعلق اس قدر گہرا تھا کہ وہ نہ صرف اپنی آمدنی میں سے دسواں حصہ گورو کے لئے نکالتا تھا بلکہ وہ چونکہ حقہ کا رسیا تھا۔ سکھ مت میں تمباکو نوشی ممنوع ہے اس لئے علاوہ آمدنی کے دسویں حصہ کے تمباکو نوشی کی پاداش میں روزانہ 5 روپے سکھ پنتھ کو جرمانہ دیتا تھا۔ (3)

جب سال 1747ء میں احمد شاہ درانی نے سلطنت افغانستان قائم کی تو احمد شاہ درانی کا ایک رشتہ دار نواب زاہد خان ملتان کا صوبہ دار تھا۔ چنانچہ مغل حکومت نے ملتان جیسے اہم صوبہ کا اقتدار ایک افغان کے ہاتھ میں مصلحت کے خلاف سمجھتے ہوئے زاہد خان سدوزئی کو صوبہ داری ملتان سے برطرف کر کے مہاراجہ کوڑا مل ملتانی جو جیسا پہلے ذکر ہوا ہے سکھ مت اختیار کر چکا تھا کو مہاراجہ کا خطاب اور ہاتھی' مراتب دے کر گورنر ملتان مقرر کر دیا۔ مہاراجہ کوڑا مل پہلا سکھ گورنر ملتان ہے یہ واقعہ سال 1749ء کا ہے۔

ملتان پر پہلا سکھ حملہ

سلطان حیات خان سدوزئی سال 1682ء میں شہر قندھار میں کئی سال حکمرانی کرنے کے بعد صفویوں سے نبرد آزما ہو کر اور شکست کھا کر کثیر زر و دولت کے ساتھ ملتان آیا اور ملتان میں اسے ایک باغ اور مسجد قائم کر کے اپنی اولاد اور متولین کے ساتھ موجودہ ڈپٹی کمشنر ہاؤس کے قریب رہائش اختیار کر لی۔ اس کے بعد اس کے بیٹے شاہ عبداللہ خان۔ خان محمد شاہ۔ سلطان الریار خان ہرات میں حکمرانی کر کے مال و دولت کے ساتھ ملتان میں آ کر پناہ گیر ہی ہوئے اور کڑی سلطان حیات خان میں بے پناہ مال و دولت کے ساتھ رہائش پذیر رہے اور وہ امن امان سے اور فارغ البالی سے وقت سیر کر رہے

تھے تاآنکہ 1752ء میں ملتان احمد شاہ درانی کی سلطنت کا حصہ بن گیا اور اس نے ملتان کے انتظام کے لئے علی محمد خان موگانی کو گورنر مقرر کر دیا۔ سلطان حیات خان اور اس کے خاندان کو ملتان میں آئے ہوئے اندازاً بیاسی سال ہو گئے تھے اور کسی نے ان کا بال بیکا نہ کیا تھا۔ اور وہ عیش کی زندگی بسر کر رہے تھے کہ ناگہاں 11 رمضان المبارک 1178ھ مطابق 29 مارچ 1764ء کو ملتان میں ایک غلغلہ بلند ہوا کہ سکھ لشکر لے کر ملتان کی طرف بڑھے آتے ہیں۔ علی محمد خان موگانی گورنر ملتان نے شہر اور قلعہ کے باہر تمام امراء اور خواص کو پیغام بھیجا کہ وہ خود اور اپنا قیمتی سامان لے کر قلعہ ملتان میں پناہ لے لیں۔ سلطان حیات خان سدوزئی کی اولاد نے شبہ کیا کہ گورنر ہمیں قلعہ میں بلا کر لوٹنا چاہتا ہے چنانچہ وہ اپنی کڑی میں بیٹھے رہے۔ ان کا اس وقت کا سردار محمد شریف خان پوتا سلطان حیات خان تھا۔

اسی اثناء میں سکھ جو بھنگی مثل سے تعلق رکھتے تھے بڑھتے ہوئے سیدھے بغیر کسی جگہ لڑے سیدھے کڑی سلطان حیات کے سامنے آ گئے اور لڑائی مختصر کر لی۔ محمد شریف خان نے اپنی عورتوں کو بھاگم بھاگ قلعہ ملتان میں بھیج دیا اور خود اپنے اردگرد کے رشتہ داروں کو اکٹھا کر کے کڑی سلطان حیات کی حفاظت میں مرنے کے لئے تیار ہو گیا کڑی سلطان حیات 8 فٹ کی دیوار سے محدود تھی اور اس کے چار کونوں پر حفاظتی برج اور ایک بڑا دروازہ جس کے دونوں طرف دو برج تھے۔ یہ اس کڑی کی کل کائنات تھی۔ شریف خان خرکہ سدوزئی اس کے بیٹوں بھتیجوں اور رشتہ داروں اور ملازمین کی تعداد 60 افراد سے زیادہ نہ تھی 9 گھنٹہ مقابلہ اور محاصرہ کے بعد ان میں سے کافی شہید ہو گئے شریف خان اٹھارہ زخم کھا کر گر پڑا اور سکھوں کی قید میں چلا گیا سکھوں نے کڑی سلطان حیات کو لوٹ کر آگ لگا دی اور وہ اس کڑی میں سے پچاسی لاکھ روپیہ کی نقد و جنس لوٹ کر ملتان کی کسی دیگر بستی کو نقصان پہنچائے بغیر شریف خان آ گئے اور بھتیجوں کو قید کر کے واپس لاہور چلے گئے۔ اس سکھ پہلے حملہ ملتان کا بالتفصیل دیگر صرف علی محمد خان خرکہ سدوزئی نے اپنی تصنیف تذکرۃ الملوک عالی شان میں کیا ہے۔ ہری رام گپتا نے بحوالہ محمد مظفر جنگ نامہ بھی اس کا ذکر مختصراً کیا

ہے لیکن کسی دیگر معاصر مورخ نے اس سکھ حملہ ملتان کا ذکر نہیں کیا۔

سکھوں اور جنوبی پنجاب کے حکمرانوں کے مابین پہلا تصادم اور معاہدہ حد بندی

سکھوں کی بھنگی مثل نے سال 1764ء میں ملتان پر اپنے پہلے حملہ میں جنوبی پنجاب کا راستہ دیکھ لیا تھا۔ محرم سال 1181ھ مطابق مئی 1767ء احمد شاہ درانی ہندوستان پر اپنے آٹھویں حملے کے بعد ملتان آیا اسے اپنے گورنر ملتان علی محمد خان جوگانی کو برطرف کر کے قتل کرا دیا اور اس کی بجائے نواب شجاع خان سدوزئی کو گورنر ملتان مقرر کر کے واپس افغانستان چلا گیا جیسے ہی احمد شاہ درانی افغانستان پہنچا اور نواب شجاع خان سدوزئی نے اپنے قدم ملتان میں جمائے کہ بھنگی مثل کا سربراہ سردار جھنڈا سنگھ اور اس کا بھائی گنڈا سنگھ سکھوں کے کثیر لشکر کی قیادت کرتے ہوئے ملتان کی طرف بڑھے۔ نواب شجاع خان کو پتہ تھا کہ افغانستان سے کمک آتے آتے کافی وقت لگے گا اس لئے اس نے نواب بہاولپور داؤد پوترہ جس کے ساتھ اس کے برادرانہ مراسم تھے کو اپنی مدد کے لئے بلایا اور سکھوں کے خلاف مشترکہ مقابلہ کرنے کے لئے اس کو آمادہ کر لیا۔ جس پر نواب شجاع خان اور نواب بہاولپور کا مشترکہ لشکر سکھوں کو اثناء راہ میں روکنے کے لئے پاکپتن پہنچ گیا۔ دونوں لشکر آمنے سامنے دو ماہ پڑے رہے کچھ عرصہ گفت شنید بھی ہوئی لیکن صلح میں کامیابی نہ ہوئی۔ آخرکار ایک روز دونوں لشکروں کے مابین دریائے ستلج کے کنارے خونریز تصادم ہوا لیکن جنگ فیصلہ کن نہ ہو سکی آخرکار دوبارہ گفتگو شروع ہوئی اور یہ طے پایا کہ سکھ آئندہ پاکپتن کے ادھر آگے نہ آئیں گے پاک پتن کی زیارت کر سکیں گے۔ اس معاہدہ کو معاہدہ ثلاثہ کہا جاتا ہے جس میں جنوبی پنجاب کی حد بندی ہو گئی۔ یہ معاہدہ چار سال تک قائم رہا۔ علی الدین کے مطابق یہ جنگ ملتان کے قریب ہوئی۔

ملتان میں پہلی حکومت ___ 1772ء تا فروری 1780ء

1769ء یعنی رمضان المبارک 1182ھ میں احمد شاہ درانی ہندوستان پر اپنے آخری

10 ویں حملے کے بعد ولایت افغانستان چلے گئے اس وقت ان کی صحت جواب دے چکی تھی اب وہ جسمانی طور پر ہندوستان میں مہم جوئی کے قابل نہ رہے تھے جس پر سال 1184ھ مطابق 1771ء کو سکھوں کی بھنگی مثل نے معاہدہ ثلاثہ سال 1767ء کی خلاف ورزی کرتے ہوئے ملتان پر حملہ کر دیا نواب شجاع خان سدوزئی سکھوں کا کھلے میدان میں مقابلہ نہ کر سکتا تھا اس لئے قلعہ ملتان میں قلعہ بند ہو گیا محاصرہ چالیس روز رہا اسی اثناء میں افغان بادشاہ نے سکھوں کی تادیب کے لئے سردار جہان خان کو ایک مضبوط لشکر کے ساتھ ملتان روانہ کیا۔ بھنگی مثل کے سکھوں نے جیسے ہی افغان لشکر کی آمد کے متعلق سنا محاصرہ اٹھا کر واپس چلے گئے۔ اگست 1772ء مطابق جمادی الثانی 1186ھ احمد شاہ درانی ٹوبہ معروف نزد قندھار اس جہان سے عالم عقبیٰ کو سدھارے اور ان کی وفات کے بعد ان کا ولی عہد تیمور شاہ درانی تخت افغانستان پر جلوہ افروز ہوا۔ تیمور شاہ درانی کے دور حکومت کے ابتدائی سال میں کابل میں بے حد افراتفری تھی اور بادشاہ اپنی حکومت کی ابتدائی مشکلات کی وجہ سے دلجمعی کے ساتھ حکومت نہ کر رہا تھا جس کا داؤ چلتا وہ کسی کو برطرف کرا کے سند گورنری حاصل کر لیتا چنانچہ محمد شریف خان سدوزئی بہادر خاں نے نواب شجاع خان سدوزئی کو برطرف کرا دیا۔ اور ابھی سال نہ گزرا تھا کہ دربار کابل میں محمد شریف خان سدوزئی بہادر خیل کے نمائندہ دھرم حسین نے کوشش کر کے اپنے آقا کو برطرف کرا دیا اور پٹہ گورنری ملتان اپنے نام حاصل کر لیا اور ملتان آ کر ملتان کی حکومت حاصل کرنے کے لئے اس نے شریف خان سے مطالبہ کیا۔ اس نے لیت و لعل کی اور کچھ روز چارج نہ دیا کہ اسی اثناء میں دھرم جو دیوان سیا رام کی حویلی میں ٹھہرا ہوا تھا حویلی کی بالائی منزل سے ناگہانی گولی کا نشانہ بن گیا۔ اور دربار کابل نے نیا گورنر ملتان شریف بیگ تکلو کو مقرر کر دیا۔ شریف بیگ تکلو نے نواب شجاع خان سدوزئی کی امداد سے ملتان پر قبضہ کر لیا لیکن شریف بیگ تکلو اور نواب شجاع خان میں آویزش شروع ہو گئی۔ اسی اثناء میں دربار کابل سے عبدالکریم خان بابنے زئی کو گورنر ملتان بنا دیا۔ شریف بیگ تکلو نے عبدالکریم خان بابنے زئی کو مار بھگایا جس پر دربار کابل سخت برافروختہ ہوا اور مودر خان اسحاق کو

افغان لشکر کے ساتھ شریف بیگ تکلو سے قبضہ ملتان لینے کے روانہ کیا شریف بیگ تکلو نے مقابلہ کی طاقت نہ دیکھ کر اخراجات مہم اور زر نذرانہ دینے کا وعدہ کر کے بھنگی مثل کے سکھوں کو لاہور سے اپنی مدد کے لئے بلایا۔ سکھوں نے لہنا سنگھ کی سرکردگی میں ایک سکھ لشکر ملتان روانہ کیا۔ سکھ لشکر کے آنے سے پہلے نواب شجاع خان تمام سرکردہ پٹھانوں کو لے کر ملتان سے نقل مکانی کر کے اپنے قلعہ جات سکندر آباد اور شجاع آباد چلا گیا جس پر سردار مرد خان ملتان کی مہم ترک کر کے افغانستان چلا گیا۔ سکھوں کی نیت خراب ہو گئی انہوں نے دیکھا کہ شریف بیگ تکلو اپنے بادشاہ کا باغی ہے ملتانی پٹھان اس کے مخالف ہیں اس کی طاقت صفر ہے کیوں نہ ملتان پر قبضہ کر لیں چنانچہ انہوں نے کئی حیلے کئے لیکن شریف بیگ تکلو ان کو قلعہ کے نزدیک نہ پھٹکنے دیتا تھا۔ انہی دنوں دیوالی کی تقریب پر سکھوں نے مطالبہ کیا کہ انہیں قلعہ میں پرہلاد بھگت کے مندر کی زیارت کرنے دی جائے۔ خود ہی انہوں نے شریف بیگ تکلو کا خوف دور کرنے کے لئے تجویز پیش کی کہ سکھ ساٹھ ساٹھ کے جتھوں میں زیارت کے لئے قلعہ میں داخل ہوں گے۔ چنانچہ شریف بیگ سکھوں کو اس تجویز کے مطابق مندر کی زیارت کے لئے آمادہ ہو گیا داخلے کے وقت تو ایک ایک سکھ کو گنتا تھا واپسی پر سکھ جوش سے ست سری اکال کے نعرے لگاتے ہوئے نکلتے تھے شریف بیگ بے پرواہ داخلے کی طرف متوجہ رہا سکھ ہر جتھہ میں سے کچھ مندر میں چھپ جاتے جب سکھ کافی تعداد میں مندر کے اندر پہنچ گئے تو وہ مندر سے باہر نکل کر قلعہ داروں پر حملہ آور ہوئے اور باہر والے سکھوں نے بھی زور سے حملہ کیا اور قلعہ کے دروازوں پر قبضہ کر لیا شریف بیگ تکلو اس نازک صورت حال میں جان بچا کر قلعہ سے بھاگ گیا۔ اور تلمہ چلا گیا۔ یہ قبضہ بروز عید یکم شوال 1186ھ مطابق 27 ستمبر 1772ء کو ہوا۔ قبضہ کے بعد سکھوں نے دیوان سنگھ چھاچھو والیہ کو ملتان کا کاردار مقرر کر دیا۔ جھنڈا سنگھ بھنگی ملتان کے ابتدائی انتظام کر کے شنبہ کی طرف روانہ ہوا جہاں شریف بیگ تکلو سکھوں کی آمد کا سن کر شنبہ خالی کر کے خیر پور داد یو ترہ چلا گیا اور گمنامی کی زندگی بسر کرنے کے بعد مر گیا۔

ملتان کی پہلی سکھ حکومت کا انتظامی ڈھانچہ

سکھوں کو ملتان کے طاقت کے توازن کا پورا ادراک تھا۔ ان کے مقبوضات میں بڑا جنگجو قبیلہ ملتانی پٹھان تھے جن کے ملتان کے نظم و نسق میں مغل حکومت کے آخری دور سے کافی مفادات وابستہ تھے وہ ان کے لئے متواتر تصادم کا باعث ہو سکتے تھے، وہ سکندر آباد اور شجاع آباد میں کافی تعداد میں اور ملتان کے گرد و نواح میں خاصے طاقتور تھے چنانچہ انہوں نے ایک مقامی پٹھان عبدالکریم خان بابر جو درانی دور میں ملتان کا فوجدار رہا تھا اور نظم و نسق کے قائم رکھنے کا وافر تجربہ رکھتا تھا کو ملتان کا فوجدار مقرر کر دیا اور اس کے ماتحت 500 سپاہی نظم و نسق کے سلسلہ میں مقرر کر دیئے۔ نظم و نسق کے مسئلہ سے بے فکر ہونے کے بعد جھنڈا سنگھ اور لہنا سنگھ نے اپنے مقبوضہ علاقے (شمال مغربی موضع ملتان) اپنے مابین تقسیم کر لئے۔ پھر دونوں نے اپنے اپنے حصے مختلف لوگوں کو زر متاجری لے کر ٹھیکے پر دے دیئے اور براستہ جھنگ امرتسر چلے گئے۔ اور اپنی غیر حاضری میں دیوان سنگھ چھاچھو والیہ کو اپنا مختار مقرر کر گئے۔

سکھوں کے ملتان پر قبضہ کا سب سے زیادہ رنج نواب شجاع خان سدوزئی کو تھا اس نے شاہ کابل کی توجہ مبذول کرانے کے لئے ایک سفارت یار محمد خان ترینی کی سرکردگی میں روانہ کی لیکن یہ سفارت ناکام گئی۔ بعدازاں خود بھی سفر کابل اختیار کیا۔ جہاں شاہ کابل نے خود تو ملتان کی طرف آنے کی حامی نہ بھری لیکن بہاولپور کے نواب کو نواب شجاع خان کی امداد کرنے اور سکھوں کو ملتان سے نکالنے کا حکم دیا ابتداء 1777ء مطابق 1191ھ کو بہاول خان اور نواب مظفر خان پسر نواب شجاع خان کا متحدہ لشکر ملتان آیا اور ملتان کو محصور کر لیا دس روز کے بعد ملتان شہر فتح کر لیا لیکن قلعہ ملتان ابھی سکھوں کے قبضہ میں تھا ان دنوں سردار جھنڈا سنگھ قتل ہو چکا تھا بھنگی مثل کی سربراہی سردار گنڈا سنگھ کے کندھوں پر آ پڑی تھی جیسے ہی اسے ملتان کے محاصرہ کی اطلاع ملی وہ تیزی سے ملتان کی طرف بڑھا۔ متحدہ لشکر جو اٹھارہ روز سے ملتان شہر پر قابض تھے وہ سکھوں کے نئے لشکر کا مقابلہ نہ کر سکتا تھا افغانستان سے امداد کی امید نہ

تھی اس لئے انہوں نے ملتان سے پسپائی اختیار کی۔ سردار گنڈا سنگھ نے بڑی سختی سے متحدہ لشکر کا تعاقب کیا اور دریائے ستلج کے پار پہنچا کر اس نے دم لیا۔

سکھوں کا پہلا محاصرہ شجاع آباد

سردار گنڈا سنگھ نے دریائے ستلج سے واپسی پر فوراً" نواب شجاع خان کے مستر شجاع آباد کا محاصرہ کر لیا۔ نواب شجاع خان کابل سے امداد لینے کے لئے روانہ ہو گیا اور قلعہ کا انتظام اپنے بیٹے نواب مظفر خان کے سپرد کر گیا۔ کابل میں اس کی کوششیں بار آور نہ ہوئیں اور واپس آ کر نواب بہاولپور سے امداد کا خواہاں ہوا۔ سکھ جو تین ماہ تک شجاع آباد کا محاصرہ کئے ہوئے تھے کہ نواب شجاع کابل سے واپس آیا اور ادھر ادھر سے امدادی فوج اکٹھے کر کے بہاولپور کی فوج کو ساتھ لے کر شجاع آباد کی طرف بڑھا اور سکھوں کو پیچھے سے دبایا قلعہ سے نواب مظفر خان نے نکل کر حملہ کیا جس پر خونریز لڑائی کے بعد سکھ نقصان اٹھا کر ملتان واپس چلے گئے اب اتحادی لشکر واپس چلا گیا اور نواب شجاع خان سدوزئی چند ماہ بعد رجب 1191ھ مطابق اگست 1777ء کو فوت ہو گیا اس کا جانشین اس کا بیٹا مظفر خان سدوزئی ہوا۔

سکھوں کا دوسرا محاصرہ شجاع آباد اور شجاع آباد پر ان کا قبضہ

نواب شجاع خان کی وفات کی خبر سن کر نواب مظفر خان کو کمزور سمجھتے ہوئے نواب شجاع خان کے چالیسویں والے روز سامان قلعہ داری لے کر شجاع آباد کے قلعہ پر چڑھ دوڑے۔ نواب مظفر خان نے ایک ماہ تک سکھوں کا ڈٹ کر مقابلہ کیا۔ قلعہ سے باہر نکل کر سکھوں پر دھاوے کئے لیکن ان کو محاصرہ اٹھانے پر مجبور نہ کر سکا کابل سفارت بھیجی لیکن آئندہ امداد کے وعدہ پر ٹرخا دیا گیا۔ نواب بہاولپور بھی ادھر پھر نہ آیا طویل محاصرہ سے قلعہ میں فاقوں کی نوبت پڑ چکی تھی سکھ بھی طویل محاصرہ سے تنگ آ گئے تھے۔ گفت شنید ر معاہدہ صلح ہو گیا طے پایا کہ نواب مظفر خان اس کے اہل و عیال اور جو اس کے ساتھ جائیں جو کچھ اٹھا سکتے ہیں اور بار برداری کے جانوروں پر لاد کر بہاولپور یا جس طرف جائیں سکھ تعرض نہ کریں گے چنانچہ نواب مظفر خان اپنے حامیوں

کے ساتھ سامان اٹھا کر قلعہ شجاع آباد خالی کر کے حدود بہاولپور میں چلا گیا اور ابتداء اکتوبر 1777ء کو شجاع آباد پر ملتان کے سکھوں کے قبضہ کے بعد سکھوں نے سکھ کا سانس لیا۔ ان کے پہلو میں شجاع آباد کا جو کانٹا پھنسا ہوا تھا وہ نکل گیا۔ سدوزئی اور ان کے پٹھان حواری در بدر ہو گئے نواب مظفر خان کو نواب بہاولپور نے منہ نہ لگایا آخر کار وہ اوچ گیلانی کے مخدوم کے پاس پناہ گزین ہو گیا جسے اس کے خاندان ملازمین اور حوارین کی مدد معاش کا بندوبست کر دیا۔

تیمور شاہ کا ملتان کے سکھوں پر حملہ اور سکھوں کی پہلی حکومت ملتان کا خاتمہ

ابتداء سال 1780ء مطابق 1194ھ افغان بادشاہ براستہ پشاور ملتان کی طرف بڑھا راستے میں اس کے جرنیل زنگی خان نے سکھوں کو رہتاس کے قلعہ کے نزدیک شکست فاش دی۔ ملتان پہنچ کر پیدل فوج کو ملتان کے محاصرہ پر لگا کر خود براستہ دریائے ستلج بہاولپور کی حدود میں چلا گیا۔ ملتان کے سکھوں نے افغان بادشاہ کی آمد کی اطلاع اپنے سکھ قائدین سردار جسا سنگھ گوجر سنگھ کو دی اور فی الفور ملتان پہنچنے کی استدعا کی۔ افغان بادشاہ جب بہاولپور پہنچا تو نواب بہاولپور اپنے لشکر لے کر حاضر ہو گیا نواب مظفر خان بھی اوچ سے اپنے لشکر کو تیار کر کے بادشاہ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ اسی اثناء میں سکھ سردار جسا سنگھ گوجر سنگھ۔ حقیقت سنگھ لہنا سنگھ۔ بھنگا سنگھ پندرہ ہزار کار آزما سکھوں کا لشکر لے کر ملتان جانے کی بجائے شجاع آباع کی طرف بڑھے تاکہ افغان بادشاہ کو بہاولپور سے واپسی پر ملتان سے دور شجاع آباد کے قریب شکست دے دی جائے۔ جیسے ہی افغان بادشاہ کو سکھ لشکر کی شجاع آباد کے قریب پہنچنے کی اطلاع ملی وہ تیزی سے دریا ستلج عبور کر کے شجاع آباد پہنچے۔ جہاں سکھ لشکر مضبوط دفاعی پوزیشن لے کر صف آراء تھا۔ 8 فروری 1780ء مطابق 29 صفر 1194ھ کو علی الصبح افغان بادشاہ نے سکھ پوزیشن پر رسالہ سے حملہ کا آغاز کیا یہ خونریز لڑائی سارا دن جاری رہی غروب آفتاب سے کچھ وقت پہلے ایک شدید آندھی نے جنگ کے میدان کو تاریک کر دیا اور اسی اثناء میں

سکھوں کا نقار خانہ افغانوں کے ہاتھ لگا جو انہوں نے بجانا شروع کر دیا سکھوں نے غلط فہمی میں سمجھا کہ انہیں نقار خانہ کے گرد اکٹھا ہونے کا حکم دیا جا رہا ہے چنانچہ وہ اپنی قلعہ بندیوں سے نکل کر نقارہ خانہ کے گرد اکٹھے ہو گئے اور افغان کی خون آشام تلواروں کا شکار بن گئے سکھوں کو اپنی غلط فہمی کا احساس اس وقت ہوا جب پانی سر سے گزر گیا تھا وہ اپنی چار ہزار لاشیں چھوڑ کر ملتان کی بجائے لاہور کی طرف بھاگے۔ افغان بادشاہ نے ایک چابک سوار لشکر سکھوں کے تعاقب میں روانہ کیا جس نے لاہور سے چالیس مغرب میں سکھوں کو حجرہ شاہ مقیم کے قریب جا لیا اور سکھوں کو سخت جانی نقصان پہنچایا۔

افغان بادشاہ قلعہ شجاع آباد پر قابض ہونے کے بعد ملتان شہر کی طرف بڑھا اور ایک ہی حملہ میں ملتان شہر سکھوں سے چھین لیا اور قلعہ ملتان کا تندہی سے محاصرہ کر لیا۔ ملتان کے سکھوں کو شجاع آباد کی شکست اور حجرہ شاہ مقیم کے قتل عام کے بعد پنجاب سے کسی عسکری امداد کی امید نہ رہی لہٰذا انہوں نے صلح کی گفت و شنید کا آغاز کیا۔ عبدالکریم بابر سکھ فوجدار ملتان نے افغان بادشاہ سے سکھوں کو جان کی امان دلا دی اور سکھوں نے بغیر مقابلہ کے اپنا سب کچھ اٹھا کر قلعہ ملتان کی چابیاں عبدالکریم کے سپرد کر دیں اور ملتان سے چلے گئے۔ عبدالکریم خان بابر نے چابیاں افغان بادشاہ کے حوالے کر دیں جس پر 10 ربیع الاول 1194ھ مطابق فروری 1780ء افغان بادشاہ ملتان میں داخل ہو گیا اور ملتان میں سکھوں کی پہلی حکومت کا خاتمہ ہو گیا۔

سکھوں کی پہلی حکومت ملتان کا جائزہ

سکھوں نے ملتان کا انتظام بے حد احتیاط سے کیا۔ کسی کو بے عزت نہ کیا کسی کو بے ستر نہ کیا۔ پنجاب میں عام سکھ گردی کے سکھ نظم و ضبط کی بجائے سکھوں نے رعایا کی زندگی میں کم از کم مداخلت کی پالیسی اختیار کر کے ملتان جیسے مسلم اکثریتی علاقے میں فساد پھیلنے نہ دیا۔ انہوں نے اپنے مقبوضہ علاقے روزمرہ کے نظم و ضبط اور امن و امان کی ذمہ داری قسمت کے دھنی سپاہی عبدالکریم خان بابر کے سپرد کر دی جو قبل

ازیں ملتان کے درانی دور میں فوجدار چلا آتا تھا۔ لوگوں کو سابقہ نظام کی بحالی کی وجہ سے نئے نظام کی اہمیت کا احساس نہ ہوا۔ سکھوں نے خود کو بھی ملتان کی معاشرتی زندگی سے کافی دور رکھا۔ معاملہ سرکار اور کسانوں سے وصولی معاملہ کا مسئلہ تھا وہ انہوں نے پہلے پہل اپنے مقبوضات کو دو حصوں جھنڈا سنگھ اور لہنا سنگھ میں بانٹا پھر دونوں سکھ سردار نے اپنے حصوں کے کئی کئی ٹکڑے کر کے ان پر مقامی لوگوں کو مستاجر مقرر کر دیا۔ اور زر مستاجری طے کرنے کے بعد کچھ نقد اور کچھ اقساط میں کچھ جنس کی صورت میں وصول کرنا طے کر کے دیوان سنگھ چھاچھو والیہ کو اپنا مختیار مقرر کر کے۔ کاشتکاروں اور زمینداروں سے اپنا روزمرہ کا تعلق نہ ہونے کے برابر کر لیا جس کی وجہ سے ملتان میں سکھوں کے پہلے دور حکومت کے سات آٹھ سالوں میں سکھوں کا ملتان کے عوام سے ایک مرتبہ بھی تصادم نہ ہوا۔ سکھوں کا یہ رویہ ان کے پنجاب کے دوسرے علاقوں کے نظم و نسق سے بالکل مختلف تھا۔ اس میں بھنگی مثل کی قیادت کی شخصی خوبیوں کا تعلق بھی ہو سکتا ہے اور ملتان کی جغرافیائی سیاسی حیثیت بھی اس کا باعث ہو سکتی ہے۔

حوالہ جات

1- ملتان میں دور انگریزی میں سکھوں کی حسب ذیل عمارات قیام پاکستان سے پہلے موجود تھیں۔

1- عمارت سنگھ سبھا

2- عمارت بیٹھک بابا گورو نانک

3- گورودوارہ بھائی دیال سنگھ

ان عمارات کا اب کوئی سراغ نہیں ملتا۔

2- سکھوں کے چھٹے گورو ہرگوبند پہلے گورو ہیں جنہوں نے سکھوں کو گھوڑے خرید نے اور اسلحہ رکھنے کا حکم دیا انہوں نے پہلی سکھ حفاظتی فوج قائم کی اس فوج کے پانچ کماندار مقرر کئے ہر کماندار کے تحت سو سوار مقرر کئے ان پانچ کمانداروں کے نام بیدی چند۔ پیرانا۔ جیٹھا۔ پیارا اور لنگاہا تھے۔ ہو سکتا ہے کہ یہ پانچواں کماندار لنگاہ

ملتان کا کوئی لنگاہ ہو۔ اس سلسلہ میں مزید تحقیق کی ضرورت ہے۔ پانچویں گورو کے حالات زندگی سے معلوم ہوتا ہے کہ بھائی لنگاہا سکھوں کی تاریخ کا ایک اہم کردار تھا کیونکہ چھٹے گورو کے زندگی کے حالات میں بھائی لنگاہا کا تین بار ذکر آیا ہے۔ لنگاہا۔ لفظ لنگاہ کا اسم تصغیر ہے۔

3- ننکانہ صاحب میں ایک تالاب قدیم زمانہ سے بنا ہوا تھا جسے مہاراجہ کوڑا مل ملتانی نے بہت وسیع کر کے دوبارہ بنوا دیا۔

رنجیت سنگھ کے بعد انتشار کا دور

1849-1839

طاہر کامران

19 ویں صدی کو عالمی تاریخ میں کئی حوالوں سے اہمیت حاصل ہے یوں تو نوآبادیاتی قوتوں اور استعماری رویوں کی بنا 18 ویں صدی ہی میں پڑ چکی تھی لیکن ان قوتوں اور رویوں کو استحکام 19 ویں صدی ہی میں ملا۔ اسی صدی میں نپولین کی شکست کے بعد نہ صرف برطانیہ نے اپنے آپ کو سب سے بڑی عالمی طاقت کی حیثیت سے منوا لیا بلکہ کرہ ارض کے متمول ترین علاقوں پر اپنا سیاسی و اقتصادی تسلط بھی قائم کر لیا۔ اس طرح نوآبادیاتی نظام جہاں برطانیہ کے امراء اور متوسط طبقے کے لئے خوشحالی اور مادی ترقی کی نوید بنا وہیں کروڑوں انسان سیاسی جبر اور اقتصادی استحصال سے عبارت غلامی کی زندگیاں بسر کرنے پر مجبور ہوئے۔ ان تمام نوآبادیوں میں سے کہ جو برطانوی طالع آزماؤں کے استبدادی شکنجے میں جکڑی ہوئی تھیں ہندوستان سب سے اہم تھا۔ اپنے وسائل کے اعتبار سے اور اپنی افرادی قوت کے اعتبار سے بھی۔ یہی وجہ ہے کہ ہندوستان ملکہ وکٹوریہ کے تاج کا سب سے قیمتی ہیرا قرار پایا۔ ہندوستان پر نوآبادیاتی غلبے کا آغاز 1757ء میں ہوا جب پلاسی کی جنگ میں سراج الدولہ کو شکست ہوئی۔ یہ ایک ایسی ابتداء تھی جو منزل منزل اپنی انتہا کو پہنچی۔ 1799ء میں ٹیپو سلطان کی مزاحمت کا خاتمہ ہو گیا۔ 1802ء میں مرہٹوں کو شکست ہوئی۔ 1843ء میں سندھ کا الحاق اور 1849ء میں الحاق پنجاب عمل میں آیا تو ایک طرح سے ہندوستان پر نوآبادیاتی استبداد کی تکمیل ہو گئی اگرچہ اودھ کی تسخیر 1856ء میں ہوئی۔

گو کہ 19 ویں صدی کے نصف اول کے دوران ہندوستان بحیثیت مجموعی عدم

استحکام اور غیر یقینی صورتحال کے پیش نظر ایسٹ انڈیا کمپنی کے اہلکاروں کے لئے تر نوالہ بنتا گیا۔ اس کے بالکل برعکس پنجاب میں کم از کم اس صدی کے ابتدائی 40 سالوں تک سیاسی استحکام رہا۔ 19 ویں صدی کا پہلا حصہ اس طرح سے دلچسپی کا حامل ہے کہ اس عرصہ میں سکھ ریاست کو عروج حاصل ہوا اور زوال بھی۔ رنجیت سنگھ نے تقریباً 40 برس تک پنجاب پر حکومت کی لیکن 27 جون 1839ء میں اس کے انتقال کے بعد وہ استحکام' امن اور آشتی کا عہد جو رنجیت سنگھ کا بطور حکمران طرہ امتیاز تھا محلاتی سازشوں اور جانشینی کے لاینحل قضیوں کے باعث طوائف الملوکی اور انتشار کی نذر ہو گیا۔ پنجاب میں رنجیت سنگھ سے پہلے کے اور بعد کے ہر دو ادوار اس حقیقت پر مہر تصدیق ثبت کرنے کے لئے کافی ہیں کہ اس (رنجیت سنگھ) کا دور اٹھارویں اور 19 ویں صدی کے تاریخی تناظر میں محض عدم تسلسل تھا جس کی بنیادیں رنجیت سنگھ کی ذات میں پنہاں انتظامی و سیاسی صلاحیتوں اور عسکری جدت کی حامل خالصہ فوج پر استوار کی گئی تھیں۔ چنانچہ سکھ حکومتی و انتظامی ڈھانچہ اس وقت زمین بوس ہو گیا جب رنجیت سنگھ کے بعد سکھ ریاست کو اس جیسی سیاسی فراست اور انتظامی اہلیت سے بہرہ ور شخص میسر نہ آ سکا۔

اگرچہ ہستی سے نیستی میں تبدیل ہونے کا یہ عمل دس سالوں پر محیط تھا۔ زیر نظر مقالے میں انہی دس سالوں کے دوران برپا ہونے والے انتشار کو مختلف تاریخی حقائق کی روشنی میں سمجھنے کی کوشش کی گئی جس کا نتیجہ 1849ء میں پنجاب کی استثنائی حیثیت کے خاتمے کی صورت میں ہوا اور برصغیر کے نقشے پر پھیلتی ہوئی اس سرخی نے پنجاب کو بھی اپنی لپیٹ میں لے لیا جس کا احساس رنجیت سنگھ نے اپنی زندگی میں ہی کر لیا تھا۔ اس کی زبان سے نکلے ہوئے یہ لفظ 'اک دن سب لال ہو جائے گا۔' ایک ایسے مستقبل کا عندیہ دے رہے تھے جو غلامی سے عبارت تھا۔ تاریخ کے پہیے نے اپنا سفر بہرحال جاری رکھا اگرچہ اس کی سمت بدل گئی۔

(1)

جیسا کہ سطور بالا میں کہا گیا ہے کہ کسی بھی عہد کا فہم و ادراک تاریخی حقائق ہ

کے ذریعے ممکن ہے لہٰذا رنجیت سنگھ کی وفات کے بعد پنجاب میں رونما ہونے والے واقعات کا تجزیاتی مطالعہ تاریخی پس منظر میں ضروری ہے۔

عمر کے آخری ایام میں رنجیت سنگھ کی صحت مسلسل خراب رہنے لگی تھی خاص طور پر 1834ء میں فالج کے حملے کے بعد رنجیت سنگھ کلی طور پر روبہ صحت نہ ہو سکا۔ پیرانہ سالی اور بگڑتی صحت کے باعث اس نے اپنی زندگی ہی میں اپنے سب سے بڑے بیٹے کھڑک سنگھ کو اپنا جانشین مقرر کر دیا تھا۔ کھڑک سنگھ کی بادہ نوشی اور اس میں غیر معمولی فراست اور انتظامی اہلیت کے فقدان سے متعلق رنجیت سنگھ کو غالباً کسی قسم کی خوش فہمی نہ تھی۔ (2) لہٰذا اس نے دھیان سنگھ جیسے زیرک اور سیاسی معاملہ فہمی کے حامل شخص کو اس کا وزیر نامزد کیا۔ قیاس کیا جا سکتا ہے کہ راجہ دھیان سنگھ کو درحقیقت کھڑک سنگھ کے لئے اس طرح کی خدمات سرانجام دینے کے لئے چنا گیا تھا جو بیرم خان نے اکبر کے لئے سرانجام دی تھیں۔ کھڑک سنگھ کی مہاراجہ کی حیثیت سے گدی نشینی کی باقاعدہ رسم یکم ستمبر کو ادا کی گئی۔ رنجیت سنگھ کی وفات کے بعد مسائل کی ابتداء اس وقت ہوئی جب نئے مہاراجہ کے ایک قریبی عزیز چیت سنگھ باجوہ نے دربار میں غیر معمولی اثر و رسوخ حاصل کر لیا تھا۔ (3) لیکن سیاہ و سفید کا پوری طرح سے مالک بننے میں چیت سنگھ کو ایک سد راہ کا سامنا تھا جو دھیان سنگھ کی شکل میں کھڑک سنگھ کی عقابی نگاہوں سے نگرانی کر رہا تھا۔ کچھ ہی عرصے میں معاملات کی سنگینی میں شدت آئی اور چیت سنگھ نے دھیان سنگھ کو راستے سے ہٹانے کی کوششیں شروع کر دیں دوسری طرف دھیان سنگھ نے شہزادہ نونہال سنگھ جو کہ پشاور کا ناظم تھا کے ساتھ ساز باز کرنا شروع کی جس کے نتیجے میں اکتوبر 1839ء کو چیت سنگھ کو قتل کر دیا گیا۔ (4) اور یوں سکھ امراء میں باہمی کشت و خون کی کہانی کی ابتداء ہوئی اور اس دس سالہ دور کی بھی جو کہ ہمارا موضوع ہے۔ اب عنان اقتدار حقیقی معنوں میں نو نہال سنگھ کے ہاتھوں میں آ گئی۔ جس نے راجہ دھیان سنگھ کی معاونت میں کاروبار سلطنت چلانا شروع کیا۔ لیکن سال بھی نہ بیتا تھا کہ مہاراجہ کھڑک سنگھ 5 نومبر 1840ء کو چل بسا۔ (5) اس کا کریہ کرم کر کے نونہال سنگھ اور میاں اودھم سنگھ لوٹ رہے تھے کہ

آہنی گیٹ ان پر آن گرا نجانے یہ حادثہ تھا یا کوئی چال تھی بہرحال نونہال سنگھ کا خاتمہ ہو گیا اور "سکندر اعظم سے کئی طرح سے مشابہہ" اس شہزادے سے وابستہ امیدیں بھی خاک میں مل گئیں کیونکہ اس مختصر عرصہ کے دوران نونہال سنگھ نے یہ باور کروا دیا تھا کہ لاہور کی گدی دراصل اسی کا استحقاق تھا۔ اس عرصہ میں ہزارہ میں برپا ہونے والی بغاوت کو سردار چھتر سنگھ اٹاری والا کے ذریعے فرو کر دیا گیا۔ کشمیر اور ملتان کے گورنروں کرنل مہان سنگھ' دیوان ساون مل کو لاہور طلب کر کے ان سے بقایا جات وصول کئے گئے۔ (6) سکردو' منڈی اور کلو (Kulu) کو کامیاب مہمیں بھیجی گئیں۔ یوں محسوس ہونے لگا تھا کہ جیسے سکھ سلطنت چند ہچکولوں کے بعد سنبھل گئی ہو لیکن نونہال سنگھ کی بے وقت موت سکھ دور حکومت کے لئے اجل کا نقارہ ثابت ہوئی۔

کھڑک سنگھ اور نونہال سنگھ کی یکے بعد دیگرے وفات کے بعد اب چھ شہزادے گدی کے حصول کے تمنائی باقی تھے۔ شیر سنگھ اور اس کا جڑواں بھائی تارا سنگھ دونوں تیس سال سے کچھ زیادہ عمر کے تھے پشاورا سنگھ' کشمیرا سنگھ اور ملتانہ سنگھ تینوں کی عمریں بتیس سالوں سے ذرا زیادہ تھیں دلیپ سنگھ نے تو ابھی تین بہاریں بھی نہ دیکھی تھیں جبکہ گدی کا ایک اور داعویدار نونہال سنگھ کی بیوہ کی کوکھ میں پرورش پا رہا تھا۔ چنانچہ کھڑک سنگھ کی وفات کے چار دن بعد یعنی 9 نومبر کو جب شیر سنگھ کے مہاراجہ ہونے کا اعلان کیا گیا تو نونہال سنگھ کی ماں مہارانی چاند کور نے سردار اتار سنگھ سندھیانوالیہ' جمعدار خوشحال سنگھ اور سردار لہنہ سنگھ مجیٹھیا کی مدد سے نونہال سنگھ کے ابھی جنم لینے والے بچے کے حق میں مہم شروع کر دی اور بچے کی پیدائش اور کم سنی کے سالوں میں خود کو ریجنٹ کی پوزیشن پر مامور کر لیا۔ (7) سندھانوالیہ کی اس مہم میں اسے راجہ دھیان سنگھ کی حمایت بھی حاصل تھی لیکن کچھ عرصہ بعد جب دھیان سنگھ کو محسوس ہوا کہ اسے مشیروں کی نسبت محض ثانوی حیثیت دی جا رہی ہے تو اس نے شیر سنگھ کو اقتدار کے حصول کے لئے نہ صرف اکسایا بلکہ اپنا اثر و رسوخ استعمال کر کے بعض فوجی کمانڈروں کو اس کی حمایت کرنے پر راضی کر لیا۔

اس طرح 20 جنوری 1841ء کو شیر سنگھ نے لاہور کے قلعے پر قبضہ کر لیا۔ اس

دوران جب اس نے لاہور پر حملہ کیا تو دھیان سنگھ جموں گیا ہوا تھا۔ شیر سنگھ نے قلعہ کا محاصرہ کر لیا اس طرح سکھوں کے درمیان پہلی خانہ جنگی کا آغاز ہوا۔ شیر سنگھ نے اپنی ہلکی توپیں بادشاہی مسجد کے میناروں پر چڑھا دیں اور وہاں سے قلعہ کے اندر تنصیبات پر گولہ باری شروع کر دی۔ اس معرکے میں شیر سنگھ کی کامیابی کے بعد دھیان سنگھ نے اسے چاند کور سے شایان شان سلوک کرنے پر راضی کر لیا۔ چنانچہ اسے جموں میں ایک جاگیر سے نوازا گیا جس کی نگرانی راجہ گلاب سنگھ کو سونپی گئی۔ لیکن شیر سنگھ مسلسل عدم تحفظ کا شکار رہا چنانچہ اس نے نہ صرف چاند کور کو قتل کروا دیا اور اس طرح نونہال سنگھ کے بچے کو اس دنیا میں آنا نصیب ہی نہ ہوا۔ ستم ظریفی تو یہ ہے کہ دھیان سنگھ کا بھائی راجہ گلاب سنگھ مہارانی چاند کور کا حامی تھا اور شیر سنگھ کی لاہور میں مڈبھیڑ اسی کی ڈوگرہ فوج سے ہی ہوئی تھی۔ اس حقیقت سے سنگٹ سنگھ کے اس بیان کی کسی حد تک تصدیق ضروری ہوتی ہے کہ سکھوں کو آپس میں لڑانا دراصل ڈوگرہ براوران ہی کی کارستانی تھی۔ علاوہ ازیں جے ایس گریوال جیسے کہنہ مشق مورخ کے اس تجزیہ سے بھی بے اعتنائی کیونکر برتی جا سکتی ہے کہ جانشینی کے قضیے کو حل کرنے کے لئے فوج کو استعمال کرنے سے جبکہ دھیان سنگھ ایک فریق کا حامی تھا اور گلاب سنگھ دوسرے فریق کا۔ (8) فوج کے نظم و ضبط پر تباہ کن اثر پڑا اور اس کے بعد خالصہ فوج نے سیاست کی بساط پر ایسے طاقتور ترین مہرے کی حیثیت اختیار کر لی جسے اپنی قیمت لگانے اور اسے وصول کرنے کا فن آ گیا تھا۔ اس عرصے میں سیاسی عناصر اور فوج کے درمیان رنجیت سنگھ کے عہد سے چلے آ رہے توازن کا یکسر خاتمہ ہو گیا۔ سیاسی عناصر کا فوج پر سے اثر ختم ہو گیا اور فوج نے اپنے سرداروں کا حکم ماننے سے انکار کر دیا۔ جب شیر سنگھ کا لاہور پر قبضہ ہو گیا تو حکام کے منع کرنے کے باوجود خالصہ فوج نے شہر میں لوٹ مار کا بازار گرم کر دیا نہ صرف یہ بلکہ فوجی کمانڈروں نے کئی یورپی افسروں کو خود ہی گولی مار دی جس کے نتیجے میں بہت سے یورپی افسران یا تو انگریزوں کی پناہ میں چلے گئے یا افغانستان کی جانب کوچ کر گئے۔ ان میں AVATABILE قابل ذکر تھا۔ عام سپاہیوں نے اعلان کر دیا کہ اب وہ دربار کے کسی نمائندے حتیٰ کہ اپنے افسروں کی

بھی برتری کو تسلیم نہیں کریں گے۔ انہوں نے اپنے میں سے کچھ سیانے سپاہیوں کو اپنا پنچ مقرر کر لیا۔ سپاہی اپنے آپ کو صرف انہی کے حکم کا پابند مانتے تھے۔ سکھ سپاہ نے از خود ایک 'پنچایت' بھی تشکیل دے دی۔ جسے ڈیفنس کونسل کہا جا سکتا ہے جس کے سامنے حکومت بے بس تھی حکومت کو اگر کوئی بھی فوجی کارروائی کرنا ہوتی تو اسے پنچایت سے درخواست کرنا ہوتی اور یہ پنچایت پر منحصر تھا کہ وہ حکومت کی اس درخواست کو درخور اعتنا سمجھے یا نہ سمجھے۔

مہارانی چاند کور کے ساتھ کیا جانے والا ہتک آمیز سلوک اس کے حامی سندھیانوالیہ سرداروں کے لئے بھی شکست تھی۔ جونہی شیر سنگھ گدی نشین ہوا سردار اتار سنگھ سندھانوالیہ اپنے بھتیجے اجیت سنگھ کے ہمراہ انگریزوں کی پناہ میں چلا گیا جبکہ لہنہ سنگھ اور اس کے بھتیجے کہار سنگھ کو قید کر لیا گیا لیکن بعدازاں انگریز پولٹیکل ایجنٹ کے کہنے پر سردار اتار سنگھ اور اجیت سنگھ کو معافی دے دی گئی (9) اور اس کے ساتھ ہی ان کی لاہور واپسی کا بھی اہتمام ہو گیا لہنہ سنگھ اور کہار سنگھ بھی رہا کر دیئے گئے اور ان کی جاگیریں بھی بحال ہو گئیں لیکن دلوں میں کدورتیں ابھی بھی برقرار رہیں۔ چنانچہ ایک دن جب مہاراجہ شیر سنگھ بارہ دری شاہ بلاول کے نزدیک فوج کو مشقیں کرتے دیکھ رہا تھا تو اجیت سنگھ نے قریب آ کر اسے ایک رائفل پیش کی جو اس کے بقول انگلستان میں تیار کی گئی۔ شیر سنگھ ابھی اس رائفل کی جانب متوجہ ہوا ہی تھا کہ اجیت سنگھ نے مہاراجے کے دل کا نشانہ لیتے ہوئے گولی چلا دی اور وہ موقع پر ہی جاں بحق ہو گیا۔ یہ واقعہ 15 ستمبر 1843ء کو پیش آیا۔ اس کے فوراً بعد راجہ دھیان سنگھ کو بھی قتل کر دیا گیا۔ (10)

اب سندھیانوالیہ سرداروں کا ارادہ تھا کہ جواں سال شہزادے دلیپ سنگھ کو مہاراجہ بنا کر اس کی ماں مہارانی جند کور (جنداں) کو ریجنٹ بنا دیا جائے تاکہ حکومتی باگ ڈور بالواسطہ طور پر انہی کے قبضے میں رہے۔ لیکن اس سے پہلے کہ وہ اپنے اس ارادے کو عملی جامہ پہناتے دھیان سنگھ کا بیٹا ہیرا سنگھ سندھیانوالیہ سرداروں کے خلاف فوج کو متحرک کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ چنانچہ ان سرداروں کے خلاف فوجی

کارروائی ہوئی۔ لہنا سنگھ اور اجیت سنگھ سمیت تقریباً ہزار نفوس اس مہم میں کام آئے اور قلعہ پر ہیرا سنگھ کا قبضہ ہو گیا۔ اس صورتحال میں چھ سالہ شہزادہ دلیپ سنگھ مہاراجہ (18 ستمبر1843ء) تھا اور ہیرا سنگھ اس کا وزیر۔ یہ صورتحال ہیرا سنگھ کے سراسر مفاد میں تھی لیکن اسے گدی کے دیگر دعویداروں یعنی پشاورا سنگھ اور کشمیرا سنگھ سے بہرحال خطرہ محسوس ہوتا تھا چنانچہ اس نے انہیں گلاب سنگھ کی مدد سے راستے سے ہٹانے کی بھی کوشش کی لیکن اسے اس میں کامیابی نہ ہوئی البتہ وزارت کے ایک اور دعویدار سچیت سنگھ کو جو کہ اس کا حقیقی چچا تھا ہیرا سنگھ نے قتل کروا دیا۔ ہیرا سنگھ اپنے دوسرے چچا گلاب سنگھ کے بارے میں بھی کچھ ایسا ہی ارادہ رکھتا تھا لیکن گلاب سنگھ نے طاقت کے مرکز میں بے پناہ رسوخ کے حامل ہیرا سنگھ کو مطمئن کرنے کے لئے اپنے بیٹے سوہن سنگھ کو یرغمال کے طور پر اس کے پاس لاہور بھیج دیا۔

سردار اتار سنگھ سندھیانوالیہ جو کہ شیر سنگھ کے مہاراجہ بننے پر انگریزوں کے علاقے میں جا کر پناہ گزیں ہو گیا تھا ترن تارن کے قریب نورنگ آباد میں ایک مذہبی ہستی بھائی بیر سنگھ کی قدم بوسی کے لئے حاضر ہوا۔ ہیرا سنگھ کو اس کے بارے میں جب معلوم ہوا تو اس نے وہاں پر چھاپہ مار کارروائی کروا کر نہ صرف اتار سنگھ کو مروا دیا بلکہ اس معرکے میں بھائی بیر سنگھ بھی مارے گئے۔ یہ اقدام ہیرا سنگھ کے لئے سکھ مت کے پیروؤں میں غیر مقبولیت کا باعث بنا۔ لیکن ہیرا سنگھ کے لئے دائرہ زیست اس وقت صحیح معنوں میں تنگ ہوتا دکھائی دیا جب پنڈت جھلا اس شخص کا ہیرا سنگھ پر بیحد اثر تھا۔ ہر خاص و عام اس حقیقت سے آشنا تھا کہ ہیرا سنگھ کی وزارت کے انتہائی غیرذمہ دارانہ رویے کے باعث فوج اور ہیرا سنگھ کے تعلقات کشیدہ ہونے لگے اور بات بڑھتے بڑھتے یہاں تک پہنچی کہ فوجی پنچوں نے جھلا کو ان کے سامنے پیش کئے جانے کا مطالبہ کر دیا۔ اس صورتحال میں ہیرا سنگھ کو اور کچھ سجھائی نہ دیا سوائے اس کے کہ وہ اور پنڈت جھلا خزانے میں موجود جمع پونجی سمیت لاہور سے غائب ہو جائیں لیکن ابھی وہ راوی کو پار کر کے تھوڑا ہی آگے جا سکے تھے کہ مہاراجہ دلیپ سنگھ کے ماموں جواہر سنگھ نے انہیں جا لیا۔ معمولی مزاحمت کے بعد ہیرا سنگھ جھلا۔ سوہن سنگھ اور میاں لابہ سنگھ

موت کے گھاٹ اتار دیئے گئے۔ ہیرا سنگھ کے قتل کے بعد وزارت کا قلمدان رانی جنداں کے بھائی جواہر سنگھ کے حصے میں آیا۔ (11) لیکن سول معاملات کی دیکھ بھال کے لئے ایک کونسل تشکیل دیدی گئی جس کی روح رواں مہارانی جنداں خود تھی کونسل کے دیگر ارکان میں جواہر سنگھ' بھائی رام سنگھ' بخشی بھگت رام' دیوان دینا ناتھ اور فقیر نورالدین شامل تھے۔ لیکن ان حالات میں کہ جب ناظم اور کاردار مالیے کی رقوم بھیجنے میں پس و پیش کر رہے تھے اور دوسری طرف فوج پر اٹھنے والے اخراجات میں مسلسل اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ ان حالات میں حکومت کرنا جا نکبل کام تھا۔ فوج کی افرادی قوت رنجیت سنگھ کے عہد میں 85 ہزار سے کبھی متجاوز نہ ہوئی لیکن 1844ء میں یہ بڑھ کر ایک لاکھ بیس ہزار ہو گئی تھی اور فوج پر آنے والے اخراجات میں بھی اضافہ ہوا تھا جو کہ فطری امر تھا۔ 1839ء میں فوج پر 40 لاکھ روپیہ سالانہ خرچ ہوتا تھا جبکہ 1844ء میں یہ مد بڑھ کر 60 لاکھ روپیہ کے ہدف کو چھونے لگی تھی (12) اس پر مستزاد یہ کہ مالیے کی رقوم کی ترسیل میں وہ روانی نہ رہی تھی۔ ملتان اور کشمیر کے ناظمین کی طرف بقایا جات کی بھاری رقوم واجب الادا تھیں۔ چنانچہ جب کونسل کے ارکان کو کچھ اور نہ سوجھا تو انہوں نے جموں سے بقایا جات کی وصولی کے لئے فوجی دستے روانہ کئے راجہ گلاب سنگھ کو لاہور لایا گیا اور اس سے 27 لاکھ روپے وصول کئے اور اس کے عوض اس کے اجارے میں دو مزید سالوں کی توسیع کر دی گئی۔ ابھی مالی معاملات سلجھنے نہ پائے تھے کہ پشاورا سنگھ نے بغاوت کر دی اغلباً اس کی وجہ یہ تھی کہ اسے سیالکوٹ کی جاگیر سے جواہر سنگھ کی ہدایات پر عمل کرتے ہوئے بیدخل کر دیا تھا۔ اور جب اس نے علم بغاوت بلند کیا تو جواہر سنگھ ہی کے ایماء پر اسے قتل کر دیا گیا۔ یہ واقعہ 31 اگست 1845ء کو پیش آیا۔ اس پر فوج بپھر گئی اور اس کے ہاتھوں جواہر سنگھ کا انجام بھی وہی ہوا جو اس سے پہلے بہت سوں کا ہوا تھا لہٰذا 21 ستمبر کو جواہر سنگھ بھی راہی ملک عدم ہو گیا۔ (13)

مہارانی جنداں اور اس کے حامی سرداروں کو بالاخر فوج سے پیچھا چھڑانے کا یہی حل سوجھا کہ خالصہ فوج کو انگریزوں سے ٹکرا دیا جائے۔ فوج کے خلاف مہارانی کی

معاونت کے لئے گلاب سنگھ بھی جموں اور اس سے ملحقہ علاقے پر مستقل راج کے عوض تیار ہو گیا۔ اس دوران یہ بھی خبر ملی کہ ستلج پار انگریز پہلے ہی سے سکھ سلطنت سے دو دو ہاتھ کرنے کے لئے پر تول رہا ہے۔ اس خبر کو غیر معمولی مبالغے کے ساتھ سکھ سپاہ میں پھیلا دیا گیا حتیٰ کہ اس کی صفوں میں برا نگیختگی عود آتی دکھائی دی۔ اس کیفیت سے فائدہ اٹھاتے ہوئے مہارانی جنداں نے فوج کے پنچوں سے رنجیت سنگھ کی سادھی پر حلف کیا کہ رنجیت سنگھ کی قائم کی ہوئی اس ریاست کا ہر قیمت پر تحفظ کیا جائے گا اور اس کے ساتھ ہی پنچوں کی اتھارٹی کو تحلیل کر دیا گیا اس طرح خالصہ فوج کی شکست کا مکمل اہتمام کر لیا گیا۔ اس سے پہلے کہ کوئی عملی کارروائی ہوتی لال سنگھ کو وزیر اور تیج سنگھ کو فوجوں کا کمانڈر بنا دیا گیا جنہوں نے انگریزوں کی فتح کو ممکن بنانے کے لئے کسی بھی قسم کا گھناؤنا اقدام کرنے سے گریز نہ کیا۔

اس ضمن میں ایک بات جس کی طرف سیتا رام کوہلی نے واضح اشارہ کیا ہے جو انگریزی ایجنٹوں اور لاہور کے بارسوخ افراد کے درمیان خفیہ سمجھوتہ تھا جس میں یہ طے پایا کہ جارحیت کا ارتکاب پہلے پہل خالصہ فوج کو کرنے پر اکسایا جائے اور اسے کسی طرح ترغیب دی جائے کہ وہ ستلج عبور کر کے انگریزوں کے علاقے کو تاراج کرے۔ اور جب 11 دسمبر 1845ء کو خالصہ فوج نے ستلج کو عبور کیا تو یہ رنجیت سنگھ کے اس اندیشے کی عملی تعبیر کی طرف پہلا اور فیصلہ کن قدم ثابت ہوا جس کا تذکرہ پہلے کیا جا چکا ہے۔ گورنر جنرل لارڈ ہارڈنگ نے 13 دسمبر کو ریاست لاہور کے خلاف اعلان جنگ کر دیا اور انگریزوں اور سکھوں کے مابین پہلا معرکہ 18 دسمبر کو "مدکی" کے قریب ہوا اگرچہ یہ مختصر دورانیے کی لڑائی تھی لیکن اس میں انگریزوں کا جانی نقصان توقع سے کہیں بڑھ کر ہوا ان کے 217 افراد مارے گئے اور 657 زخمی ہوئے۔ (14) البتہ 21 دسمبر کو فیروز شہر کے دوسرے معرکے میں انگریزوں کو فتح ہوئی۔ جس میں لال سنگھ اور تیج سنگھ نے کلیدی کردار ادا کیا اور انگریزوں کی فتح انہی کے گھناؤنے کردار کی وجہ سے ممکن ہوئی۔ 10 فروری 1846 کو سبھراؤں کی جنگ سے پہلے ایک انتظامی تبدیلی کے نتیجے میں لال سنگھ کی بجائے گلاب سنگھ کو وزیر کے عہدے پر فائز کیا گیا یہ تبدیلی خالصہ فوج

کے لئے مزید تباہ کن ثابت ہوئی۔ جب سبھراؤں کی جنگ جاری تھی تیج سنگھ یکایک منظر سے غائب ہو گیا اور سکھ فوج کی پشت پر بنائی گئی کشتیوں کی پل کو تباہ کر دیا جس سے سکھ فوج کے لئے پسپائی کا راستہ مسدود ہو گیا۔ اسی بنا پر ہزاروں نے اپنی جان گنوائی۔
سبھراؤں کی جنگ میں شکست کے بعد 9 مارچ کو فریقین میں معاہدہ ہوا۔

معاہدہ لاہور

اس معاہدے کی شرائط کچھ اس طرح سے تھیں:

1- ایسٹ انڈیا کمپنی مہاراجہ دلیپ سنگھ کو پنجاب کا خود مختار حکمران تسلیم کرتی ہے چونکہ وہ ابھی کم عمر ہے لہٰذا اس کی والدہ رانی جنداں ریجنٹ ہو گی اور لال سنگھ وزیراعظم ہو گا۔

2- خالصہ دربار اپنی مسلح افواج کی تعداد گھٹائے۔ پیادہ فوج 20,000 جبکہ سوار 12,000 سے زیادہ نہ ہوں۔

3- تمام توپیں جو انگریزوں کے خلاف استعمال ہوئیں۔ کمپنی کے حوالے کر دی جائیں۔ (63 توپیں)

4- اگر انگریزی افواج کو پنجاب سے گزرنا پڑے تو انہیں تمام سہولتیں فراہم کی جائیں گی۔

5- لاہور دربار کسی یورپی یا امریکی کو کمپنی کی اجازت کے بغیر ملازم نہیں رکھے گا۔

6- انگریزی فوج کا دستہ امن عامہ کی بحالی کے لئے 1846ء کے آخر تک لاہور میں مقیم رہے گا اور اس کے اخراجات لاہور دربار اٹھائے گا۔

7- لاہور دربار میں ایک برطانوی افسر ریذیڈنٹ کی حیثیت سے مقیم رہے گا۔

8- لاہور دربار ڈیڑھ کروڑ روپیہ بطور تاوان جنگ ادا کرے گا۔

سکھوں نے باقی شرائط تو تسلیم کر لیں لیکن تاوان جنگ کے بارے متذبذب ہوئے کیونکہ خزانہ تقریباً خالی تھا چنانچہ انگریزوں نے دو آبہ بست جالندھر کو اپنی قلمرو میں شامل کر لیا اس علاقے کی مالیت کا اندازہ ایک کروڑ روپیہ لگایا گیا تھا باقی پچاس لاکھ کے

عوض لاہور دربار کشمیر اور ہزارہ کے صوبوں سے دستبردار ہو گیا۔ انگریزوں نے یہ علاقہ جات گلاب سنگھ کو 16 مارچ 1846ء کو معاہدہ امرتسر کے تحت 75 لاکھ کے عوض فروخت کر دیئے۔

معاہدہ لاہور کی رو سے انگریز فوجی دستے کو 1846ء کے اختتام تک لاہور سے چلے جانا تھا لیکن اس عرصے میں حالات میں کوئی سدھار نہ آ سکا لہٰذا سکھ سرداروں نے لارڈ ہارڈنگ سے انگریز فوج کے لاہور میں قیام کی مدت میں توسیع کرنے کی درخواست کی۔ لیکن سنگٹ سنگھ کا کہنا ہے کہ لاہور دربار سے وابستہ سرداروں نے یہ درخواست انگریزوں ہی کے ایماء پر کی تھی۔ یہ وہ پس منظر تھا جس کے تحت 16 دسمبر 1846ء کو معاہدہ بھیروال عمل میں آیا جس کے لئے گورنر جنرل خود لاہور آیا۔

اس معاہدے پر 52 سرکردہ سرداروں نے دستخط کئے اور اس کے تحت 1- لاہور دربار اپنی خود مختار حیثیت سے دستبردار ہو گیا 2- مہارانی جنداں کو ریجنٹ کے عہدے سے فارغ کر دیا گیا 3- ایک Regency Council تشکیل دی گئی جس کے درج ذیل آٹھ ارکان تھے۔ سردار تیج سنگھ' دیوان دینا ناتھ' سردار شیر سنگھ اٹاری والا' فقیر نورالدین۔ سردار نجودھ سنگھ' بھائی ندھان سنگھ' سردار عطر سنگھ کلیانوالہ اور سردار شیر سنگھ سندھانوالیہ۔ برطانوی ریذیڈنٹ سر ہنری لارنس اس کونسل کا سربراہ تھا۔ اس کونسل کی معیاد 4 ستمبر 1854ء تک تھی کیونکہ اس تاریخ کو مہاراجہ دلیپ سنگھ کی عمر 16 سال ہو جانی تھی۔

گورنر جنرل نے کونسل کے قیام کے بنیادی مقصد پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ یہ انتظامی معاملات میں کم عمر حکمران کی مدد کرے گی۔ تاکہ ملک میں کوئی بحران پیدا نہ ہو۔ دراصل اس کونسل کے قیام کے ذریعے انگریزوں نے پنجاب پر اپنا راج قائم کر لیا تھا کیونکہ ہنری لارنس نے کسی مسئلے پر ارکان سے کبھی رائے نہ لی وہ وہی کچھ کرتا تھا جس کا اسے گورنر جنرل کی طرف سے حکم ملتا۔ علی ھذالقیاس اس معاہدے کے بعد پنجاب کی آزادی اور خود مختاری ختم ہو کر رہ گئی۔

اس کے بعد پنجاب کی سیاست میں اس وقت تیزی آئی جب دیوان مل راج

(گورنر ملتان) کے پہلے تو وزیراعظم لال سنگھ کے ساتھ تعلقات کشیدہ ہوئے۔ مل راج پر کڑی شرائط عائد کی گئیں جو اسے طوعاً" وکرہا" تسلیم کرنی پڑیں بعدازاں صوبہ ملتان میں عوام کو بعض ٹیکسوں کی تو چھوٹ دے دی گئی لیکن اجارہ کی رقم وہی برقرار رکھی گئی جو گورنر کے لئے مرکزی حکومت کو ادا کرنا لازم تھا۔ ساتھ ہی مل راج کے گورنر کی حیثیت سے عدالتی اختیارات میں خاطرخواہ کمی کر دی گئی جس کی وجہ سے اس کے لئے ریونیو کی وصولی تقریباً نہ ممکن ہو گئی۔ ان حالات کے پیش نظراس نے دسمبر 1847ء کو استعفیٰ دینے کی پیش کش کی لیکن جان لارنس نے جو کہ اپنے بھائی ہنری لارنس کی رخصت بوجہ بیماری کے بعد عارضی Officiating ریذیڈنٹ مقرر کیا گیا تھا مارچ 1848ء کے بعد اس کا استعفیٰ منظور کرنے پر آمادگی ظاہر کی۔ اسی اثناء میں فریڈرک کیوری اپریل 1848ء میں ریذیڈنٹ بنا دیا گیا۔ اس نے مل راج کی جگہ کاہن سنگھ مان کو ملتان کا گورنر مقرر کیا اور Vans Agnew کو اس کا سیاسی مشیر اور لیفٹیننٹ اینڈرسن کو معاون خصوصی بنا کر کاہن سنگھ کے ہمراہ بھیجا۔ ملراج نے قلعے کی چابیاں کاہن سنگھ کے حوالے کیں۔ ابھی یہ سب ہمرکاب قلعے سے باہر نکلے ہی تھے کہ اگنیو پر امرچند نامی شخص جو کہ سابقہ فوجی تھا اس نے نیزے سے حملہ کر دیا۔ اس واقعے کو رونما ہوئے چند ثانیے ہی ہوئے ہوں گے کہ اینڈرسن پر بھی حملہ ہوا اور یہ دونوں انگریز اہلکار مارے گئے۔ اسے تاریخ کا جبر کہیے یا ناگزیریت کہ مقامی لوگوں نے ملتان میں ایسے حالات برپا کر دیئے تھے کہ مولراج کو نہ چاہتے ہوئے بھی استعماری قوتوں کے خلاف مزاحم عوام کا قائد بننا پڑا۔ اس طرح استعماری قوتوں کا مقامی مجاہدوں کا پہلا تصادم 21 مئی 1848ء کو ڈیرہ غازی خان کے قریب ہوا جہاں انگریزوں نے مقامی سرداروں کی مدد سے مولراج کو شکست دی متعدد معرکوں اور جھڑپوں کے بعد بالاخر ملراج نے انگریزوں کے سامنے ہتھیار ڈال دیئے۔ 22 جنوری 1849ء کو ہونے والی اس مہم میں انگریزی فوج کے 210 آدمی ہلاک اور 982 زخمی ہوئے تھے۔ مولراج کو سزائے موت دی گئی بعدازاں اسے عمرقید میں بدل دیا گیا۔

ملتانی مجاہدوں کی تسخیر کے بعد انگریزی تدبیر و تنظیم کو ابھی مزید صبر آزما مراحل

سے گزرنا تھا۔ ہزارہ کے معزول شدہ گورنر سردار چھتر سنگھ اٹاری والا اور اس کے سیماب صفت بیٹے شیر سنگھ نے انگریزوں کے لئے پنجاب کی تسخیر کو مشکل تر بنا دیا۔ وہ پنجاب جس پر الزام دھرا جاتا ہے کہ قرون وسطیٰ میں حملہ آوروں کے سامنے وہ کبھی مزاحم نہیں ہوا۔ 19 ویں صدی کے وسط میں مزاحمت کی تاریخ سنہری حروف میں رقم کر رہا تھا۔ پنجاب کے دفاع کے لئے انگریزوں کے خلاف آخری معرکہ کی ابتداء نومبر 1848ء میں ہوئی جب اٹاری والہ سرداروں کی بغاوت کو کچل دینے کی غرض سے کمانڈر انچیف لارڈ گف ستلج کے اس پار اترا۔ 22 نومبر کو پہلی لڑائی رام نگر کے قریب لڑی گئی جس میں بریگیڈیئر جنرل کیمبل کے فوجی دستوں کو منہ کی کھانی پڑی۔ جلیانوالہ کی لڑائی میں (13 جنوری 1849ء) تین برطانوی رجمنٹیں تباہ ہو گئیں۔ انگریزی فوج کے 3,000 گورے افسر مارے گئے البتہ 21 فروری 1849ء کو گجرات کی لڑائی میں راجہ شیر سنگھ کو شکست ہوئی اس نے پسپائی اختیار کرتے ہوئے کابل کی طرف نکل جانے کی بھی کوشش کی لیکن ایبٹ اور گلاب سنگھ نے اس امکان کو حقیقت نہ بننے دیا اور 14 مارچ 1849ء کو سردار چھتر سنگھ اور راجہ شیر سنگھ نے جنرل گلبرٹ کے سامنے ہتھیار ڈال دیئے اسی موقع پر ایک سفید داڑھی والے سکھ سورما نے یہ تاریخی بیان دیتے ہوئے اپنی تلوار انگریز کمانڈر کے حوالے کی کہ "رنجیت سنگھ اج مویا اے۔"

29 مارچ 1849ء کو رنجیت سنگھ کی وفات کے نو سال دس ماہ بعد دلیپ سنگھ خالصہ دربار میں گدی پر آخری مرتبہ متمکن ہوا رومن حروف میں ایچ ایم ایلیٹ کے ہاتھوں بھیجی گئی الحاق کی دستاویز پر دستخط کئے اور رنجیت سنگھ کی عظمت و سطوت کے ساتھ اس کی تخلیق کی ہوئی سکھ ریاست بھی قصہ پارینہ ہوئی۔ اس کے فوراً" بعد راجہ تیج سنگھ اور دیوان دینا ناتھ نے پہلے دستخط کئے پھر بھائی نجودھ سنگھ اور فقیر نورالدین نے بعد میں دستخط کئے۔

سطور بالا میں دیئے گئے حقائق کی روشنی میں یہ سمجھنا کسی قدر سہل ہو جاتا ہے کہ سکھ ریاست کیونکر زوال کا شکار ہوئی لیکن حتمی رائے دینا پھر بھی بہت مشکل ہو جاتا ہے۔ کننگھم کا کہنا ہے کہ فوجی پنچ جو 1845ء تک سیاسی قوت کا روپ دھار چکے تھے۔

خود جنگ نہیں چاہتے تھے یہ خودغرض لیڈروں کا کیا دھرا تھا جو خالصہ فوج سے جان چھڑانا چاہتے تھے لیکن فوج کے ادارے کا سیاسی مہرہ بن جانا ہی سیاسی و اقتصادی نظام کے لئے زہر قاتل تھا۔ مزید برآں رنجیت سنگھ کی شخصی حکومت اداراتی شکل اختیار نہ کر سکی۔ سکھ ریاستی ڈھانچے کا اہم ترین ستون (فوج) مغربی جدت طرازی کا اعلیٰ نمونہ تھا۔ اس طرح کی تناسب سے محروم جدت عام طور پر طوائف الملوکی پر ہی منتج ہوتی ہے۔ محض دفاع کو جدید بنائے رکھنا جبکہ باقی معاشرتی پہلوؤں میں تحقیق و تحریک کے عمل کی طرف عدم توجہی کا وہی نتیجہ نکلتا ہے جو کہ 1849ء میں سکھ ریاست کا مقدر ہوا۔

وہ کونسل جو کہ رانی جنداں کی صدارت میں کچھ عرصہ تک کام کر رہی تھی امکان ہے کہ اگر کچھ عرصہ تک وہ کام کرتی رہتی تو کسی قسم کے سیاسی ادارے کی صورت اختیار کر لیتی۔

اگرچہ سنگٹ سنگھ نے سکھ زوال کو برہمنوں خصوصاً ڈوگرہ برادران کا شاخسانہ قرار دیا ہے۔ لیکن سکھ ریاستی ڈھانچے کے لیے استحکام حاصل کر لینے کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ خالصہ فوج کی آزادانہ روش تھی جو اس نے سکھ راج کے اختتامی ایام کے دوران اپنا رکھی تھی۔ اس کی حیثیت ماورائے ریاست ادارے کی سی ہو گئی جسے حمزہ علوی کی اصطلاح میں over develped حیثیت کا حامل کہا جا سکتا ہے۔ اگر سیاسی عناصر اور فوجی پنچ میں افہام و تفہیم قائم رہتی تو یہ بہت حد تک ممکن تھا کہ پنجاب کی تاریخ اور سیاست کی نوعیت بالکل مختلف ہوتی۔

حوالہ جات

1- جے ایس گریوال "مہاراجہ رنجیت سنگھ" گرونانک دیو یونیورسٹی پریس امرتسر' 1982ء ص 64 تا 17-

2- سنگٹ سنگھ "دی سکھس ان ہسٹری" ان کامن بکس نیو دہلی' ص 121-

3- جے ایس گریوال "دی سکھس آف دی پنجاب" کیمبرج یونیورسٹی پریس' ص 119-

4- ایضاً"۔ ص 120-

5- ایضاً"

6- ایضاً"

7- ایضاً"

8- ایضاً"۔ ص 120-

9- ایضاً"۔ ص 121-

10- سنگت سنگھ، ص 128, 129-

11- جے ایس گریوال، ص 122-

12- ایضاً"۔ ص 99 تا 127-

13- مائیکل الیگزینڈر، سوشیلا آنند، کوئین وکٹوریہ، مہاراجہ دلیپ سنگھ، (1838-1893) الونٹیکس پریس، لندن 2001، ص 5-

14- ایس ایس تھوربرن "پنجاب ان وار اینڈی پس" لندن۔

سرلیپل ہنری گرفن

1838ء میں انگلستان میں پیدا ہوئے۔ 1860ء میں انڈین سول سروس میں شمولیت کے بعد پنجاب میں فرائض سرانجام دیئے۔ ان کی مشہور کتاب "دی پنجاب چیفس" (روسائے پنجاب) ہے۔ 1892ء میں ان کی یہ کتاب رنجیت سنگھ شائع ہوئی۔ 1908ء میں ان کی وفات ہوئی۔

جس کا اردو ترجمہ 1922ء میں حیدر آباد دکن سے شائع ہوا۔ اس کتاب میں گرفن نے رنجیت کی حکومت اور اس کے کردار کو برطانوی حکومت ہند کے نقطہ نظر سے دیکھا ہے۔ اس لئے جہاں ایک طرف رنجیت سنگھ کی تعریف ہے' وہاں اس کے گہرے تعصبات بھی اس میں شامل ہیں۔ تاریخ نویسی میں اس بات کی بہت زیادہ اہمیت ہے کہ یہ دیکھا جائے کہ مصنف کون ہے اور وہ کس نقطہ نظر سے تاریخ لکھ رہا ہے۔ چونکہ گرفن ایک اہم برطانوی عہدے دار رہا ہے اس لئے اس کی تحریریں حکومت کی پالیسی اور انگریزی مفادات پوری طرح جھلکتے ہیں۔

دیباچہ

میں نے اس کتاب میں مہاراجہ رنجیت سنگھ کے حالات اور ان کے زمانے کے واقعات قلمبند کرنے میں اپنی سابقہ تالیفات "سرداران پنجاب" و "راجگان پنجاب" و "قانون وراثت متعلق بہ والیان ریاست ہائے سکھ" سے جو قریب قریب ایک ہی مضمون کی کتابیں ہیں بہت کچھ مدد لی ہے۔ ان کتابوں کی تالیف میں میں نے اس وقت اپنا بہت سا وقت صرف کیا تھا۔ کئی سال حالت ملازمت کے اور اس کے بعد بہت سے اوقات فرصت کے جہاں تک کہ ایک سرکاری ملازم کو فرصت مل سکتی تھی اسی کام میں صرف کئے تھے اور پنجاب خاص اور علاقہ جات آن روئے ستلج کے سکھ خاندانوں اور مہاراجہ رنجیت سنگھ کے درباریوں اور مشیروں اور امرائے فوج کے حالات بہت تفصیل سے بیان کر دیئے تھے۔ اس زمانے میں پنجاب کا کوئی شریف خاندان سکھوں کا ایسا نہ تھا جس سے میرا ذاتی تعارف نہ ہو۔ چنانچہ جو کچھ اطلاع ان لوگوں سے یا ان کی اسناد سے جو ان کے پاس تھیں ملی اور سرکاری کاغذات اور عہد ناموں سے جس قدر باتیں معلوم ہوئیں ان سب کی مدد سے اس زمانے کی ایک پوری تاریخ تیار کر دی تھی۔ اب اس کتاب کے لکھنے میں اپنی ہی سابقہ تالیفات کے مضامین کا اعادہ کرنا ایک مجبوری امر ہوا۔ سکھوں کی مذہبی حکومت کا جہاں ذکر آیا ہے اس کا کچھ حصہ میں نے ڈاکٹر ارنسٹ ٹرمپ صاحب کی کتاب "ادی گرنتھ" سے اور اکثر اعداد و نتائج 1881ء عیسوی کی کیفیت مردم شماری سے جس کو مسٹر ڈینزل ایبٹ سن صاحب نے بڑی لیاقت سے تیار کیا تھا لئے ہیں۔ اس امداد علمی کے لئے میں ان دونوں لائق مصنفوں کا شکر گزار ہوں۔

لیپل گرفن

تمہید

سلطنت مغلیہ کے زوال کے بعد جن اشخاص نے زور پکڑا تھا ان میں رنجیت سنگھ سے زیادہ نمایاں و اہم کوئی شخصیت نظر نہ آئے گی۔ یہ شخص سکھوں کی قلیل المدت سلطنت کا جو لاہور میں قائم ہوئی بانی تھا۔ گزشتہ صدی کے آغاز میں ایک تلاطم و طوفان بے تمیزی برپا تھا اور اقوام و مذاہب باہمی کشمکش جاری تھی اس موقع کو غنیمت سمجھ کر اور ہوشیاری و مستعدی اور اپنی فطرتی ذہانت و فطانت سے کام لے کر اس نے گرو گوبند کے فتنہ پرداز اور جنگجو معتقدین کو مجتمع کر کے ایک قوم بنا دیا۔ سکھوں کی تربیت پہلے ہی سے ایسے فوجی اصول پر کی گئی جس سے زیادہ کامل طریقہ نہ تو اس سے قبل جاری تھا اور نہ اس کے بعد ہندوستان کی دیسی ریاستوں میں رائج ہوا اور یہ جماعت رنجیت سنگھ کی سخت گیر اور جابرانہ حکومت کی ماتحتی میں ایک ایسا خوفناک اور قوی آلہ جنگ بن گئی کہ اس کے بعد وہ صرف اس وجہ سے شکستہ و کمزور ہو گئی کہ مہاراجہ کے جانشینوں نے اسے انگریزوں کے خلاف آمادہ پیکار کیا۔

جس طرح نپولین کی سلطنت کا عروج' اس کی کامیابی کی چکا چوند اور اس کا قطعی زوال دفعتاً" ہوا تھا۔ بعینہ وہی حال سکھوں کی حکومت کا ہوا۔ لاہور کا مہاراجہ بھی اپنے ہمعصر نپولین بونا پارٹ کی طرح راجپوتوں' مسلمانوں اور سکھوں کی چھوٹی چھوٹی ریاستوں کے آثار پر جن کو اس نے خود برباد کیا تھا کوئی دیرپا سلطنت قائم نہ کر سکا۔ اس کے فتوحات مستحکم نہ تھے اور اس کے مقبوضات کی حالت لکڑیوں کے گٹھے کے مانند تھی جو اس کی زندگی میں اس کے زبردست ملوکانہ عزم کی بندش سے جکڑے ہوئے تھے اور اس بندش کے ٹوٹتے ہی یہ مقبوضات بکھر گئے۔ اس کا تخت' اس کی عظمت و سطوت کی روایتیں اس کے نااہل جانشینوں کے ہاتھ میں آئیں جنہوں نے سلطنت کے جہاز کو ایسا بے قابو چھوڑ دیا کہ وہ بالاخر بربادی کے پہاڑ سے ٹکرایا اور بالکل پاش پاش

ہو گیا۔

اس قسم کی تاریخی مماثلت کو طول دینا بہت کچھ آسان ہے لیکن رنجیت سنگھ اور نپولین کی شخصیت و سلطنت نہ صرف ظاہری مشابہت کی وجہ سے تعجب خیز ہے بلکہ وہ اس سبب سے دلچسپ بھی ہے کہ اس سے یہ پتہ چلتا ہے کہ یکساں حالات کے نتائج ایشیا اور یورپ میں یکساں نکلتے ہیں۔ فرانسیسیوں نے اسی زمانے میں امراء اور جاگیریت کے ظلم و بدسلوکی سے منحرف ہو کر اول اول فتح حاصل کی تھی اور وہ اس فتح مندی کے نشے میں سرشار و مخمور تھے اور سکھوں نے بھی اسی طرح ان ہی دنوں میں برہمنوں کی تباہ کن خود مختاری کے برخلاف ایک بغاوت عظیم برپا کی تھی اور فرانسیسیوں کی طرح وہ بھی اس میں فتح مند ہوئے تھے۔ مشرق و مغرب کے انقلاب پسندوں کو نپولین اور رنجیت سنگھ کے مثل سردار ہاتھ لگے جو فوجی ذہانت و طباعی' قطعی خود غرضی' بے رحمی و بداخلاقی میں ایک دوسرے کے بالکل مشابہ تھے لیکن جو عظمت انہوں نے حاصل کی وہ اسے اپنے جانشینوں کو ترکے میں نہ دے سکے۔ یہ سچ ہے کہ اس زمانے سے تھوڑے دن قبل ہی نپولین کی سلطنت کی تجدید کی کوشش کی گئی۔ لیکن اس تجدید کی کوشش سے اس امر کی اور بھی تصدیق ہو گئی کہ جانباز جاہ طلب اشخاص بہ آسانی کوئی حکومت قائم نہیں کر سکتے۔ عامہ ناس کسی ایسے سردار کی اطاعت بہ خوشی قبول کر لیتے ہیں جو لوگوں کا بڑا سرغنہ اور پیشوا ہو اور جو لوگوں کی آنکھوں میں ایسی خیرگی پیدا کر دے کہ اس کی ذات ان کو مجسم ملکی شان و سطوت نظر آتی ہو۔ لیکن یہ چشم بندی اس شخص کی ذات تک محدود رہتی ہے اور اس کے ورثاء اور جانشینوں کی ہیئت نہیں بدلتی وہ تخت جو اس کی قدرتی ذہانت نے قائم کیا تھا نہایت مبتذل اور بدزیب نظر آتا ہے اس کے زینے پر ایک مجمع بے باک لالچی طفیلیوں کا جما ہوا نظر آتا ہے۔ جنہیں رعایا کو لوٹ کر اپنا گھر بھرنے کے سوا کوئی خیال نہیں ہوتا۔ حفظ مراتب اور اطاعت کی جگہ سازش اور بغاوت کی گرم بازاری ہوتی ہے۔ پہلے جوش و خروش ہوتا ہے پھر تحقیر کی باری آتی ہے یہاں تک کہ تھوڑی ہی مدت میں یہ خود رو سلطنت فنا ہو جاتی ہے اور وہ لوگ جو اس کی نمود کے وقت تعریفیں کرتے تھے اب اس کے خاتمے پر ہنستے نظر آتے ہیں جو نپولین اور اس کے بعد اس کے نام کی دوسری سلطنت کا حشر ہوا بعینہ وہی

حالت رنجیت سنگھ اور اس کے بیٹے کھڑک سنگھ اور دوسرے جھوٹے مدعیان سلطنت کی ہوئی جو شیر پنجاب کی وراثت پر آپس میں لڑ مرے۔

عالی شان قدیم خاندانوں کی سرنوشت اس سے کہیں مختلف ہے جن کا موروثی اعزاز نسلاً" بعد نسلاً" ایک سلسلے کی صورت میں برابر چلا آ رہا ہے یہ سچ ہے کہ تاریخ اس امر کی شاہد ہے کہ ایسی سلطنتیں بھی اپنے بعض جانشینوں کی بدکاریوں اور بے پروائیوں کی وجہ سے تباہ و برباد ہو جاتی ہیں لیکن ان کے سنبھل جانے کے ذرائع کس قدر وسیع ہوتے ہیں۔ وہ کمزوری کیسا سنگین جرم اور وہ حماقت کس قدر ذلیل ہے جو ایک ایسی قوم کو جن کی گرویدگی کا قائم رکھنا آسان تھا برداشتہ خاطر کر دیتی ہے! بادشاہوں کے خداداد حقوق کے متعلق کچھ ہی کیوں نہ کہا جائے لیکن معلوم ہوتا ہے کہ ستارے بھی اپنے دوران میں ان کی بہبودی کے لئے ضرور کوشاں رہتے ہیں اور کوئی امر من جانب اللہ ان کا محافظ اور نگہبان ہے۔ ان کی عزت اور محبت لوگوں کے دلوں میں ہوتی ہے جس کی منزلت صف آرا لشکر سے کہیں زیادہ ہے۔ زمانہ قدیم سے لوگوں میں ایک سردار کی ضرورت کا اعتقاد اور انسان کی کمزوری اور محکوم بن کر رہنے کی خواہش ان کے تخت کی اصلی بنیادیں ہیں۔ کسی مہم جو کی قائم کی ہوئی حکومت میں کسی وارث تخت کی ذرا سی لغزش یا چبھتا ہوا چٹکلا اسے تاج سے محروم کر دینے کے لئے کافی ہے۔ لیکن وہ حاکم جس کے خاندان میں پشت ہا پشت سے حکومت چلی آتی ہو آکاش کے دیوتاؤں کی طرح کڑک بجلیوں پر بھی اپنا تخت جمائے ہوئے بیٹھا رہتا ہے اور کسی طرح کا خوف اس کو دامن گیر نہیں ہوتا۔ اس کی غلطیاں بہت جلد فراموش اور اس کی حماقتیں ایک چھوڑ ستر دفعہ معاف کر دی جاتی ہیں اور جب ایسے حاکم کو زوال ہوتا ہے تو قسمت کی کوتاہی کے علاوہ یہ زوال زیادہ تر نتیجہ اس بات کا ہوتا ہے کہ زمانے کی ضروریات کو یہ حاکم نہ سمجھ سکا اور ایک سیاسی خودکشی پر ارادہ کر لیا۔

اگر یورپ میں یہ صورت پیدا ہو سکتی ہے تو ہندوستان میں اس سے بھی بڑھ کر صورتیں پیش آ سکتی ہیں۔ کیونکہ یہاں کے لوگوں میں قدامت پرستی اور پرانے طریقوں کی پابندی اور جو پیشہ مورثوں کے وقت سے ہوتا چلا آیا ہے اس کی عظمت اس درجہ بڑھی ہوئی ہے کہ کسی حاکم کے ذاتی اوصاف پر نظر نہیں کی جاتی۔ ایسے ملک میں جہاں

خونی مجرموں اور ٹھگوں کی بھی ایک طرح پر عزت کی جاتی ہو کہ قتل و غارت ان کا آبائی پیشہ ہے اور جہاں وہ عورتیں بھی جن کو پاکدامنی سے کچھ واسطہ نہیں کسی نہ کسی دیوتا کی سرپرستی میں آسکتی ہیں یہ امر ضروری ہے کہ بادشاہ کی ہیئت اور اس کی مطلق العنانی کو بادشاہی کے ضروری لوازم کا جزو اعظم شمار کیا جائے۔ تاریخ ہند گو بادشاہوں کی مصیبتوں اور قتل کے واقعات اور شاہی خاندانوں میں تغیر و تبدل کے افسانوں سے بھری ہوئی ہے لیکن غور سے دیکھا جائے تو باوجود ان امور کے شاہی تعظیم کے متعلق خواہ بادشاہ کی حکومت کتنی ہی خراب کیوں نہ ہو عامہ خلایق کا جو اعتقاد ہے اس میں کسی قسم کا تغیر نظر نہیں آتا۔ ہندوستان میں ہر زمانہ میں بہت کچھ تلاطم برپا رہ چکا ہے اس کے زرخیز قطعات ملک سینکڑوں برس تک شمالی و مغربی گوشوں سے حملہ کرنے والوں کی جولا نگاہ رہ چکے ہیں جو ملک پر متواتر یورشیں کر کے اسے تاخت و تاراج اور برباد کر کے روانہ ہوئے اور خود اس ملک کی رہنے والی نسلیں اور قومیں ایک دوسرے کی مخالف ایک دوسرے کا قتل عام کرتی لڑتی بھڑتی چلی آئی ہیں۔ لیکن ملک کی رعایا عموماً اس خاندان کی دل سے وفادار رہی جو اس حصہ ملک میں نسل در نسل حکمران رہا اور اس کی یاوری بخت و شومئی طالع دونوں حالتوں میں اس کی حفاظت کرنے اور اس پر جان فدا کرنے پر آمادہ رہی۔ جو ریاستیں حملوں کے مدافعت کی قوت رکھتی ہیں مثلاً اودے پور، جے پور اور جودھ پور یا خوش قسمتی سے حملہ آوروں کی زد سے دور یا کوہ ہمالیہ کی اندرونی وادی میں واقع ہیں مثلاً چمبہ، منڈی اور سکیت وہ ایسے قدیم خاندانوں کے زیر حکومت ہیں جن کا وجود زمانہ تاریخ کی ابتدا سے کہیں پہلے سے تھا اور اسی وجہ سے یہ خاندان اپنے آپ کو فخریہ سورج بنسی کے نام سے موسوم کرتے ہیں۔ اچھے برے، رحمدل و ظالم ہر قسم کے حکمرانوں کی حکومت ان ریاستوں پر رہی لیکن عامہ خلایق نے ان سب کو قبول کیا اور کبھی بھولے سے بھی ان کے دل میں بغاوت یا ہنگامہ آرائی کا خیال پیدا نہ ہوا۔ غالباً یہ خاندان اس وقت بھی حکمران رہیں گے جب انگریزوں کے ہندوستان فتح کرنے کے واقعات تاریخ قدیم کی حیثیت سے مدارس آئندہ میں زیر تعلیم ہوں گے۔ ان میں سے بعض والیان ریاست جس طرح کم حیثیت و گمنام ہیں اسی طرح ان کی مالی حالت و قوت بھی کم ہے۔ ان کے قبضے میں ایک قلعہ کا کھنڈر ہے چند سو

میل پہاڑ اور گھاٹی کا علاقہ ہے اور چند سو روپے اس کی آمدنی ہے اور فوج کی تو یہ حالت ہے کہ سپاہیوں کی تعداد ایک ہی ہاتھ کی انگلیوں پر گنی جا سکتی ہے۔ ان کا سال بہ سال محاصل وصول کر کے اپنے آپ کو برقرار رکھنا کسی مادی قوت کی بناء پر نہیں ہے بلکہ ان کی حالت بعینہ اس درخت کی سی ہے جس کو ہوا کی مناسبت اور بارش نے مستحکم کر دیا ہو اور اس کی جڑیں زمین میں دور تک پھیل گئی ہوں وہ گویا قدرت کا ایک جزو لاینفک بن گئی ہیں اور مثل دوسرے موجودات عالم کے ہیں۔ ان کا قیام سادہ لوح راجپوت کاشتکاروں کے دل میں جس طرح آفتاب کی تابش سے جو ان کے کھیت کو پختہ کرتی ہے یا طوفان سے جو ان کی زراعت کو برباد کرتے ہیں بغاوت کا خیال تک نہیں آتا اسی طرح ان حکمرانوں کے حقوق کے حکمرانی میں کبھی کلام نہیں کرتے۔

ہندوستان میں اس وقت بہت سی ریاستیں ہیں جن میں سے بعض سربرآوردہ اور مشہور ہیں جن کی تاریخ پر سرسری نظر ڈالنے سے بھی اس خیال کی تردید ہوتی ہے کہ فوجی جانبازوں کے لئے کامیابی کا راستہ سخت دشوار گزار ہوتا ہے۔ حیدر آباد کی عظیم الشان ریاست کی بنا سلطنت دہلی کے ایک سرکش صوبہ دار دکن کی کنارہ کشی سے ہوئی۔ بڑودہ' گوالیار اور اندور کی مرہٹہ ریاستیں اور بھوپال کی اسلامی ریاست کا قیام گزشتہ صدی میں فوجی سرداروں کی فتح مندی کے باعث سے ہوا جن کے اسلاف گمنام اشخاص تھے اور مہاراجگان کشمیر کا وجود تو 1846ء میں سرکار انگریز کی بدولت ہوا۔ اگر صورت حال یہ ہوتی کہ ایک عجیب و نامعلوم آتش فشاں قوت ہندوستان کی نرم و اثر پذیر سرزمین کے طبقہ میں سرعت کے ساتھ پھیل کر موجودہ حالت میں پتھر کا سا ثبات اور قیام پیدا نہ کرتی تو یہ ناممکن تھا کہ جن ریاستوں کو ان کے بانیوں نے اپنے زمانے میں دوسروں سے لے کر اپنا بنایا تھا ان پر ان کا خاندان متواتر حکومت کرتا رہتا۔ یہ انگریزوں کی بڑھتی ہوئی قوت تھی جو اٹھارہویں و انیسویں صدی کے دوران میں بتدریج بڑھتی اور قوت حاصل کرتی رہی۔ انگریزوں کی فتح مندی خواہ بہادری کی وجہ سے ہوئی یا ۔ بمصالح۔ طاقت کی بناء پر ہوئی یا چال سے لیکن ان کے حصول کامیابی میں گو بعض اوقات رکاوٹیں پیدا ہو گئیں مگر ان میں زیادہ زمانہ نہیں گزرا۔ ہندوستان کی تمام جنگجو قومیں یکے بعد دیگرے اس نئے اور خوفناک دشمن سے مقابل ہوئیں لیکن

اس دشمن نے ان کو پسپا کر کے بالکل شکستہ کر دیا حتیٰ کہ یہ بات اظہر من الشمس ہو گئی کہ سلطنت مغلیہ کی جانشین صرف برطانوی قوت ہی ہے۔ تمام ملک میں امن و امان کا ڈنکا بج گیا اور ایسا امن قائم ہوا کہ 1857ء کے غدر کو چھوڑ کر 45 سال سے اس میں کسی قسم کا خلل اور رخنہ واقع نہیں ہوا جو نواب و راجہ انگریزوں کے عنان فرمانروائی ہاتھ میں لیتے وقت برسر حکومت تھے ان کے حقوق تسلیم کر لئے گئے۔

گزشتہ راصلوات! حصول ملک کے ذرائع خواہ کچھ ہی کیوں نہ اختیار کئے گئے ہوں انگریزوں کو اس امر سے کہ کشور کشائی کا حق فاتح کو منجانب اللہ حاصل ہوتا ہے معترض ہونے یا اس بات سے انکار کرنے کی ضرورت نہ تھی کہ حق توریث تلوار سے بھی قائم کیا جا سکتا ہے۔ بہرکیف آج کل کی دیسی باجگزار ریاستوں کی تقسیم دو مختلف مدارج پر کی جا سکتی ہے۔ اولاً جو بوجہ قدامت معزز اور اپنے اہالیان ملک کی پشت در پشت وفادار کی وجہ سے مستحکم ہیں۔ ثانیاً جو انگریزی حکومت سے بھی زیادہ جدید اور ان کی بنیاد بھی ویسی ہی ہے جیسی کہ انگریزی سلطنت کی یعنی اسلامی سلطنت کا شیرازہ بکھر جانے کے باعث سے وہ صفحہ ہستی پر نمودار ہوئی ہیں۔ اگر کہیں ایسا وقت پیش آئے کہ انگریز بار حکومت سے خستہ ہو کر ہندوستان سے سفر کر جائیں اور اس کا پیش آنا ممکن ہے کیونکہ زمانے کا تغیر و تبدل سب کے لئے لازمی ہے تو اس وقت قدیم ہندو خاندان ایک طوفان عظیم میں اسی طرح محفوظ نظر آئے گا جس طرح اکثر سیلاب کے مواقع پر مٹی کے جھونپڑیوں والے دیہات مع اپنے آم کے باغات کے غرق شدہ قطعے میں ابھرے اور اونچے نظر آتے ہیں لیکن جدید خاندان جن کی بنیاد لڑائی اور غارتگری پر قائم ہوئی تھی اور جن کا نہ تو خون ان لوگوں سے ملا ہے جن پر وہ اکثر بہ جبر حکومت کرتے ہیں اور نہ مذہب و قوم کا اتحاد ہے اور جن کی جڑیں زمین میں گڑی نہیں ہیں ان کو اپنے مقبوضات برقرار رکھنے میں پھر تقدیر کا سامنا ہو کر اسی طرح لڑنا پڑے گا جس طرح ان کے بزرگان سلف سندھیا' ہلکرو اور گائیکواڑ کو لڑنا پڑا۔

سکھوں کی حکومت کے زوال کا اصلی باعث یہ تھا کہ رنجیت سنگھ کا اقتدار شخصی تھا مگر اس کے اس اقتدار میں طاقت کا وہ ذریعہ شامل نہ تھا جو عامہ خلایق کے دلوں میں قدیم خاندانوں کی عظمت کے باعث سے پیدا ہوا کرتا ہے۔ چونکہ سکھوں ہی کی قوم

سے پیدا ہوا تھا اور سکھوں کے اصول عمومیت کا ایک زندہ نتیجہ تھا اس لئے اس کے خاندان کے بقاء کی صرف ایک ہی صورت تھی اور وہ یہ تھی کہ اس کے جانشینوں کو بھی اس کی سی قابلیت و اطوار ورثے میں ملتے۔ لیکن ایسا نہ ہوا۔ اس کے اکلوتے بیٹے کھڑک سنگھ کی بزدلی لاعلاج تھی۔ اس کا پوتا نونہال سنگھ جو واقعی ہونہار نوجوان تھا قتل کیا گیا اور اس کے بعد جو بد عملی کا دور ہوا تو اس کے جانشین نہ اس بد عملی کو دبا سکے اور نہ اس کو قابو میں لا سکے۔ اکثر اشخاص مہاراجہ کے فرزندی کی حیثیت سے تخت کے دعویدار ہوئے۔ لیکن مہاراجہ کی حرم سرا کے اسرار لاہور کے بازاروں میں جنس عام کی حیثیت رکھتے تھے اور ان فرزندوں میں ایک بھی ایسا نہ تھا جس کا جائز اولاد ہونا سکھوں کے نزدیک ثابت ہوتا۔ اس کے بعد انگریزوں سے لڑائی ٹھنی جس میں سکھوں کی سرکردگی ایسے بے ڈھنگے پن سے ہوئی کہ گو انہوں نے نہایت مردانگی دکھائی لیکن سب بے سود ثابت ہوئی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ پنجاب پر ایک غیر قوم کی فوج قابض ہو گئی۔ اس کے حصے بخرے ہو گئے اور بالآخر اس کا الحاق عمل میں آیا۔ رنجیت سنگھ نے اکثر جو پیشین گوئی کی تھی وہ پوری ہوئی کہ نقشے پر انگریزوں کے مقبوضات کے خطوط جس سرخ رنگ میں دکھائے جاتے ہیں وہ رنگ ستلج سے بڑھتا ہوا بیاس تک اور وہاں سے دریائے سندھ اور افغانستان کے پہاڑوں تک جا پہنچے گا۔ دنیا میں اس بادشاہی کی یادگار جو کچھ باقی رہی وہ یہ تھی کہ اس خاندان کا ایک شہزادہ جلاوطن ہو کر سینٹ جیمس کے دربار میں حاضر رہا اور وہ ناشدنی ہیرا جس کا نام کوہ نور ہے ملکہ برطانیہ کے لوازم شاہی میں داخل ہوا۔

قسمت کے آگے کسی کا زور نہیں چلتا۔ اگرچہ انگریز سکھوں کے ساتھ لڑنے اور پنجاب کا الحاق کرنے کے تمام معاملے میں بالکل بے لوث تھے کیونکہ سکھ جماعت اور ان کے سرداروں کے بے انتہا جوش اور ازخود رفتگی سے انگریز ان معاملات میں مجبور ہو گئے تھے تاہم اس میں شک نہیں کہ اگر انگریزوں سے اس وقت مڈ بھیڑ نہ ہوتی اور رنجیت سنگھ کے جانشین اس کی پالیسی پر عمل کر کے انگریزوں سے اتحاد پیدا کرتے تو بھی اگرچہ یہ جنگ تھوڑے دنوں کے لئے موقوف ضرور ہو جاتی مگر شمالی ہند کی اعلیٰ حکومت کے تصفئے کے لئے ایک نہ ایک دن باہم قوت آزمائی ضرور کرنا پڑتی۔ ستلج

کے علاقے اور افغانستان کے ملک کے متعلق اختلافات و تنازعات کے بہت سے مواقع تھے۔ سکھ نہایت خودسر اور تند مزاج تھے اور ساتھ ہی انگریزوں کو اپنا رعب داب برقرار رکھنا بھی ایسا ہی ضروری تھا۔ ایسی حالت میں یہ ناممکن تھا کہ یہ دو فوجی قوتیں پہلو بہ پہلو امن سے زندگی بسر کرتی رہتیں۔ انگریزوں کی آئندہ وقعت اور سکھ جماعت کے ساتھ ان کے آئندہ تعلقات کے لحاظ سے یہ بڑی خوش قسمتی تھی کہ چھیڑ چھاڑ اور حملے کی ابتدا لاہور کی طرف سے ہوئی اور کلکتہ نے اس کا آغاز نہ ہوا۔ انگریزوں کے ہندوستان پر فتح حاصل کرنے کے کارنامے میں شجاعت و مردانگی کے جوہر' فتح حاصل کرنے پر تحمل اور مفتوح کے ساتھ حسن سلوک کی اعلیٰ مثالیں نظر آتی ہیں لیکن پھر بھی بعض ایسے ناگفتہ بہ واقعات ہیں جو گو اس وقت کے حالات کے لحاظ سے قابل معافی متصور ہوں لیکن ایک بے رو رعایت مورخ کی نگاہ میں پسندیدگی کے قابل نہیں ہیں۔ مگر پنجاب کا الحاق ان واقعات سے نہیں ہے۔ تمام سکھ جماعت نے اس فعل کو محمود تصور کیا ان لڑائیوں میں اپنی مسلمہ بہادری اور دشمن کو سخت نقصان پہنچانے سے شکست کا خیال جو کانٹا سا کھٹکتا تھا ان کے دل سے نکل گیا اور یہ لوگ ملک برطانیہ کی مشرقی ممالک کی رعایا مین سب سے زیادہ وفادار بن گئے۔ ان کی جانثاری و مردانگی اکثر موقعوں پر ثابت ہوئی اور اگر ان پر اسی دانشمندی اور ہمدردی سے حکومت جاری رہی جیسی الحاق کے ابتدائی زمانے تک تھی تو وہ آئندہ بھی ایسے ہی رہیں گے جیسے اب ہیں اور وہ ہمیشہ انگریزی حکومت ہند کے تیغ و سپر بنے رہیں گے۔

سکھ

سکھ قوم جو زیادہ تر جاٹوں کی نسل سے ہے دو بڑے گروہوں پر مشتمل ہے جو ان اضلاع کے ناموں سے موسوم ہیں جہاں وہ سکونت رکھتے ہیں۔

ان میں سے ایک کا نام مانجھا ہے اور دوسرے کا نام مالوا۔ ان دونوں کی ابتداء اور تاریخ ایک دوسرے سے بالکل مختلف ہے۔ مانجھا باری دوآب کے جنوبی حصے کا نام ہے جو لاہور اور امرتسر کے قرب و جوار میں واقع ہے باری دوآب سے مراد وہ قطعہ ہے جو دریائے راوی اور بیاس کے مابین واقع ہے۔ مانجھی سکھوں کا اطلاق بلحاظ مناسب وسعت اصطلاح کے اس تمام گروہ پر ہو سکتا ہے جو مسلمانوں کی حکومت کے زوال کے وقت دریائے ستلج کے شمال میں رہتے تھے۔

مالوا اس دریا کے بالکل جنوب میں واقع ہے۔ مذکورہ بالا مالوا (1) کی وسعت دہلی اور بیکانیر تک ہے۔ سکھ جو یہاں سکونت رکھتے ہیں وہ یہاں کے اصلی باشندے ہیں۔ وہ یہاں نہ لوٹ مار کے لئے آئے تھے اور نہ مانجھا سے وطن ترک کر کے یہاں آباد ہوئے تھے۔ یہی لوگ مالوا سکھ کے نام سے موسوم ہیں۔ ان کا مسلمہ پیشوا پھلکیان کا خاندان ہے جس کا سب سے بڑا قائم مقام مہاراجہ پٹیالہ ہے۔ نابھہ' جیند' بھدوڑ' ملود' بدروکن' جیون دان' دیال پور' لند گھریا' رامپور' کوٹ دھونا کے خاندان کا اس سے قریبی اور فرید کوٹ اور کیتھل کا اس سے دور کا تعلق ہے۔

مالوا سکھوں کے آباؤ اجداد معمولی ہندو کاشتکار تھے جن میں سے اکثر راجپوت نسل کے تھے۔ سولہویں صدی کے وسط میں ان میں سے اکثر جیسلمیر سے ترک وطن کر کے یہاں آئے اور دہلی کی اسلامی حکومت کے زیر عاطفت امن دوست رعایا کی حیثیت سے سکونت گزیں ہو گئے۔ سو سال کی مدت میں جس قدر مرکزی حکومت میں کمزوری ہوتی

گئی ان جاٹ سکونت گزینوں کی قوت بڑھتی گئی۔ پہلے یہ لوگ مال گزار تھے یعنی بادشاہی خزانے میں لگان داخل کیا کرتے تھے اور کبھی کسی طرح اس بار سے سبکدوش ہونے کی انہوں نے کوشش نہیں کی کیونکہ کوئی سختی یا زیادتی ان پر نہیں ہوتی تھی۔ رفتہ رفتہ انہیں بڑی بڑی جاگیریں عطا ہونے لگیں۔ خود انہوں نے نئی بستیاں بسائیں اور اس طور پر دولت مند' صاحب ثروت اور ملک میں صاحب رسوخ ہو گئے۔ اٹھارہویں صدی کے اوائل میں مالوے کے سرداروں نے ہندو مذہب کو ترک کر کے گرو گوبند کے مذہب کی پیروی اختیار کی جو اس زمانے میں نیا نیا نکلا تھا گرو گوبند سکھوں کے گروؤں میں سب سے آخر اور سب سے زیادہ باثر شخص تھا۔ اس کے بعد سو سال تک بد عملی کا دور رہا۔ مسلمانوں کی عظیم الشان سلطنت کا اندرونی کمزوری کی وجہ سے رفتہ رفتہ شیرازہ بکھر رہا تھا اور سکھ اپنے ان برائے نام مالکوں کی اس حالت سے فائدہ اٹھا کر یوماً" فیوماً" اقتدار و ملک حاصل کرنے لگے۔ مسلمان فرمانروا اس جدید مذہب کی ایذا رسانی پر آمادہ ہوئے لیکن اس کا استحصال نہ کر سکے۔ اس زمانے میں سکھ مذہب کے ہاتھ میں بھی بعینہ اسی طرح تلوار تھی اور وہ اسی طرح کام لیتے تھے جس طرح کہ ساتویں و آٹھویں صدی میں خود مسلمانوں اور اس صدی میں وہابیوں کے ہاتھ میں تھی۔ جو لوگ سکھ مذہب میں داخل ہوتے تھے وہ آپس میں جنگ و جدال کرنے پر بھی ہر وقت اسی طرح آمادہ رہتے تھے جیسے کہ کسی عام دشمن کے مقابلے میں تیار ہوں اور یہی وہ موقع ہوتا تھا جس میں اتفاق کرنا ان کے لئے ممکن تھا۔ سکھوں نے اعلانیہ طور پر ہندو قوانین کی پیروی کو جن پر نہیں معلوم کس زمانے سے وہ عمل کرتے چلے آ رہے تھے ترک نہیں کیا اور نہ بابا نانک یا گرو گوبند نے کوئی ایسے قواعد منضبط کئے جو مراسم شادی اور تقسیم ترکہ کے متعلق ان کی رہنمائی کرتے۔ لیکن ہندو مذہب کے قیود و شروط کو وہ نظر حقارت سے دیکھتے تھے اور جہاں کہیں انہیں اپنے فوری فوائد کے خلاف پاتے ان پر عمل کرنے سے قطعاً" انکار کرتے۔ اس وقت کی تمدنی حالت بہت پست ہو رہی تھی۔ ہر شخص کی نظر میں جو بات اچھی طرح معلوم ہوتی اس پر وہ کاربند ہوتا اور جس امر کے متعلق اسے یہ یقین ہوتا کہ کسی قسم کی روک ٹوک نہ ہو گی وہی اس کے

نزدیک ٹھیک ہوتا تھا۔ بیواؤں اور یتیموں کا کوئی دستگیر نہ تھا کہ جابر اور دل آزار ہمسایوں سے ان کو پناہ دے۔ یہ ہمسائے ان مظلوموں کی زمینوں کو جس طرح چاہتے آپس میں بانٹ لیتے چھوٹے چھوٹے سرداروں کو اپنی جائدادیں محفوظ رکھنے کے لئے اس کے سوا کچھ چارہ نہ تھا کہ بڑے بڑے خاندانوں کے محکوم اور مددگار بن جائیں اور یہ خاندان فوجی خدمت کے صلے میں ان کی حفاظت اپنے ذمے لے لیں۔ غرض اس طرح ستلج اس پار کے بڑے بڑے سرداروں کا اقتدار قائم ہوا۔ گو وہ خود مجہول النسب تھے اور ان کی جائدادیں چھینا جھپٹی کی تھیں مگر شہنشاہ دہلی پر دباؤ ڈال کر جو اسناد و خطابات انہوں نے حاصل کئے ان سے ان کے نام اور ان کی حیثیت کو بزرگی حاصل ہو گئی۔ شہنشاہ دہلی اب تک برائے نام مالوے کا فرمانروا تھا۔ مگر اس وقت حالت نہایت کمزوری و بے کسی کی تھی اور بجز اس کے کوئی چارہ نہ تھا کہ ان لوگوں کی بھی عزت افزائی کرے جن کو جانتا تھا کہ اس کی سطوت و قوت کے سب سے بڑے دشمن ہیں۔

انیسویں صدی کے شروع میں ستلج کے اس پار کے سرداروں پر اب وہ بلائیں نازل ہوتی نظر آئیں جو اس سے پہلے وہ اکثر دوسروں کے سروں پر نازل کیا کرتے تھے۔ رنجیت سنگھ لاہور کے مہاراجہ نے اپنی راجدھانی کے گرد و اطراف کے تمام سرداروں کو مطیع کر لینے کے بعد یہ مصمم قصد کیا کہ ستلج کے جنوب میں دریائے جمنا تک تمام ملک فتح کرے۔ اس کا خیال تھا کہ یہ قطعہ ملک انگریزوں سے مڈبھیڑ ہوئے بغیر فتح ہو جائے گا۔ ستلج اس پار کی ریاستوں کی حالت نے اس کو اپنے منصوبے میں کامیاب ہونے پر اور بھی زیادہ آمادہ کیا آپس کے بغض و عناد اور کسی باہمی رشتہ اتحاد کی عدم موجودگی کی وجہ سے اس وقت اسلامی حکومت کا خاتمہ ہو چکا تھا وہ لوگ یکے بعد دیگرے رنجیت سنگھ کے عزم و مستعدی کے ضرور شکار ہو جاتے۔ رنجیت سنگھ کی حرص کی کوئی حد نہ تھی نہ اس کو کسی جرم کے ارتکاب سے باک تھا اور عزت و رحم ایسے الفاظ تھے جن سے اس کے کان قطعاً" ناآشنا تھے۔

مالوا کے سردار اس خطرے سے بروقت آگاہ ہو گئے اور عین اس وقت جب کہ ان کی بربادی میں کوئی شبہ نہ ہو سکتا تھا انہوں نے انگریزوں کے سائے میں پناہ لی۔ ان

کی درخواست بڑے پس و پیش کے بعد قبول کی گئی اور ستلج اس پار کے ملک کا انگریزوں کے زیر حفاظت ہونے کا اعلان کیا گیا۔ اس کے بعد عرصے تک امن و سکون رہا۔ اس مدت میں اس قوت عظیم نے جس طرح ملک کو بیرونی حملوں سے محفوظ رکھنے کا انتظام کیا اسی طرح اندرونی امن و عافیت برقرار رکھنے پر بہت کچھ زور دیا اور بڑی سے بڑی ریاست سے لے کر چھوٹے سے چھوٹے صاحب املاک شخص کی وہی عظمت و قوت برقرار رکھی جو زیر حفاظت ہونے کے وقت انہیں حاصل تھی۔ اس زمانے میں جانشینی کے قواعد میں حتی الامکان موافقت و مطابقت پیدا کی گئی۔ مگر یہ امر ملحوظ خاطر رہنا چاہئے کہ یہ اصلاحیں اس قانون کو پیش نظر رکھ کر استعمال کی گئی ہیں جس کا رواج ایک خاص نوعیت کی سوسائٹی میں تھا۔ اس سوسائٹی کو جو آزادی کو مترادف خود مختاری کا سمجھتی تھی ترتیب و تنظیم کے حرکات سے آگاہ ہوئے زیادہ زمانہ نہ گزرا تھا۔

1845-1846 عیسوی والی ستلج کی فوجی مہم کا تقریباً وہی نتیجہ ہوا جو 1866 عیسوی میں شمالی جرمنی کی فوجی مہم کا ہوا تھا۔ انگریزی حکومت کو مدت سے جو حالات درپیش تھے ان پر تاسف کر رہی تھی اور سرداروں کے ساتھ نقض معاہدہ کئے بغیر کوئی تدبیر ان حالات کی اصلاح کی اس کی سمجھ میں نہ آتی تھی وہ دیکھتی تھی کہ چھوٹے چھوٹے جابر سردار جن کو اپنی ریاستوں میں کامل اقتدارات حاصل تھے لوگوں پر کس درجہ ظلم و جبر کر کے پیس ڈالتے تھے۔ ان سرداروں کی بدعقلی و ناشکری کی وجہ سے بالآخر نوبت یہاں تک پہنچی کہ سرکار انگریزی کو جدید انتظام کی ابتدا کرنی پڑی۔ صرف بڑے بڑے سرداروں کا اقتدار برقرار رکھا گیا اور چھوٹے چھوٹے سرداروں کے اقتدارات بالکل سلب کر لئے گئے۔ اعلان ہو گیا کہ وہ صرف سرکار انگریزی کے جاگیردار ہیں ان کا تمام ملک سرکار انگریزی کے عہدہ داروں کے زیر حکومت اور سرکاری قوانین کے زیر اثر ہو گیا۔

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ مالوی سرداروں کو متعدد مدارج ترقی کے طے کرنا پڑے۔ اول ان کی حیثیت محض کاشتکاروں کی سی تھی۔ جو وطن ترک کر کے ان زمینوں پر آ بسے تھے اور ان میں کاشت کرتے تھے۔ اس کے بعد ان زمینوں پر ان کا

قبضہ ہو گیا۔ پھر اسلامی قوت سے ان کا مقابلہ رہا اور اسی مقابلے کے اثناء میں قدرتی طور پر ان سرداروں کے اقتدارات بہت بڑھتے گئے۔ اس کے بعد سکون اور امن کا زمانہ آیا جس کا باعث یہ تھا کہ وہ انگریزوں کے زیر حفاظت آ گئے تھے۔ سب سے آخر دور میں ان کی تعداد کثیر کے اقتدارات جنہیں وہ ناجائز طور پر کام میں لاتے تھے اور جن کا انہیں حاصل ہو جانا ملک کی عین بدقسمتی تھی سلب کر لئے گئے۔

مانجھا سکھوں کی تاریخ میں اس قسم کی تدریجی ترقی کا پتہ نہیں چلتا۔ سو برس بھی نہ گزرے ہوں گے کہ ان کی جماعت ایک بہت بڑے حصے کی حیثیت محض کاشتکاروں کی تھی اور وہ اس قسم کے مراعات سے قطعاً" مستفید نہ تھی جو ستلج کے اس پار کے سرداروں کو دہلی کے دربار سے مدت تک حاصل ہوتے رہے۔ احمد شاہ اور افغانوں کے آخری حملے کے ساتھ ہی ان کا اقتدار بڑھ گیا اور ہر ایسا شخص جس میں کچھ مستعدی و جرات تھی لٹیروں کا ایک گروہ جمع کر کے ملک کو تاخت و تاراج کرنے لگا اور جو قطعات زمین ہاتھ لگے ان کا مالک بن بیٹھا۔ ان میں سے بہت سے سکھ ستلج اتر کر دہلی کی سرحد تک لوٹ مار کرتے کرتے پہنچ گئے۔ جنہوں نے ستلج اس پار کے وسیع قطعات پر قبضہ کر لیا اور بزور شمشیر ان پر اپنا قبضہ برقرار رکھا۔ ان کی روش اپنے پڑوسی مالوی سکھوں سے بالکل مختلف تھی یہ نارمن امراء کے مشابہ تھے جو سات سو سال قبل ویلز کی سرحدوں پر اقامت گزیں ہوئے تھے۔

پنجاب میں ستلج کے اس پار سکھوں کا برسر اقتدار ہونا زیادہ مدت تک نہ نبھ سکا۔ مہاراجہ رنجیت سنگھ نے ایک ایک کر کے سب کو مغلوب کر لیا۔ رام گڑھیا' بھنگی' کنہیا سب بڑے بڑے گھرانے ایک دوسرے کے بعد مطیع ہوتے گئے اور یہ نوبت پہنچ گئی کہ سرداری برائے نام رہ گئی اور لاہور کے راجہ کی مرضی پر اس کے عدم وجود کا انحصار تھا۔

انبالہ' لدھیانہ' جالندھر' ہوشیار پور' امرتسر' لاہور' گرداسپور' گوجرانوالہ' سیالکوٹ اور فیروز پور کے اضلاع جہاں سکھوں کی سب سے زیادہ تعداد آباد ہے پنجاب کے سب سے زیادہ آباد اضلاع ہیں۔ نظم و نسق کے لحاظ سے ہر ضلع اپنی سیاسی مالی اور عدالتی

کاروائیوں کے لحاظ سے ایک واحد شے کی حیثیت رکھتا ہے اور چند اضلاع مل کر عموماً تین ضلعوں کا مجموعی رقبہ جس کو قسمت کہتے ہیں نظمی حیثیت سے زیادہ اہمیت رکھتے ہیں- پنجاب کی چار قسمتیں انبالہ' جالندھر' امرتسر اور لاہور وہ علاقے ہیں جن میں مذکورہ بالا تمام اضلاع جہاں سکھوں کی بودوباش ہے شامل ہیں اور اس امر کے باور کرنے کی کوئی وجہ نہیں ہے کہ رنجیت سنگھ (2) کے زمانے سے لے کر اب تک سکھوں کی تعداد کثیر کسی دوسرے ضلع سے ان اضلاع میں یا ان اضلاع سے کسی اور مقام پر منتقل ہوئی- یہ ممکن ہے کہ دیسی ریاست کے عروج ہونے پر تھوڑی مدت کے لئے سکھوں کی کوئی بڑی جماعت کسی دور دراز مقام سے امرتسر یا لاہور گئی ہو اور ساتھ ہی یہ بھی ممکن ہے کہ اب جو امن و امان اس علاقے میں قائم ہے اس کی بنیاد پر یہ بسنے والے ان ہی مقامات پر اور مسلمانوں کی عین بستیوں میں جہاں آج سے پچاس سال قبل وہ اپنی صورت نہ دکھا سکتے تھے رہ پڑے ہوں گے- لیکن ساتھ ہی یہ بھی یاد رکھنا چاہئے کہ سکھ اکثر زراعت پیشہ ہیں اور سوائے عارضی فوجی خدمات کے وہ اپنی موروثی املاک سے جدائی گوارا نہیں کرتے- اسی وجہ سے یہ ہوا ہے کہ سکھ آبادی کی تقسیم تعداد کے لحاظ سے مختلف مقامات میں اب بھی وہی پائی جاتی ہے جو مہاراجہ رنجیت سنگھ کے زمانے میں تھی- یہ معلوم کرنا ناممکن ہے کہ رنجیت سنگھ کے زمانے میں سکھوں کی تعداد کتنی تھی اور پنجاب کی جملہ آبادی کے ساتھ اس کا کیا تناسب تھا کیونکہ 1855ء کی مردم شماری سے قبل کے اعداد و شمار کا صحیح پتہ نہیں چلتا- 1868ء- 1881ء- 1891ء میں بھی مردم شماری کی گئی جن میں سے اخیر سال کے اعداد کی اشاعت اب تک نہیں ہوئی کہ اس سے سابق کی تعداد کا مقابلہ ہو سکے (3) اس امر کا دریافت کرنا دلچسپی سے خالی نہ ہو گا کہ جیسا کہ بعضوں کا خیال ہے اور 1881ء کی مردم شماری کی تعداد سے معلوم ہوتا ہے کہ سکھوں کی تعداد میں درحقیقت کمی ہو رہی ہے یا یہ کمی محض اتفاقی و عارضی تھی- بظاہر بہت سے امور اس مسئلے کے متعلق قابل لحاظ ہیں- سکھ سے مراد مذہب ہے نہ کہ قوم' ہندو کسی قوم کا کیوں نہ ہو شاعر کی طرح مادر زاد ہندو ہوتا ہے- اس کی پیدائشی حیثیت میں کبھی فرق نہیں آتا لیکن سکھوں کی حالت بالکل اس کے برعکس

ہے۔ سکھ کی اولاد اس وقت تک سکھ نہیں ہوتی جب تک کہ وہ بالغ ہو کر اکال بنگہ یا کسی دوسرے ایسے ہی مذہبی پاک مقام پر اس مذہب میں شریک نہ کیا جائے اور مذہبی تلقین پاہل حاصل نہ کر لے۔ اس طور پر امیدواران شرکت کی تعداد اس امر پر موقوف ہے کہ عام لوگ شرکت کو مفید یا غیر مفید تصور کرتے ہیں۔ رنجیت سنگھ کے زمانے میں جب کہ مذہبی جوش اور قومی فخر ایک ساتھ کام کر رہے تھے حاکمانہ مذہب میں داخل ہونے والوں کی تعداد نسبتاً زیادہ تھی۔ سرکار انگریزی نے جب 1855ء میں اول مرتبہ مردم شماری کی اس وقت بیرونی اثر تنزل کی طرف مائل کرتا تھا۔ خالصہ کی قوت ایسی گری تھی کہ پھر اس کے اٹھنے کی امید نہ تھی۔ اس کے افراد کو جدید حکام کے مزاج سے پوری واقفیت نہ تھی اور یہ خیال تھا کہ ممکن ہے کہ وہ ان لوگوں سے ناخوش ہوں جنھوں نے دو لڑائیوں پر مجبور کر کے زیر بار کیا۔ اسی وجہ سے سکھوں نے سکوت اختیار کیا اپنی اولاد کی شرکت مذہب کی رسم ادا کرنے سے باز رہے کیونکہ اس وقت توقف کر کے زمانے کا رنگ دیکھنا مناسب تھا اور پاہل کی رسم اس کے بعد بھی ادا کی جا سکتی تھی۔

1868ء کی مردم شماری کے موقع پر تعداد میں خوب اضافہ ہو گیا۔ غدر پھیل چکا تھا اور سکھوں نے بہ خوشی ہندوستان کے امن قائم کرنے میں اپنے فاتحین کا ساتھ دیا تھا۔ ان کی شرکت شکر گزاری کے قابل اور شاندار تھی۔ ہندوستان میں غالباً 1857ء کے غدر سے زیادہ مبارک کوئی واقعہ پیش نہیں آیا۔ اس نے ہندوستان کے افق کو تمام گرد و غبار سے پاک صاف کر دیا۔ اس نے اس کاہل پیٹ بھری فوج کا وجود مٹا دیا جس نے گو اپنی سو سال کی زندگی میں اکثر کارہائے نمایاں کئے تھے لیکن اب بیکار تھی۔ اس نے ناقابل ترقی' خود غرضانہ اور تاجرانہ طریقہ حکومت کی بجائے ایک بے رو رعایت اور مہذب طریقہ حکومت کی بنا ڈال دی اور اس نے سکھوں اور ان کے حکمرانوں کے درمیان رابطہ اتحاد و محبت قائم کر دیا اور ان کو ایسا بنایا جیسے وہ آج کل نظر آتے ہیں یعنی حکومت انگلشیہ کے سب سے بڑے معاون و مددگار بالاخر اس نے ہندوستان بلکہ تمام دنیا پر یہ ظاہر کر دیا کہ انگریزوں میں جرات اور قومی روح ایسی ہے کہ وہ مصائب کو

سچ سمجھتے ہیں۔ جنہوں نے کبھی یہ خیال تک دل میں نہ آنے دیا کہ اتفاقات جو ان کے موافق ہیں وہ شمار میں دو ہیں یا دس اور جنہوں نے ہمیشہ فتح کے وثوق کے ساتھ دھاوا کیا جب کہ کامیابی کی توقع بالکل نہ تھی۔ غدر کے بعد سے سکھوں نے دیکھا کہ ان کے نئے حاکم انہیں مشتبہ نظر سے نہ دیکھتے بلکہ ان پر اعتماد کرتے اور ان کو اپنا رفیق تصور کرتے ہیں۔ "سکھ" نام کی پھر وہی وقعت ہو گئی جو مہاراجہ رنجیت سنگھ کے زمانے میں تھی۔ یہ لفظ عزت کا نشان سمجھا جانے لگا اور جو شخص اس نام سے موسوم ہوتا اس کے لئے گویا فوجی خدمات کا دروازہ کھلا ہوا تھا۔ اس طور پر اس مذہب کو از سرنو قوت حاصل ہو گئی اور سکھوں کی کثیرالتعداد اولاد جن کی شرکت مذہب کے مراسم ملتوی رکھے گئے تھے اب انہیں پاہل دیا گیا اور جاٹوں اور ہندوؤں کی ادنیٰ اقوام سے بھی بہت سے لوگ اس مذہب میں داخل ہو کر ان میں مل گئے۔

اس جوش و خروش کے زمانے کے بعد قدرتی طور پر حالات نے پلٹا کھایا اور 1881ء کی مردم شماری کا 1868ء کی مردم شماری سے مقابلہ کرنے پر ظاہر ہوتا ہے کہ ہر مرکزی ضلع میں ان کی تعداد کم ہونے لگی۔ اس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ خود تختوں کی ترتیب صحیح نہ تھی اور غلطی سے نانکی سکھ جو لفظ سنگھ اپنے نام کے ساتھ استعمال نہیں کرتے دسویں گرو گوبند کے پیروؤں کے ساتھ شامل کر لئے گئے تھے لیکن سب سے بڑی وجہ ہندو مذہب کی زبردست کشش تھی جس نے امن کے زمانے میں جب کہ جنگجو خصلت کا اثر کم ہو جاتا ہے لوگوں کے دلوں پر اپنا قبضہ قائم رکھا۔ اس کی تاثیر عشق پیچے کی بیل کی سی ہے جو ایک بار اس کی گرفت میں آ گیا اسے جکڑ کے دبوچ لیا اس نے تقریباً تمام مذاہب کو جیسے سکھ اور بودھ مذہب پر دونوں ہندو مذہب کی اتحادی صورتیں تھیں جب برسر مقابلہ ہوئیں تقریباً خاتمہ کر دیا۔ مغرب میں رومی کلیسا کی جو حالت ہے وہی مشرق میں ہندو دھرم کی ہے۔ جب کہ جوار بھاٹے کی طرح اس کا جزر ہوتا ہے اور حریف مقابل اپنی فتح کا یقین کر لیتے ہیں یہ اپنی پہلی قوت کے ساتھ طوفان بن کے پلٹتا ہے۔ ہندو مذہب ہمیشہ سے سکھ مذہب کا مخالف رہا ہے کیونکہ سکھ مذہب نے اس کے اہم اصول ذات کی جو اس کی جان ہے شدت سے مخالفت کی ہے

اور اگر یہ اصول نہ رہے تو برہمنی نظام مردہ ہو کے زمین پر لیٹ جاتا ہے۔ سکھ مذہب پر ہندو مذہب کا اثر دو طریقے پر ہوتا ہے ایک تو بچوں کے پاہل کی رسم ادا کئے جانے سے والدین کو باز رکھنا دوسرے خود ان سکھوں کو جو ان میں شامل ہو گئے ہیں ان کے مذہب سے منحرف کرنا۔ چند رسوم بطور کفارہ ادا کرنے۔ برہمنوں کو کچھ دان دینے اور فوجی لقب کو اپنے نام سے جدا کر دینے پر سکھ پھر جاٹوں کے گروہ میں عام ہندوؤں کی حیثیت سے شامل کر لیا جا سکتا ہے۔ سکھوں میں مذہب و نام کے تبدیل نہ کرنے پر بھی جزوی معاملات میں ہندو مذہب کے اصول کی پیروی کرنے کا عام رجحان ہے اور یہاں بھی دوسرے ممالک کی طرح عورتوں کا اثر اس معاملے میں غالب رہتا ہے۔

ہندو عورتوں کے لئے جو بالکل ناخواندہ ہوتی ہیں سکھ مذہب کے فلسفیانہ الہیات یا گرو گوبند کی سیاسی تعلیم ہندو مذہب کی بت پرستی کے مقابلے میں زیادہ دلکش اور ان کی سمجھ سے مناسبت رکھتی ہے اور وہ ان کی مذہبی رسوم کی رنگ آمیزی کر کے جان ڈالتی ہے جو سری گرنتھ کے منتروں کی جاپ سے ممکن نہیں۔ ہندو دھرم کی رسمیں ادا کرنے کے لئے وہ اپنے گاؤں کی ہجولیوں میں مل جل کے باہر جاتی ہیں اور صبح کو مندر یا ان پتھروں پر جن کو سیندور لگایا ہے جہاں ٹھاکر جی کا استھان ہے جو گاؤں کے نگہبان ہیں۔ ہندو دھرم کے سینکڑوں تہوار منانا دیول کا جانا ایک ہنگامہ جوش خروش اچھے اچھے کپڑے پہننا ان عورتوں کے دل بہلاوے ہیں ورنہ ان کی زندگی نہایت اداس اور ایک ہی حالت پر رہنے سے دم اکتا جاتا ہے۔ صرف مذہب ہی کی آڑ میں ان کی زندگی نرمی سے کٹتی ہے ان عورتوں کا ہندو اور سکھ مذہب کا فرق سمجھ کر اسے قبول کرنا ایسا ہی ہے جیسے کسی انگریز عورت کا ناچ کا جلسہ چھوڑ کے کویکر فرقے کی رہبانیت کو پسند کرنا علاوہ ازیں بریں پروہت کا اثر خواہ وہ کیتھولک مذہب کا ہو یا برہمن' عورتوں پر مردوں سے زیادہ بھاری ہوتا ہے۔ اس زندگی کی خوشحالی اور مرنے کے بعد مکت اس کا انحصار گرو کی ذات پر ہے۔ برہمن پنڈت اولاد کی امید دلانے میں وعدہ کرتے ہیں کہ سوت کی پریت اوس کے سوامی کو نہ موہ سکے گی۔ ہندو دھرم کی رسموں کے بجا لانے پر اس کی آئندہ بھلائی کا ذمہ ہے۔ مرد بھی انہیں خیالات سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتے۔

برہمنی مذہب کی روایتیں ایسی قوی ہیں کہ جدید اصلاح ان کو روک نہیں سکتی۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ لوگ پھر ہندو مذہب میں پلٹ کے آ جاتے ہیں۔ سکھ گو تمباکو نہ پئے اور ڈاڑھی یا سر کے بال نہ کتروائے مگر پھر بھی برہمن کی عظمت اور اپنی قدیم مذہب کی دیویوں میں حاضر ہو کے ہندوؤں کی وہم پرستی کے رسوم بجا لاتا ہے۔ ذات پات کے بارے میں سکھوں نے بہت کچھ اپنی آزادی برقرار رکھی ہے اور اگر ضرورت ہو تو وہ عیسائی یا مسلمان کے برتنوں میں کھا پی سکتا ہے۔ مگر وہ کبھی ایسی ذات والوں کے ساتھ میل جول نہیں رکھتا جسے ہندو لوگ ناپاک تصور کرتے ہیں۔ خاکروب یا مزبی سکھ جن کی تعداد کثیر ہے (کیونکہ ظاہر ہے سکھ مذہب زیادہ تر نیچ ذات والوں کے لئے زیادہ دلکش رہا ہے) سکھوں کے گوردواروں میں داخل نہیں ہو سکتے۔ سرکار انگریزی نے مجبوراً اس ذات والوں کے لئے جو اپنی اعلیٰ ذات والے ہم مذہبوں سے لڑائی کے موقع پر بہادری میں کم نہ رہے الگ رجمنٹیں قائم کیں۔

تعجب ہے کہ خالصہ کے زمانہ انتہائے عروج میں بھی پنجاب کی آبادی میں بہت کم تعداد ان لوگوں کی تھی جنہوں نے سکھ مذہب قبول کیا۔ اس صدی کے ابتدائی زمانے کے مجنونانہ غلو کا نتیجہ یہ ہوا کہ زمانہ مابعد میں مہاراجہ نے ایک بے مثل فوجی جماعت قائم کر لی اور ان لوگوں نے جو شمار میں ہندوؤں کی ایک ذات والوں کی تعداد سے زیادہ نہ تھے یکجہت ہو کر تمام پنجاب و کشمیر کو تاخت و تاراج کیا۔ افغانوں کو شکست دے کر ان کو کوہستان میں واپس بھیج دیا اور ایک زبردست سلطنت قائم کر دی جس میں تعداد کی مناسبت ہندو مسلمانوں کے مقابلے میں ایک اور دس کی تھی۔

پنجاب کی مردم شماری باستثناء کشمیر 1881ء میں 2 کروڑ 27 لاکھ 12 ہزار 120 تھی جس میں سے ایک کروڑ 16 لاکھ 62 ہزار چار سو چونتیس مسلمان۔ 92 لاکھ 32 ہزار دو سو پچانوے ہندو اور 17 لاکھ 16 ہزار ایک سو چودہ سکھ تھے۔ صرف انگریزی علاقے میں ہر دس ہزار کی عام آبادی میں 595 سکھ یعنی 1868ء کی مردم شماری کے مقابلے میں جب کہ تعداد 650 تھی ہر دس ہزار میں 55 کی کمی واقع ہوئی۔ جن اضلاع میں سکھوں کی آبادی نسبتاً زیادہ ہے وہ فیروز پور' امرتسر اور لدھیانہ ہیں۔ فیروز پور میں دس ہزار

آبادی میں 2 ہزار پانچ سو پچانوے۔ امرتسر میں دو ہزار چار سو بائیس اور لدھیانہ میں 2 ہزار پچپن کی تعداد ہے اگرچہ رنجیت سنگھ کے زمانے میں سکھوں کی آبادی نسبتاً زیادہ ہو لیکن غالباً وہ وسطی اضلاع میں زیادہ تعداد میں مجتمع تھی اور خالصہ کے زمانہ عروج میں بھی ان کی تعداد کبھی 20 لاکھ (4) سے زیادہ نہ تھی۔

دیسی ریاستوں میں پنجاب کی تمام سکھ آبادی کا ایک ثلث سکونت رکھتا ہے۔ قدرتی طور پر پٹیالہ سب سے بڑھا ہوا ہے عام آبادی کی نسبت سے وہاں ہر دس ہزار میں دو ہزار سات سو اکاسی سکھ ہیں۔ ذات کے لحاظ سے ان کی تقسیم کا مسئلہ بہت دلچسپ ہے لیکن گزشتہ مردم شماری سے پہلے کبھی ٹھیک تعداد معلوم کرنے کی کوشش نہیں کی گئی اب معلوم ہوا کہ اس صوبے کی مختلف قسمتوں میں ایک ہزار سکھوں میں سے چھ سو ننانوے جاٹ' راجپوت' سانسی اور کمبوہوں کی زراعت پیشہ ذات کے ہیں ستلج کے جنوبی اضلاع میں اس تعداد میں نسبتاً زیادتی ہے اروڑہ' بنیے اور کھتری کی تجارت پیشہ ذاتوں میں ان کی تعداد 47 فی ہزار ہے اور کمہار' بافندے' لوہار' نجار' سنار' حجام اور اسی قسم کی اہل حرفہ ذاتوں میں ان کی تعداد 134 فی ہزار ہے اور دوسری پنچ ذاتوں میں 95 فی ہزار سکھ پائے جاتے ہیں۔ سکھوں کے اہل حرفہ کی ذات کے لوگ تمام اضلاع میں یکساں نسبت سے پائے جاتے ہیں لیکن تجارت پیشہ سکھ مسلمانوں کے اضلاع میں زیادہ آباد ہیں۔ ان میں سے بعض مثلاً راولپنڈی کی قسمت میں یہی لوگ سکھ آبادی کا ایک بہت بڑا جزو ہیں۔ مذہبی ذاتوں برہمن اور فقراء میں ان کی تعداد بالکل نہ ہونے کے برابر ہے۔ پنجاب کے تمام سکھوں میں 4 فی ہزار پروہتوں کی جماعت میں شامل ہیں۔ سکھوں کا ماخذ زیادہ تر جاٹ ہیں۔ اس ذات کی تقسیم در تقسیم بہت سے فرقوں اور قبیلوں میں ہے اور پنجاب کی تمام ذاتوں میں یہی ذات سب سے زیادہ قابل لحاظ ہے۔ جاٹوں کی اصلیت اب تک کماحقہ دریافت نہیں ہوئی ہے اور اس پر بہت کچھ مباحثہ ہوتا رہا ہے۔ بعض مشہور مورخین نے ان کا گیڈک نسل سے ہونا بیان کیا ہے لیکن پنجاب کے جاٹوں کی روایتوں کے لحاظ سے ان کے تمام فرقے دراصل راجپوت نسل سے ہیں اور انہوں نے وسط ہند سے پنجاب میں آکر سکونت اختیار کی

کئی۔ سندھو اور وڑائچ جاٹ بھی جو دریائے سندھ کے پار کے باشندوں کی نسل سے ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں اپنی اصلیت کے بارے میں متفق الرائے نہیں ہیں اور دونوں فرقوں کے کثیر افراد راجپوتانے کو اپنا قدیم وطن بتاتے ہیں۔ دریائے سندھ کے مغرب سے اور کسی قوم کے نقل مکان کر کے آنے کا تاریخ سے پتہ نہیں چلتا صرف سندھو اور وڑائچ کے بانیوں ہی کے تبدیل وطن کرنے کا پتہ چلتا ہے اور کہا جاتا ہے کہ یہ سب سے علیحدہ وطن ترک کر کے یہاں آباد ہوئے ہیں۔ پنجاب کے جاٹوں کی زبان میں بھی کوئی ایسی بات نہیں ہے جس سے ان کے گیڈک نسل کے ہونے کی تائید ہو سکے۔ اس مضمون کے متعلق خود میری ذاتی تحقیقات نے جو کسی زمانے میں بہت وسیع تھیں مجھے اس امر کا یقین دلایا اور مسٹر ایبٹسن مردم شماری کی رپورٹ کے مؤلف بھی میری اس رائے سے متفق ہیں کہ جاٹ و راجپوت عموماً ایک ہی نسل سے ہیں اور موجودہ امتیاز صرف تمدنی معاشرت کی حیثیت سے ہے نہ کہ بلحاظ تقسیم اقوام۔ جاٹ تعداد میں راجپوتوں سے تگنے ہیں اور ان کی فوجی قابلیت عمدہ کاشتکار محنتی و ایماندار اور فرمانبرداری کے لحاظ سے وہ پنجاب کی اقوام میں قابل قدر و اہم فرقہ تصور کئے جاتے ہیں یہ لوگ اپنے طور طریقوں میں بالکل آزاد ہیں اور بجائے جماعت یا گروہ کے زیر اثر ہونے کے بہ نسبت اور اقوام کے وہ بہ شدت شخصی آزادی کے حامی ہیں۔ گو وہ موقع پر لڑنے مرنے کو تیار ہو جاتے ہیں لیکن فطرتاً" وہ ظالم و کینہ پرور نہیں ہیں اور امن کے زمانے میں عمدہ رعایا اور لگان ادا کرنے والے ہوتے ہیں کیونکہ وہ صبر و استقلال و کامیابی کے ساتھ اپنا پیشہ زراعت انجام دیتے ہیں۔ معاشرتی زندگی میں برہمن' راجپوت اور کھتریوں کے بعد ان کا مرتبہ تصور کیا جاتا ہے لیکن وہ خود اپنے آپ کو راجپوتوں کے مساوی اور کھتریوں سے بالاتر شمار کرتے ہیں اور گزشتہ واقعات و موجودہ حالات کے لحاظ سے ان کا یہ دعویٰ قابل قبول بھی ہے۔ دریائے بیاس و ستلج کے قرب و جوار کے اضلاع میں جہاں سکھ سکونت گزین ہیں یہ لوگ سب سے اچھی حالت میں نظر آتے ہیں۔ جنوبی اور سرحدی اضلاع میں ان کی حالت جداگانہ ہے۔ اکثر حالتوں میں ان کی اصلیت راجپوت نسل سے علیحدہ ایک اور قوم معلوم ہوتی ہے۔

اس طور پر سکھوں کی خوبیاں اور جاٹوں کی خوبیاں ایک ہی شے ہیں۔ کیونکہ سکھ اسی قوم کے لوگ ہیں۔ نئے مذہب نے ان میں ایک فوجی جذبہ پیدا کر دیا ہے جو اس مذہب کی خاص روایات میں سے ہے اور سرکار انگریزی کو ان کے اس جذبے کو برقرار رکھنے کی کوشش کرنا چاہئے۔ اب چونکہ سرکار انگریز کا اقتدار ہندوستان میں یکسوئی حاصل کر چکا ہے اور سال بہ سال اس کی مزاحمت میں انحطاط ہوتا جا رہا ہے تو لازمی طور پر فوجی اقوام کو اپنے فوجی جذبات کے اظہار کا کم موقع ملتا ہے۔ ہر جگہ سپاہی کاشتکاری کے کام میں مصروف ہوتے جاتے ہیں۔ یہ لوگ تلوار کو کوٹ پیٹ کر ہل کی نوک بنا لیتے ہیں اور اب ہمیں اس امر کا فخر ہے کہ سرکار انگریزی کی جے پکاری جاتی ہے گویا کہ تمام ملکی نظم و نسق کی کامیابی کا دار و مدار و انحصار امن پر تھا۔ لیکن ہندوستان جیسی سلطنت کے لئے جس کی آبادی اٹھائیس کروڑ اسی لاکھ ہے جس کو بہت سے بیرونی خطرات کا اندیشہ ہے اور جس کی تاک میں دشمن لگے رہتے ہیں اس کی سلامتی کے لئے لڑائی اشد ضروری ہے۔ تلوار ہمیشہ تیز رکھنا چاہئے اور زیادہ عرصے تک اس کو نیام میں رکھ کر زنگ آلود نہ ہونا دینا چاہئے۔ اگر ہندوستان کے حکمران واقعی دانشمند ہیں تو وہ سکھوں کی فوجی خدمات کو برقرار رکھنے میں ان کی ہمت افزائی کرتے رہیں گے اور ہر موقع پر انہیں مصروف کار رکھیں گے خواہ جنگ یورپ میں ہو یا ایشیا یا افریقہ میں۔ سب سے بڑی ضروری اور اہم بات یہ ہے کہ ان کو اس قسم کی فوجی تربیت دی جائے کہ وہ ہر طرح کے دشمن کی مدافعت کرنے کے قابل ہوں خواہ دشمن یورپین اقوام سے ہو یا ایشیائی۔ انگریزی فوج کی تعداد اس درجہ کم اور اس کی نظم و ترتیب ایسی ناقص ہے کہ ہندوستان کو بظاہر بیرونی حملوں کی مدافعت کے لئے خود ہی ہر حالت میں تیار رہنا چاہئے اور اس غرض کے لئے پنجاب کی جنگجو اقوام خصوصاً سکھ کافی ہیں بشرطیکہ ان کی محفوظ فوج مصیبت پڑنے سے پہلے مرتب کر لی جائے اور اس امر کا خیال رکھا جائے کہ ان کے فوجی جذبات بالکل مردہ نہ ہو جائیں۔

سکھوں سے تکلیف مالایطاق کی توقع رکھنا بالکل بے سود ہے۔ سرکار انگریزی کے تحت میں ان کی اصلی قدر و قیمت کا اندازہ غدر کے موقع پر ہو چکا ہے جب کہ ایس روو

آر وئے ستلج کے راجاؤں پٹیالہ' نابھہ' جیند اور کپور تھلہ ہنگامے کی خبر پاتے ہی بغیر اس امر کا انتظار کئے کہ یہ شگون نیک ہے یا بد اپنی فوجوں کے ساتھ دہلی کی طرف سلطنت انگریزی کے دشمنوں پر حملہ کرنے کے لئے روانہ ہو گئے۔ ان کی اس بہادرانہ مثال کی تقلید تمام صوبے کے سکھوں نے کی اور ہندوستان کا ملک ملکہ معظمہ کے لئے جس طرح انگریزی سپاہ کی سنگینوں سے حاصل ہوا اسی طرح پنجابی رعایا کی سرگرمی و وفاداری سے ہے۔ لیکن سکھ کسی عہدے پر یا میونسپل کمیٹیوں میں کام کرنے کے لئے بالکل موزوں نہیں۔ اس امر کے ثبوت کا ذکر آگے چل کر رنجیت سنگھ کے انتخاب وزراء کے واقعات بیان کرنے کے موقع پر ہو گا۔ اسکول اور کالجوں میں بھی سکھ طلباء دوسری اقوام کے تمام طلباء سے پیچھے رہ جاتے ہیں۔ لیکن مشرق میں علمی مدارج کی کامیابی کسی عہدے کے لئے موزونیت کا معیار تصور نہیں کی جاتی۔ خوشامدی اور منکسرالمزاج بنگالی مقابلے میں غالباً اس سے بازی لے جائے گا حالانکہ نہ تو اس میں لڑنے کے لئے جسمانی طاقت اور نہ حکومت کرنے کے لئے اخلاقی قوت ہوتی ہے۔ جو لوگ جاٹ سکھوں کی کار آمد رعایا کی حیثیت سے اس بنا پر قدر نہیں کرتے کہ وہ اپنی موروثی خصلت و تربیت کے باعث تحصیل علم کی جانب رجحان کرنے سے قاصر ہیں وہ سخت غلطی پر ہیں۔ سکھ ایک جنگجو قوم ہے اور ان کے اعلیٰ اوصاف کا اظہار فوج میں ہو سکتا ہے جو ان کا قدرتی پیشہ ہے۔ وہ بہادر اور جفاکش ہوتے ہیں۔ ان کو اپنی مغلوبیت کا احساس فطرتی طور پر کم ہے۔ ضبط و تربیت کے بشدت پابند اور اپنے افسروں کے ساتھ وفادارانہ سلوک کرنے کے عادی ہوتے ہیں۔ انہیں ذات پات کی پروا نہیں ہوتی جس کی وجہ سے اکثر ہندو افواج میں انتظام برقرار رکھنے اور بہنگام جنگ ان کے خوردونوش کا بندوبست کرنے میں دشواریاں پیش آتی ہیں۔ یہی وجوہ ہیں جن کی بناء پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ مشرق میں تمام دوسری اقوام پر سپاہی کی حیثیت سے انہیں فوقیت حاصل ہے ملکہ معظمہ کی رعایا میں اور بہت سی جنگجو اقوام ہیں مگر اس سے انکار نہیں ہو سکتا کہ ان سب میں سکھ سب پر قابل اعتماد اور کار آمد سپاہی ہونے کی حیثیت سے سبقت لے گئے ہیں۔ گورکھا بھی انہیں کی طرح بہادر اور میدان جنگ میں جانباز ہوتے ہیں لیکن بدقسمتی سے ان کی

تعداد بہت کم ہے اور سرکار انگریزی کے علاقے میں یہ لوگ زیادہ تعداد میں سکونت نہیں رکھتے۔ ان میں سے اکثر نیپال کے باشندے ہیں اور بعض اوقات حالات ایسے پیش آ جاتے ہیں کہ فوج میں بھرتی کرنے کے لئے اعلیٰ درجے کے افراد کافی تعداد میں دستیاب نہیں ہوتے۔

راجپوت اعلیٰ درجے کے سپاہی ہوتے ہیں گو سکھوں کا سا ان کا جسم و جثہ نہیں ہوتا۔ لیکن اعلیٰ درجے کے راجپوت دستیاب ہونا دشوار ہے اور جو لوگ ہماری سلک ملازمت میں داخل ہوتے ہیں وہ اکثر مخلوط النسل پہاڑی ڈوگرے ہوتے ہیں جن کو وسط ہند کے نجیب الاصل راجپوت نظر حقارت سے دیکھتے ہیں۔ علاوہ بریں یہ اعلیٰ درجے کے لوگ ہماری فوج میں اس وقت تک شریک نہ ہوں گے جب تک انہیں کے ذات والوں کو ان کی فوج کا عہدہ دار مامور کرنے کا کوئی انتظام نہ ہو پنجابی مسلمان' گکھڑ' اعوان اور ٹوانہ اقوام کے لوگ نیز شمال مغربی سرحد کے افغان جرگے بہادر سپاہی تو ضرور ہوتے ہیں لیکن اگر انہیں عرصے تک میدان جنگ میں مصروف رکھا جائے تو انہیں گھر کی یاد ستاتی ہے اور اکثر کو تو سرحد پر عبور کرنے کی ترغیب دینا ناممکن ہے اور ہر حالت میں ان کوہستانی اقوام کے لوگ طبعاً" اس قدر آزاد اور خودمختار ہوتے ہیں کہ ان کو تہذیب و تمدن کی پابندیوں میں جکڑنا ناممکن ہے۔ وہ یہ مصیبت نہیں اٹھا سکتے۔ لیکن سکھ ہر حال میں یکساں ہے۔ دیس و پردیس جنگ و امن ہر حالت میں شاد و خوش رہتا ہے جیسا وہ مستحکم سوار ہے ویسا ہی مستقل پیادہ اور گولیوں کی بوچھاڑ میں وہ ایسا ہی مستقل مزاج رہتا ہے جیسا کہ ہلہ کرنے کے لئے وہ بے صبری ظاہر کرتا ہے۔ دیسی افواج میں صرف سکھ ہی ایسے ہیں جو تعداد کثیر میں ملک سے باہر عرصہ دراز تک مصروف پیکار رکھے جا سکتے ہیں بشرطیکہ انہیں معقول مشاہرہ دیا جائے کیونکہ اسکاٹ لینڈ کے لوگوں کی طرح وہ بھی روپے کی قدر و قیمت سے بہ خوبی آشنا اور اس کے جمع کرنے کے دلدادہ ہیں۔ انہوں نے مصر' حبش' افغانستان اور چین میں کارہائے نمایاں انجام دیئے ہیں۔ انہوں نے برضا و رغبت برما میں پولیس اور مقامی فوجی دستے میں ملازمت اختیار کی حالانکہ یہ ملک ایسا ہے جسے عام طور پر اہل ہند ناپسند کرتے ہیں۔

بانگ کانگ میں بھی سکھوں کا پولیس کا ایک دستہ ہے اور وہاں ان کی بہت کچھ وقعت ہے اور ان پر اعتماد کیا جاتا ہے۔ مسٹر جانسٹن کے ساتھ جو سرکار انگریزی کے ایجنٹ نتزل اور نیا سا جھیل پر عرب بردہ فروشوں سے برسرپیکار تھے سکھوں کی ایک جماعت محافظ دستے کی حیثیت سے مامور تھی۔ حیرت ہوتی ہے کہ یہ سنجیدہ اور باوقعت اور مطیع اشخاص جو اب ہماری فوجوں میں شامل ہیں انہیں لوگوں کی نسل سے ہیں جو وحشی لٹیرے تھے اور سو سال قبل شمالی ہند میں ان کے نام سے لوگ کانپتے تھے۔ لیکن یہ تبدیلی ایک طاقت ور اور مہربان حکومت کی بہ دولت نیز اس فوجی تربیت کی وجہ سے واقع ہوئی جو ہمدرد عہدہ داروں کی زیر نگرانی عمل میں آئی جن کی اہل فوج وقعت کرتے اور ان سے مالوف و مانوس تھے۔ افغانستان کی لڑائی کے آخر زمانے میں مجھے سکھ فوج کے طور طریق دیکھنے کے بہت سے موقعے دستیاب ہوئے۔ ان کے مصائب پر صبر و تحمل کرنے اور افغانوں کے ساتھ جو ان کے قدیم جانی دشمن تھے پسندیدہ قواعد کی پابندی کے متعلق ان کی جس قدر تعریف کی جائے بجا ہے۔

اس امر کا تصفیہ آئندہ موقع پر ہو سکے گا کہ یورپین اقوام کے مقابلے میں ان کی فوجی خدمات کس درجہ مفید و کار آمد ہو سکتی ہیں مجھے اس امر کا پورا یقین ہے اور میرے اس خیال سے ہندوستان کی افواج کے اکثر ذی وقعت عہدہ دار متفق ہیں کہ سکھوں کی پیدل اور سوار فوج اگر انگریز عہدہ داروں کے زیر نگرانی دشمن کے مقابلے پر لائی جائے تو دنیا کی ہر فوج کے ہم پایہ اور اپنے حریف مقابل سے بہتر ثابت ہو گی۔

سکھوں کی مذہبی حکومت

مہاراجہ رنجیت سنگھ سکھوں کی مذہبی حکومت کا ایسا کامل نتیجہ تھا اور اس میں خالصہ کی روح اس درجہ سمائی ہوئی تھی کہ اس کی طبیعت اور کردار کا بیان ہرگز پورا نہیں ہو سکتا جب تک اس مذہبی نظام کا تفصیلی بیان نہ کیا جائے جس نے پنجاب کے جاٹ کاشتکاروں پر اٹھارہویں اور انیسویں صدی کے نصف اول میں بہت قوی اثر کیا تھا۔ یہ مضمون اس قدر وسیع اور پیچیدہ ہے کہ بیان اس کا تفصیل کے ساتھ تو کیا بلکہ اس کا خلاصہ بھی قابل اطمینان انداز سے نہیں ہو سکتا۔ جن لوگوں کو سکھوں کے اصول' عقائد اور اخلاق سے کماحقہ واقفیت حاصل کرنا ہو' چاہئے کہ ادی گرنتھ یا سکھوں کے مذہبی نوشتے کا ترجمہ اصل گرمکھی سے مع افتتاحی مضامین ڈاکٹر ارنسٹ ٹرمپ رلس پروفیسر السنہ مشرقیہ میونخ یونیورسٹی ملاحظہ کریں۔ ڈاکٹر موصوف کو 1870ء میں سیکرٹری آف اسٹیٹ نے یہ اہم کام تفویض کیا تھا۔ جب ڈاکٹر ٹرمپ اس خدمت کے انجام دینے میں مصروف تھے میں گورنمنٹ کے چیف سیکرٹری کے عہدے پر لاہور میں تھا۔ یہ کام سخت مشکل تھا لیکن ان کے شوق' محنت اور تبحر علمی نے اس کو پورا کیا۔ ڈاکٹر صاحب کو معلوم ہوا کہ سکھوں کے گرو اور گرنتھی (جو ان نوشتوں کے پڑھنے اور بیان کرنے والے ہوتے ہیں) اپنے مذہب کے اصول سے ناواقف اور قدیم گرمکھی زبان کی ترکیب اور محاورات سے ناآشنا ہیں اور مشتبہ مقامات کا جو مطلب بیان کرتے ہیں وہ بھی ایسا ہوتا ہے جو مدت سے ان میں سینہ بہ سینہ چلا آیا ہے اور جو گرنتھ کے دیگر مقامات سے اختلاف بھی رکھتا ہے۔ بہرکیف چند نادر الوجود شرحوں کو دستیاب کرنے کے بعد جو اصل کتاب کی مثل نامکمل اور مشکل تھیں ڈاکٹر ٹرمپ صاحب نے کسی طرح اپنا کام ختم کیا۔ لیکن اس سے پہلے ان کو ایک مجموعہ لغات اور

صرف و نحو خاص گرنتھ کے متعلق تیار کرنا پڑا جس میں گرمکھی کی ترکیبیں اور متروک الفاظ درج کیے۔ اس کام کو اٹھانے میں جو جو مشکلات پیدا ہوئیں معلوم ہوتا تھا کہ وہ کبھی حل نہ ہوں گی چنانچہ نوبت بہ ایں جا رسید کہ ڈاکٹر موصوف باوجود میرے سخت اصرار کے لاہور چھوڑ کر جرمنی روانہ ہو گئے اور وہاں سات برس کی مسلسل کوشش کے بعد ان کا ترجمہ شائع ہوا۔ گو یہ ترجمہ عام طور پر دلچسپ نہیں ہو سکتا لیکن وہ ہمیشہ ایک عالم کی جان فشانی اور علمیت کی یادگار رہے گا۔ اس سے پہلے سکھ مذہب کے حالات کپتان جوزف کننگھم اور مسٹر ایچ ایچ ولسن نے اپنی کتابوں میں جو ہندوؤں کے مذہبی فرقوں کے بیان میں ہیں لکھے تھے۔ مگر یہ حالات بہت کم اور ناقص طور پر بیان ہوئے ہیں جس کی وجہ یہ ہے کہ یہ لکھنے والے خود کوئی علم سکھوں کی مذہبی کتابوں یا ان کی شرحوں کا نہ رکھتے تھے۔ بلکہ یہ بات تو اب تک آسان نہیں ہوئی ہے کہ ادی گرنتھ کی پیچیدہ و مشکل عبارت میں اصول عقائد کا جو نازک سلسلہ ایک سرے سے دوسرے تک چلا گیا ہے وہ پڑھنے والے کی نظر سے غائب نہ ہونے پائے۔ ادی گرنتھ میں اکثر معمولی امور کس کس اختلاف سے بار بار بیان ہوئے ہیں اگرچہ اس کے بعض حصے جن میں بھگت کبیر اور بھگت فرید کے اشلوک جو گرنتھ میں بطور ضمیمے کے اضافہ ہوئے ہیں ایسے ہیں کہ ان کے اکثر فقروں کی عبارت دل آویز اور خوشنما ہے اور گو ان پر شعر کا اطلاق صحیح نہیں ہو سکتا تاہم ان میں شعر کی بہت سی خوبیاں پائی جاتی ہیں۔ ان کا انداز زیادہ تر والٹ وٹمین امریکہ کے شاعر کے کلام کا سا ہے اور اس کے کلام سے ان کا مقابلہ مناسب ہے۔

ادی گرنتھ کی خاص سند بابا نانک تک پہنچتی ہے جو سکھ مذہب کے بانی تھے اور جنہوں نے سترہویں صدی کے اوائل میں اس کے اکثر مقامات تصنیف کیے۔ گرو ارجن نے جو سکھوں کا پانچواں گرو یا بڑا اوتار مانا جاتا ہے اسے موجودہ صورت میں مرتب کیا۔ اس نے نانک کی تحریر کے ساتھ اس کے جانشینوں اور دوسرے قدیم ہندو متصوفین کی تحریریں اضافہ کیں۔ سکھوں کے مابعد کے فوج و ملکی دستور العمل کے حصر ضبط کی حیثیت سے ادی گرنتھ سے زیادہ گرو گوبند کی تحریریں اہم تصور کی جاتی ہیں جو

سکھوں کے دسویں اور سب سے بڑے گرو مانے جاتے ہیں۔ انہوں نے 1696ء میں ایک ضخیم کتاب مرتب کی جس میں کچھ تو خود ان کی ذاتی تصنیفات ہیں اور کچھ ان ہندی شعراء کی مدد سے تحریر کیا گیا ہے جو ان کے حاشیہ نشین تھے۔ اس میں قدیم متروک الاستعمال اور نہایت مشکل ہندی زبان میں اس نئے مذہب کے اصول بیان کئے گئے تھے جس کی گرو گوبند تبلیغ کرتے تھے۔ گرو گوبند نے نانک کے صوفیانہ مشرب میں کسی خاص قسم کی تبدیلی نہیں کی اگرچہ ان کی تعلیم اور عمل صریحاً ہمہ اوست کے اصول پر رہا۔ وہ خود درگا دیوی کی پوجا کرتے رہے اور ہندوؤں کے دوسرے معمولی بتوں کی پرستش جائز رکھتے تھے گو وہ خدائے تعالیٰ کی ذات واحد کی عبادت کو مرجح سمجھنے کے بھی حامی تھے۔

اس کتاب میں اتنی گنجائش نہیں کہ دسوں گروؤں کے حالات مفصل قلمبند کئے جا سکیں۔ ان کے متعلق جو کچھ بیان کرنا ضروری ہے وہ چند ہی اوراق میں تحریر ہو سکتا ہے۔

نانک جو اس مذہب کا بانی تھا اس کی معتبر سوانح عمری "جنم ساکھی" ڈاکٹر ٹرمپ نے انڈیا آفس کے کتب خانے سے ڈھونڈ نکالی۔ یہ سوانح عمری ایچ ٹی کولبرک نے انڈیا آفس کو نذر کی تھی۔ نانک 1469ء میں موضع تلونڈی میں پیدا ہوا تھا جو بعد میں ننکانہ کے نام سے گرو کے نام پر مشہور ہوا۔ یہ موضع شہر لاہور کے قریب دریائے راوی کے کنارے پر واقع ہے۔ وہ کھتری یا تجارت پیشہ ذات کا تھا اور گاؤں کے معزز عہدہ پٹوار گری یا محاسبی پر مامور تھا۔ اس کے بچپن اور جوانی کے متعلق جیسا کہ ہر ایک کثرت سے پھیلنے والے مذہب کے بانیوں کے متعلق ہوتا آیا ہے عجیب عجیب خوارق عادات کے قصے بیان کئے جاتے ہیں۔ بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ اس کی زندگی عام لوگوں کی طرح کی تھی۔ اس نے شادی بھی کی اور بچے بھی ہوئے۔ ایک روز وہ دریا میں اشنان کرنے جا رہا تھا کہ فرشتے اسے اٹھا کر خدا کے حضور میں لے گئے جہاں اسے پیشین گوئی کی قدرت عطا فرمائی گئی اور روئے زمین پر خدائے واحد کے متعلق دنیا میں منادی کا حکم ہوا۔ اس خدائی حکم کی پابندی میں نانک نے بیوی بچوں کو خیرباد کہہ کر

صرف ایک چیلے کے ساتھ جس کا نام مردانہ تھا وطن ترک کیا اور فقیرانہ لباس اختیار کر کے دنیا میں اس نئے مذہب کی تعلیم دینے کے لئے شہر بہ شہر پھرنا شروع کیا۔ سکھ وقائع نویسوں نے اس کے مشرق و مغرب شمال و جنوب اور ایک ایسے فرضی ملک کے سفر کے واقعات تحریر کئے ہیں جس کو وہ گورک ہتری کہتے ہیں۔ جو ہندوستان میں گویا یوٹوپیا کی مثال ہے۔ لیکن ان سفروں میں جن میں بہت سے ناقابل یقین عجائبات کا وقوع بیان کیا جا سکتا ہے۔ کوئی ایسا اہم واقعہ بجز اس کے نہیں کہ اس بڑے گرو کی ملاقات شاہ بابر سے ہوئی اور وہ بہت مہربانی اور اخلاق سے پیش آیا۔ اس زندہ دل ذی شان فرمانروا کا حال جس حد تک ہم کو معلوم ہے اس سے یہ کچھ بعید نہیں اپنی عمر کے آخری زمانے میں بابا نانک اپنے خاندان کے لوگوں کے پاس جالندھر کے قریب موضع کرتارپور میں واپس آ گیا اور 1538ء میں اس کی وفات ہوئی۔ اس کی زندگی میں کوئی اہم واقعات پیش نہیں آئے۔ اس کا طرز زندگی عام ہندو سادھوؤں کا سا تھا اور اس کا جو اثر ہوا وہ ان تحریرات میں مدون کیا گیا ہے جو اس کے بعد یکجا کی گئیں۔ اس نے اپنے دونوں بیٹوں پر فوقیت دے کر اپنے چیلے انگد کو اپنا جانشین مقرر کیا۔ لفظ سکھ جس کے لغوی معانی نو آموز اور مرید کے ہیں نانک نے اپنے مریدوں کو بخشا اور جس قدر اس مذہب کی اشاعت ہوتی گئی اسی قدر یہ تمام قوم کا امتیازی خطاب ہو گیا۔ لیکن یہ امر ذہن نشین رہنا چاہئے کہ سکھ سے مراد مذہبی جماعت ہے نہ کہ کوئی خاص ذات اور اس کا اطلاق صرف ان لوگوں پر ہوتا ہے جو خالصہ مذہب کے پیرو ہیں۔

ارجن 'پانچویں گرو' نے نانک کی تحریرات یکجا کیں اور انہیں کے ساتھ مقبول عام پاک بزرگ اشخاص و شعراء کے کلام کے اقتباسات بھی اضافہ کئے۔ یہ کتاب سنسکرت زبان میں ہندوؤں کے ویدوں و پرانوں کی طرح تحریر نہیں کی گئی جس کا عام طور پر سمجھنا دشوار ہے بلکہ پنجابی زبان میں لکھی گئی جو عام بول چال کی زبان تھی۔ ادی گرنتھ ایک ہی اسلوب پر نہیں لکھی گئی۔ اس کے محاورات مضامین کے زمانے اور مقامات کے لحاظ سے مختلف ہیں قدیم ہندی زبان کے ذخیرے کے لحاظ سے یہ کتاب بہت زیادہ قابل قدر ہے۔ بابا نانک اور اس کے جانشینوں کی زبان اس وقت کی مروجہ پنجابی زبان

کے لحاظ سے جس میں نانک کی جنم ساکھی لکھی گئی فصیح پنجابی زبان میں نہیں ہے بلکہ اس میں بہت سی ہندی ترکیبیں اور الفاظ ہیں۔ غالباً مقصود یہ تھا کہ مقامی زبان کو روزمرہ کی بول چال کی بہ نسبت زیادہ باوقعت بنایا جائے اور اس کے ساتھ یہ صفت بھی قائم رہے کہ عام فہم ہو۔ گرو گوبند سنگھ کی تحریرات تقریباً بالکل خالص ہندی میں ہیں اور اس صورت میں فی زمانہ پنجابی بولنے والے سکھوں کے لئے ان کا سمجھنا بالکل ناممکن ہے۔

ادی گرنتھ کا پہلا باب سب سے اہم اور دلچسپ ہے جو جاپو یا جاپجی کے نام سے موسوم ہے۔ جس کو خود بابا نانک نے تحریر کیا ہے۔ اس میں مذہبی عقائد بیان کئے گئے ہیں۔ ادبی لحاظ سے یہ تمام کتاب کے باقی دوسرے حصوں سے بجز ان حصوں کے جن میں کبیر اور شیخ فرید کی صوفیانہ تحریرات ہیں ممتاز ہے اور جس کے متعلق اس سے قبل بھی اشارہ کیا گیا ہے۔ بھگت کبیر کی شہرت تمام ہندوستان میں پھیلی ہوئی ہے اور اب تک مریدوں کی جو کبیر پنتھی کے نام سے مشہور ہیں بنارس میں ایک خانقاہ موجود ہے جہاں کبیر پنتھ کی تعلیم دی جاتی ہے۔ (5) سب سے پہلے شعراء جن کا کلام گرنتھ میں شامل ہے مرہٹی کے دو شاعر نامدیو اور ترلوکن ہیں جن کی زبان کی خصوصیت زمانہ حال کی مرہٹی ترکیب پر ہے اور یہ اس سے ان کا دکنی نژاد ہونا ثابت ہوتا ہے۔

گوبند سنگھ جو دسواں اور آخری گرو تھا 15 سال کا تھا شاہ اورنگ زیب نے اس کے باپ کو اذیتیں دے کر مار ڈالا۔ گوبند سنگھ بھاگ کر پہاڑوں میں جا چھپا اور اپنی تعلیم کی تکمیل میں مصروف رہا۔ علمیت کے لحاظ سے وہ اپنے سلف سے برتر تھا۔ اسے فارسی' ہندی اور تھوڑی سی سنسکرت بھی آتی تھی۔ اس نے اپنے زمانہ آخر کی تحریروں میں سنسکرت کے داخل کرنے کی کوشش بھی کی۔ ذہانت و قابلیت و مستقل مزاجی میں وہ اپنے پیش رووں سے کہیں بڑھ کر تھا اور شروع ہی سے اپنی زندگی کا مقصد یہ قرار دے لیا تھا کہ سکھوں کو ایک مضبوط اور زبردست قوم بنا کر پنجاب سے مسلمانوں کی قوت کا استیصال کر دے۔ مگر اس کا پتہ نہیں چلتا کہ باوجود اس قابلیت اور قصد کے جب تک تیس برس کے سن کو نہ پہنچا وہ اس ارادے کو عمل میں لانے کی طرف کیوں

متوجہ نہ ہوا۔ اس وقت تک وہ تحصیل علم میں اور اس کام کی تیاری میں مصروف رہا جو اس نے اپنے ذمے لازم کر رکھا تھا۔ ورزش جسمانی سے بھی وہ غافل نہ رہا اور چونکہ اس زمانے میں یہ چیزیں شرفاء کی اولاد کے لئے ضروری سمجھی جاتی تھیں۔ اس نے ان میں کمال حاصل کیا۔ جب وہ گوشہ نشینی ترک کر کے باہر نکلا سکھوں نے بلا پس و پیش اسے اپنا اصلی اور موروثی رہنما تسلیم کر لیا اور وہ اس بات پر آمادہ ہو گئے کہ وہ اس کے ساتھ مل کر مسلمان ظالموں سے اس کے باپ کے قتل کا بدلہ لیں۔ مہم شروع کرنے سے قبل اس نے ہندوؤں کی دیوی درگا سے منت مانگی جس کا مندر نینا دیوی کے پہاڑ کے اس جائے سکونت انندپور کے قریب تھا۔ ابتدائی ضروری و سخت ریاضتوں کی انجام دہی کے بعد جو کثرت سے تھیں اور مدت تک جاری رہیں اور دودھ، گھی اور اناج چڑھانے پر دیوی نے نمودار ہو کر اپنی محافظت میں لینے کے معاوضے میں انسانی قربانی طلب کی۔ پوجاریوں نے اسے صلاح دی کہ دیوی کے راضی کرنے کے لئے اسے اپنے چار بیٹوں میں سے ایک کا سر نذر کرنا مقبول قربانی ہو گی۔ ان بچوں کی ماؤں نے قدرتی طور پر اپنے بچوں کے بھینٹ چڑھائے جانے سے انکار کیا۔ اس کے بعد گوبند سنگھ نے اپنے دوستوں سے استمداد چاہی۔ بیان کیا جاتا ہے کہ پانچ آدمی بھینٹ چڑھنے پر آمادہ ہوئے اور بالاخر ایک شخص جس کا نام بیان نہیں کیا گیا مندر کے روبرو قتل کیا گیا۔ باوجود اختلاف روایات اس امر میں ذرا بھی شبہ نہیں کہ انسانی قربانی کی گئی۔ اگلے زمانے میں یہ خونخوار دیوی جس کی مختلف صورتیں اور نام ہیں اکثر انسانی قربانی طلب کیا کرتی تھی اور صرف سرکار انگریزی کے زمانے سے جب کہ مذہب و قتل کا میل مٹا دیا گیا بجائے انسان کے بھیڑ بکریاں قربانی کی جانے لگیں۔ بہرحال دیوی نے بھینٹ قبول کی اور اسی خونی بھینٹ سے کام کا آغاز گرو گوبند سنگھ کی مابعد کی زندگی اور ہولناک موت کی گویا فال تھی۔ اب گرو نے اپنے ساتھیوں کو جمع کیا اور اپنے پیش آئندہ کام کی نوعیت و کامیابی پر بھروسہ کر کے دلیری کے ساتھ نئے اصولوں کی تعلیم دینا شروع کی جو نانک کی تعلیم کے خلاف تھی۔ اس کی حیثیت ایک سیاسی مذہب کی تھی سکھوں میں یکجہتی پیدا کرنا تھا تاکہ ارجن و ہرگوبند کی رائے کے مطابق ایک فوجی جماعت بن جائے۔

قدیم سکھ مذہب میں اصطباغ کی قسم کی ایک رسم بھی جاری تھی لیکن وہ اب متروک ہو گئی تھی۔ گوبند سنگھ نے اس کی تجدید کی اور اسے سکھ مذہب میں شامل ہونے کے لئے لازمی قرار دیا اور اس نے اپنے تمام موجودہ مریدوں کو پاہل دیا۔ اس کا طریقہ یہ تھا کہ پانی میں شکر ڈال کر خنجر سے اس کو ہلایا جاتا تھا اور ہلاتے وقت گرنتھ کے جاپ جی کے کچھ منتر پڑھے جاتے تھے۔ جس شخص کو داخل کرنا مقصود ہوتا وہ اس شربت کا ایک گھونٹ پیتا اور باقی شربت اس کے بدن اور سر پر چھڑکا جاتا تھا اور اس وقت اصطباغ دینے والا اور نو آموز مرید "واہ گرو جی کا خالصہ" پکارتے جاتے تھے۔ (6)

گرو گوبند نے جب اپنے پانچ چیلوں کو اس طرح اصطباغ دے لیا تو اس نے اپنے ساتھیوں سے کہہ کر اپنے اوپر بھی یہ رسم ادا کرائی اور سنگھ کا لقب اختیار کیا۔ خالصہ میں پانچ کی تعداد ایک خاص امتیاز رکھتی ہے اور اس سے ایک خاص جماعت کی ترکیب تصور کی جاتی ہے جس میں گرو یہ وعدہ کرتا ہے کہ اس کی روح ہمیشہ ان کے ہمراہ رہے گی۔ گرو گوبند نے نو سکھ لوگوں کو ہدایت کی کہ اصطباغ کی رسم ادا ہونے کے بعد وہ اپنے ناموں کے ساتھ سنگھ کا لفظ استعمال کیا کریں۔ آج کل عوام کی نظر میں سنگھ ہی صرف سکھ مانے جاتے ہیں اور نانکی سکھوں کے متعلق سمجھا جاتا ہے کہ وہ پھر ہندو جماعت میں واپس آ گئے۔

گرو گوبند سنگھ کا دوسرا کام یہ تھا کہ سکھوں کی کتابوں کی تطبیق اپنے خیالات سے کر لے اور اس غرض سے اس نے کرتار پور کے پاک شہر میں ادی گرنتھ کے محافظین کو اس بات پر آمادہ کرنے کی کوشش کی کہ وہ اسے گرنتھ میں اضافہ کرنے کی اجازت دیں۔ لیکن سودھیوں نے جو سکھ پوجاری اور اس مذہبی کتاب کے محافظ تھے اور جو گرو رام داس کی اولاد سے تھے اس جدید رہنما کی پیشوائی قبول کرنے سے انکار کیا۔ ان لوگوں کی اور انند پور اور کرتار پور کے عمال کی حالت سکھ مذہب کے برہمنوں کی سی ہو گئی تھی اور برہمنوں کی طرح ان میں بھی بے انتہا دعوائے روحانیت کا تفاخر پیدا ہو گیا تھا۔ جب انہیں یہ معلوم ہوا کہ گرو گوبند نانک کی تعلیم سے بھی زیادہ مساوات پیدا کرتا اور سب سے نیچ ذات کے لوگوں اور جو لوگ ذات باہر ہو گئے تھے ان کو برہمنوں کے

مساوی کرنا اور خالصہ مذہب کے حقوق دینا چاہتا ہے تو فوراً" برسر عناد ہو گئے۔ انہوں نے گوبند سنگھ کو جھوٹا مدعی قرار دیا اور اس کے خلاف مذہبی تعلیمات کے اس پاک مذہبی کتاب میں اضافہ کئے جانے کی اجازت دینے سے انکار کیا جو ان کی سپردگی میں تھی۔ ان لوگوں نے اسے طعنہ دیا کہ اگر وہ سچا گرو ہے تو خود کوئی کتاب کیوں نہیں مرتب کرتا۔ گرو گوبند نے ایسا ہی کیا اور 1696ء میں اس کی کتاب مرتب ہو گئی۔ اس کتاب کی ترتیب میں بابا نانک سے جو تعلیم چلی آتی تھی اس کو منسوخ یا اس میں کوئی اہم ترمیم کرنے کی کوشش نہیں کی بلکہ ایک جداگانہ تصنیف کی گئی جو اس کی خواہش کے مطابق اس کے اشتعال پذیر اور متشدد پیروؤں پر اس طرح اثر انداز ہو کہ وہ مسلمانوں کے مقابل ایک جنگجو قوت کے طور پر اٹھ کھڑے ہوں اور اس مذہب کے معتقدین کے لئے پنجاب کو چھین لیں۔ وہ اس کوشش میں کسی حد تک کامیاب ہوا اور فدائیوں کی روز افزوں جماعت کے ساتھ اس نے نئے مذہب کی اشاعت کا کام آغاز کیا جو اس کی زندگی کا منشا تھا۔ (7) سب سے پہلے اس کا مقابلہ کانگڑے کی پہاڑیوں کے راجپوت سرداروں سے ہوا جنہوں نے اپنی تمام قوت کو مجتمع کر کے انند پور کے مقام پر اس پر دھاوا کرنا چاہا۔ ایک لڑائی میں جو چمکور کے قریب ہوئی اور جو مقام اب تیرتھ گاہ مانا جاتا ہے اس کے دو بیٹے اجیت سنگھ اور جوہر سنگھ مارے گئے۔ شاہی فوج راجپوتوں کی امداد کو آ گئی اور گرو گوبند کو انند پورے اور پھر مچھی واڑے سے نکال دیا اور اس کے دونوں بیٹوں کو گرفتار کر لیا۔ یہ دونوں بیٹے سرہند بھیج دیئے گئے اور وہاں شہنشاہ اورنگ زیب کے حکم سے زندہ دفن کر دیئے گئے۔ گرو گوبند سنگھ ستلج کے جنوبی جنگلوں میں بھاگتا پھرا اور بہت سی مشکلات کے بعد پٹیالے کے علاقے میں تلونڈی کے مقام پر مقیم ہوا۔ اس نے لوگوں کو ہدایت کی کہ جس طرح ہندو بنارس کو مقدس مقام مانتے ہیں اسی طرح سکھ اس مقام کو تصور کریں۔ یہ جائے قیام دمدمے کے نام سے موسوم کی گئی کیونکہ لفظ دم کے معنی سانس لینے کے ہیں اور یہ مقام گویا گرو کے ٹھہر کر سانس لینے کا تھا۔ یہ سکھوں کا بہت بڑا مرکز ہے۔ گرمکھی کے سب سے بہتر مصنف یہیں ملتے ہیں۔ ایک دوسرا مقام بھٹنڈا بھی جو اس ریاست کے علاقے میں ہے گرو

کا دمدمہ مانا جاتا ہے۔ یہاں اس نے ایک بھوت کو نکالا جو تمام شہر کو برباد کر رہا تھا۔ اور کچھ عرصے تک وہ اس قرب و جوار میں مقیم رہا اور اس اثناء میں اس کی شہرت و اثر میں یوماً فیوماً ترقی ہوتی گئی۔

ساکھیوں میں اس کے اس جگہ کے قیام کے متعلق بہت دلچسپ واقعات مذکور ہیں اور مذہبی مبالغوں کی آمیزش سے قطع نظر کر کے یہ ایک صحیح مرقع سکھوں کے اس گرو کا تصور کیا جا سکتا ہے جس کا شاہانہ دربار تھا جو اپنی فیاضی اور سخاوت سے لوگوں کو گرویدہ کر کے اپنا مرید بنا لیتا تھا اور مذہبی پیشوائی کے دعوے کے لئے معجزات کی بھی کمی نہ تھی۔ ساکھیاں گرو کی حیرت انگیز قوت کے خوارق عادات کے بیان سے بھری پڑی ہیں۔ ہمیں ان سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس کی دعا سے جو والدین اولاد سے محروم تھے وہ صاحب اولاد ہو گئے۔ اس نے بھوت پریت اتارے۔ دیہات سے بیماریاں دفع کیں۔ کھاری پانی کو میٹھا کر دیا۔ دغا و فریب کی سزا میں مہلک موروثی بیماری پیدا کر دی اور سوکھے درخت پھولے پھلے۔ ایک موقع پر ہندو و مسلمان چور جو اس کے گھوڑے چرانے آئے تھے اندھے ہو گئے اور دوسرے موقع پر جمع بندی کا اہلکار جو اس کے ایک معتقد کی پیداوار پر تشخیص لگان کرنے کے لئے آیا تھا بالکل حساب کتاب بھول گیا اور اس نے گرو کی طاقت کو مان کے سکھ مذہب قبول کیا۔

گوبند سنگھ کی شان و شوکت بغیر جبر و تعدی کے نہ نبھ سکتی تھی اور گرو کی مسند یا نایب شاہی تحصیلداروں کے جانشین بن گئے تھے۔ یہ لوگ اس درجہ لالچی و دست دراز ہو گئے تھے اور ان کی وجہ سے اس قدر بددلی اور مزاحمت پیدا ہو گئی کہ گرو گوبند کو بالآخر انہیں بالکل برخاست کرنا پڑا۔ اس کے بعد وہ اپنے وطن جندپور میں واپس آگیا۔ راستے میں اس کا گزر سرہند سے ہوا اس کے معتقدین باوصف فہمائش اس مقام کو اس کے دونوں بیٹوں کے ظالمانہ طریقے پر قتل کئے جانے کے انتقام میں تباہ و برباد کرنے سے بہ مشکل باز رہ سکے۔ اس نے اس گاؤں کو سراپ دی اور اپنے معتقدین کو ہدایت کی کہ جب کبھی وہ گنگا کی تیرتھ اور اشنان کے لئے یہاں سے ہو کر جائیں یا وہاں سے واپس آتے ہوئے اس راستے سے گزریں تو اس گاؤں کے مکانوں میں سے دو اینٹیں

لے کر ستلج یا جمنا میں پھینک دیں ورنہ ان کا گنگا اشنان اکارت جائے گا۔ اب تک جو سکھ پیادہ پا تیرتھ کو جاتے ہیں اس حکم کی پابندی کیا کرتے ہیں لیکن ریل کے سفر نے پیادہ پا جاتریوں کی تعداد میں بہت کچھ کمی کر دی ہے۔ میرا گزر اکثر سرہند کے کھنڈروں اور وہاں کے خس و خاشاک کے انباروں میں ہوا ہے جس میں اب اصلی سرہند مدفون پڑا ہوا ہے اور ان کو دیکھ کر مجھے بھی اکثر اس بات کا خیال آیا ہے کہ درحقیقت یہ مقام لعنت زدہ ہے۔

اس کے کچھ عرصے بعد بعض وجوہ سے جن کا انکشاف نہیں ہوا اور اب تک مبہم ہیں اور یقیناً اس کے طرز زندگی اور تعلیم کے خلاف تھے اس نے بہادر شاہ کی ملازمت کر لی یا یہ صورت ہوئی کہ مسلمان بادشاہ کو اس نے اپنا ایک سکھ دستہ سواروں کا سپرد کر دیا اور خود اس کی سرکردگی اس لئے اختیار کی کہ اس کے عام طور پر باغیانہ روش کے بارے میں شک و شبہ دور ہو جائے اور دار و گیر سے اسے کچھ عرصہ تک نجات ملے بہرحال وہ اپنے پیروؤں کے ہمراہ دکن گیا جہاں اسے ایک افغان کے رشتہ داروں نے قتل کر ڈالا جس کو اس نے ایک موقع پر غصے میں آ کر قتل کیا تھا۔ 1708ء میں وہ 48 سال کا ہو کر مقام ناڈیرہ میں فوت ہوا جو دریائے گوداوری کے کنارے پر واقع ہے۔ اس مقام کو سکھ اچل نگر یعنی جائے روانگی کے نام سے موسوم کرتے ہیں اور یہاں اس کی یادگار میں ایک مندر قائم ہے جہاں بہت سے سکھ سال بہ سال جاترا کے لئے آتے ہیں۔ گرو گوبند کی تعلیم کے سمجھنے کے لئے نانک کے اصول عقائد کا مختصر بیان ضروری ہے۔ سب سے پہلے یہ امر ذہن نشین رہنا چاہئے کہ گو سکھ لوگ ادی گرنتھ کی تعظیم بطور الہامی کتاب کے اسی طرح کرتے ہیں جس طرح عیسائی اور مسلمان اپنے اپنے کتب مقدسہ کی لیکن نانک اور اس کے جانشینوں کی تحریروں میں جنہیں گرو ارجن نے یکجا کیا ہے کوئی جدید اور نادر بات ایسی نہیں ہے جس سے وہ اس سے زیادہ عظمت کی مستحق قرار دی جا سکیں جو پنجابی ہندوؤں نے بھگت کبیر ایسے بزرگ اشخاص کی تعلیم کی کی تھی اور معلوم ہوتا ہے کہ خود نانک نے اپنے تحریرات میں ان سے بہت کچھ استفادہ کیا ہے۔ ادی گرنتھ کے مندرجہ عقائد ہندوؤں کی متصوفانہ قدیم اور خالص تعلیم

سے بہت کم اختلاف رکھتے ہیں۔ نانک خود صوفی مشرب تھا اور اپنی زندگی کا بڑا حصہ اس نے سنیاس میں بسر کیا۔ گرو گوبند کی طرح اس کے خیالات سیاسی نہ تھے بلکہ درستی اخلاق پر مبنی تھے اور اس کا مقصود یہ تھا کہ ہندو جو اوہام اور باطل پرستی میں ڈوبے ہوئے ہیں اس سے ان کو نکالا جائے اور ان کو نیک عقائد اور عمدہ اخلاق کی تعلیم دی جائے اس پر لفظ مصلح کا پورا پورا اور صحیح طور پر اطلاق ہوتا ہے اور سکھ مذہب جس کی اس نے تلقین کی تھی باوجود اس کے کہ ادی گرنتھ کے اخلاق و مبالغے سے بھرا ہے ایک ایسا مذہب ہے جو عملی و تمدنی لحاظ سے اعلیٰ نمونہ تصور کیا جا سکتا ہے اور جو مہذب دنیا کے دوسرے فلسفیانہ مذاہب کے زمرے میں بلند پایہ ہے۔

نانک کے خصائل و تعلیم میں بہت سی باتیں ایسی ہیں جو محققین کو بودھ مذہب کے بڑے مصلح کی زندگی و تعلیم کو یاد دلاتی ہیں جو عامہ خلایق کی بہبودی میں منہمک تھا اور جس کے عاقلانہ عقائد نے نسل انسانی کے ایک چوتھائی حصے پر وسیع اثر کیا ہے۔

گرو نانک کے عقائد کا اصل اصول وحدانیت کی تعلیم ہے یعنی یہ کہ خداوند تعالیٰ وحدہ لاشریک لہ ہے جیسا کہ اس دوہے میں بیان کیا گیا ہے۔

تری ذات بے عیب ہے اے خدا
نہیں مثل تیرے کوئی دوسرا

اس بارے میں ہندو مسلمانوں کے اختلاف کا بھی اعتراف کیا گیا ہے چنانچہ یہ تحریر ہے کہ طریقے دو ہیں یعنی ہندو مذہب و اسلام لیکن خدا صرف ایک ہے۔ خدا کو خواہ کسی نام سے پکارو۔ خواہ اسے برہم، ہری، رام، گوبند کہو۔ وہ ہر صورت میں سمجھ سے بالاتر، ان دیکھا، لم یلد اور قدیم ہے اور صرف اسی کا وجود حقیقی ہے وہ تمام چیزوں کا مبداء اور علت العلل ہے اور انسان اور دوسرے موجودات عالم کا وجود اسی سے ہے اور اسی سے تمام چیزوں کا نکاس ہے۔ جس طرح ڈارون نے مسئلہ ارتقاء اجناس کی تعلیم دی ہے اسی طرح نانک نے بھی اپنی تعلیم میں یہ کہا کہ قادر مطلق نے نیست سے ہست نہیں کیا بلکہ خود اپنی ذات سے تعدد (8) صور کو اختیار کیا۔ یہ تعلیم ہمہ اوست کی ہے جو گرنتھ

ہیں الوہیت کی رفیع الشان تعلیم کے دوش بدوش مذکور ہے اور کہیں ایک اصول پر اور کہیں دوسرے اصول پر زیادہ زور دیا گیا ہے لیکن مجموعی حالت میں گرنتھ کی تعلیم یہ ہے کہ ذی حیات اور غیرذی حیات تمام موجودات عالم کا ظہور اسی کی ذات سے ہے وہ خود موجود ہے اور سوا اس کے کوئی شے حقیقی یا موجود بالذات نہیں۔ قادر مطلق کے بغیر یہ عالم ایک سایہ' سراب یا مغالطہ نظر ہے۔ گرنتھ کے صفحہ 665 پر یہ تحریر ہے کہ۔

1- اس ایک ذات کا جلوہ ہر طرف و ہر شے میں نمایاں ہے جہاں کہیں نظر ڈالو وہی وہ نظر آتا ہے۔ وہ ایک کثرت میں پھیلا ہوا اور سب میں سمایا ہوا ہے۔ جدھر میں دیکھتا ہوں وہی نظر آتا ہے مایا کے دلفریب سراب نے دنیا کو لبھا رکھا ہے۔ بہت کم ایسے لوگ ہیں جو حقیقت آشنا ہوں سب گوبند ہے اور سب گوبند ہے۔ گوبند کے سوا کوئی اور نہیں ہے۔ جس طرح ایک ڈوری میں سات ہزار دانے پروئے ہوئے ہوں اسی طرح خدا طول و عرض میں ہر طرف ہے۔

2- پانی کی موج۔ کف اور حباب پانی سے جدا نہیں ہوتے۔

یہ دنیا برہم کی بازی گاہ (9) ہے وہی بازیگر ہے۔ وہ اور نہیں ہوتا۔ گرنتھ میں الوہیت کے متعلق یہ خیال ظاہر کیا گیا ہے کہ وہ ہستی عظیم اپنی مخلوق سے بالکل جدا ہے اس نے خلق کیا ہے اسی مخلوق کا ظہور ہے۔ مایا یا فریب کا اس پر کوئی اثر نہیں ہوتا۔ وہ مایا سے بے لوث اور قائم ہے اس طرح جیسے کنول کا پھول اپنے کنڈ سے جدا ہوتا ہے جہاں وہ موجود ہے گرنتھ کے اکثر حصص میں شرک کی تردید و تکذیب کی گئی ہے جب کہ وہ بت پرستی کی شکل اختیار کرے۔ لیکن نانک نے اپنی تعلیم میں براہ راست شرک کی مخالفت نہیں کی ہے اور دیدوں کے لاکھوں عام معبودوں کے ماننے کی اجازت دی ہے جو اس کے خیال میں اس ہستی عظیم سے بدرجہا کمتر ہیں جس سے مثل اور دوسری اشیاء کے ان کا وجود عالم ہستی میں آیا۔ نانک نے یہ تعلیم دی ہے انسان کی بڑی جدوجہد یہ ہونی چاہئے کہ وہ تناسخ (10) سے کسی نہ کسی طرح نجات حاصل کر لے جس سے ہندو و سکھ کو یکساں اندیشہ ہے۔

ہندوؤں کا مسئلہ یہ ہے کہ تمام دنیاوی افعال کے ساتھ خواہ اچھے ہوں یا برے جزا

و سزا لگی ہوئی ہے پارسا اشخاص بہشت میں داخل ہوتے اور اپنی پارسائی کے لحاظ سے ایک مدت تک مقیم رہتے ہیں۔ اس کے بعد وہ نیک شخص پھر انسانی صورت کی بہترین حالت میں دوبارہ جنم لیتے ہیں اور یہ سلسلہ تناسخ جاری رہتا ہے اور ان کے افعال کے لحاظ سے ان کا آئندہ جنم ہوا کرتا ہے۔ اگر اس شخص کی زندگی بدکاری یا دنیاداری میں گزری ہے تو وہ دوزخ میں رکھا جاتا اور وہاں ایک مدت تک سزا بھگتنے کے بعد جانور کی شکل میں جنم لیتا ہے۔ جو شخص زیادہ اخلاقی گناہ کا مرتکب ہوتا ہے وہ ادنیٰ درجے کے جانوروں کی صورت میں پیدا ہوتا ہے اور بے انتہا جنم لینے کے بعد وہ پھر آدمی ہو جاتا ہے اور اس قابل بنا دیا جاتا ہے کہ نیک افعال سے اپنے پرانے جنموں کے گناہ کو دھو ڈالے۔ گرنتھ کی تعلیم کے لحاظ سے بھی انسان اپنے افعال کے انجام دینے میں کچھ زیادہ مختار نہیں ہے کیونکہ اس کی قسمت کا پہلے ہی سے تصفیہ ہو جاتا ہے یہاں تک کہ یہ فیصلہ اس کی پیشانی پر لکھ دیا جاتا ہے بہرحال یہ بالکل بین اور صریح ہے کہ گرنتھ نے انسان کے افعال کے بارے میں خود مختاری سے بالکل انکار کیا ہے اور اس کے علاوہ خواہ انسانی روح کا رجحان کتنا ہی نیکی کی طرف کیوں نہ ہو لیکن پھر بھی مایا کی دست برد سے نہیں بچتی اور یہ ہمیشہ اس کو ٹھیک راستے سے بھٹکاتی رہتی ہے۔ نیکی، جہل اور شہوت وہ تین صفات ہیں جن میں سے ایک نہ ایک ہر انسان کی روح پر غالب رہتی ہے اور انہیں صفات کے غلبے پر انسان کی موجودہ زندگی اور آخرت کی بھلائی کا انحصار ہے۔ اس نئے مذہب کے استحکام اور لوگوں کے اس کی جانب رجوع ہونے کا سب سے قوی سبب یہی تھا کہ وہ تناسخ سے رہائی دلانے کا وعدہ کرتا تھا جس کا خوف ہمیشہ عوام کے دلوں میں لگا رہتا تھا۔ جس طرح بہشت و دوزخ کی کنجیاں پطرس اعظم کے تفویض تصور کی جاتی تھیں اور اس اعتقادی قبضے کی وجہ سے رومی کلیسا نے لوگوں کے قلوب تسخیر کر کے اس قدر اقتدار حاصل کر لیا تھا اسی طرح گرو کی مدد سے تناسخ سے رہائی پا جانے کے دعوے نے سکھ مذہب کو مقبولیت عطا کی۔ فیروز پور کے جنگلوں میں جہاں گوبند سنگھ نے شاہی فوج سے مقابلہ کر کے شکست کھائی اس نے اپنے تمام معتقدین کو جو لڑائی میں مقتول ہوئے یہی مکتی دینے کا وعدہ کیا۔ اس رہائی کی یادگار میں

ایک بڑا قصبہ آباد اور ایک تالاب تعمیر کیا گیا جو اب تک مکتیسر کے نام سے مشہور اور بڑی زیارت گاہ تصور کیا جاتا ہے۔

اس عام مقدر سے نجات پانے اور ذات الٰہی سے وصال ہو جانے کے لئے ہری کے بزرگ نام کے جلپ کی ضرورت تھی اور اس کی اجازت صرف ان لوگوں کو دی جاتی تھی جو اس مذہب میں صحیح و جائز طریقے سے داخل ہوئے تھے۔ جنہیں خود گرو نے چیلہ بنا کر صحیح طور پر اس بزرگ نام کے جپنے کی تعلیم دی تھی۔ لیکن گرو کا اس طرح تلقین کرنا مسئلہ قضا و قدر کے لحاظ سے صرف ان ہی مخصوص چیلوں تک محدود تھا جن کی قسمت میں قسام ازل نے اس قسم کی رہائی لکھ دی تھی۔ اس میں مسئلہ تقدیر پر بحث نہیں کی گئی تھی۔ جس کی بظاہر یہ وجہ تھی کہ جب لوگ عام طور پر یہ سمجھنے لگیں گے کہ گرو کو اپنے پیرووں کی قسمت کے بدلنے میں کوئی اقتدار حاصل نہیں ہے تو اس کی عظمت میں فرق آئے گا۔ عام طور پر یہ تعلیم دی گئی تھی کہ مذہبی پابندی اور گرو کی تعلیم پر صبر و استقلال کے ساتھ عمل کرنے سے دل نیکوکاری کی طرف رجوع ہو گا اور اس وقت ایسا موقع نصیب ہو گا کہ انسان کا نوشتہ تقدیر جو اس کے ادارے سے کہیں بالاتر ہے بدل سکے۔ اگر اس عقیدے میں تناقض تھا تو وہ جبر و اختیار کے مسئلے کے لحاظ سے تھا جس سے ان اٹل احکام قضا و قدر سے بچنے کے متعلق انسانی خواہش کا اظہار ہوتا تھا جو تمام عالم پر محیط اور نسل انسان پر حاوی ہے۔

گرنتھ کی سب سے اہم تعلیم یہ ہے کہ گرو کی وقعت و اطاعت اور رشیوں کی عظمت اور پرستش کی جائے۔ پاک و صاف رہنے خیرات دینے اور گوشت خواری سے پرہیز کرنے کی بھی ہدایت کی گئی ہے۔ اخلاقی امور کے متعلق بدگوئی' بدکاری' غصہ' طمع' خود غرضی اور بد اعتقادی کی خاص طور پر ممانعت کی گئی ہے۔ نانک نے یہ بھی تعلیم دی ہے کہ متاہل شخص جو خاندان کا سردار اور کاروبار دنیا میں مصروف ہو قابل عزت سمجھا جائے اور اس نے خاص کر اس بات کی تردید کی تھی کہ رہبانیت کی زندگی اختیار کرنے سے کوئی خاص خوبی اور عظمت پیدا ہو سکتی ہے۔ اس کے نزدیک ہر ایک سچا مذہب صرف رسوم کی ظاہری پابندی اور مذہبی طریق اختیار کرنے تک محدود نہیں

بلکہ اس کا زیادہ تر انحصار ہمارے قلب کی حالت پر ہے اور روحانی معاملات پر معمولی کاروبار دنیوی میں مصروف رہ کر بھی انسان غور و خوض کر سکتا ہے اس کے لئے بادیہ پیمائی یا خانقاہوں میں عزلت گزینی ضرور نہیں۔ یہ سچ ہے کہ سکھوں کے اکثر تارک الدنیا فرقے جیسے اداسی و اکالی نے تعداد کثیر میں ایک زمانے کے بعد نانک کی اس تعلیم سے انحراف کیا۔ لیکن یہ لوگ کم و بیش لامذہب مانے جاتے ہیں اور عموماً سکھ مذہب جس کی نانک و گوبند سنگھ نے تعلیم دی دنیا دار لوگوں کے لئے بہت ہی موزوں ہے۔

گوادی گرنتھ برہمنوں کے سخت خلاف اور ان کے دعووں کی منکر و مخالف ہے لیکن نانک نے براہ راست ذات کی قید مٹائے جانے کی تعلیم نہیں دی لیکن پھر بھی اس کی تعلیم کا رجحان جمہوریت کی طرف تھا اور اس نے بلا امتیاز ذات ہر قسم کے لوگوں کو اپنا چیلہ بنایا۔ نانک کی تعلیم اس کے جانشینوں کی تعلیم سے ملتی جلتی تھی اور گرو گوبند کے زمانے تک اس میں کوئی اہم تغیر مذہبی و تمدنی حیثیت سے واقع نہیں ہوا۔ گرو گوبند کی تعلیم اور اس کے اصولوں نے سکھوں میں ایک دور جدید کی بنیاد ڈال دی اور وہی نانک کی تعلیم سے بڑھ کر انہیں ایک فوجی جماعت بنا دینے کی محرک ہوئی اور اس کے اثر سے وہ آخر در حقیقت ایک فوجی گروہ بن گئے۔

گرو گوبند سنگھ کا رجحان اگرچہ ہمہ اوست کی لطیف تعلیم کے مقابلے میں شرک و بت پرستی کی جانب تھا لیکن انند پور کے سدھیوں نے جب اسے نئی پوتھی مرتب کرنے کا طعنہ دیا تو اس نے اپنے بزرگ پیشرو کی تعلیم پر کسی قسم کا حملہ کرنا مناسب نہ سمجھا اور نہ اس بات کی خواہش کی۔ اس کی بڑی خواہش صرف یہ تھی کہ سکھوں کا ایک جتھا قائم کر کے انہیں ہندوؤں سے بالکل علیحدہ کر دے تاکہ مسلمانوں کے مقابلے کے لئے انہیں وہ زیادہ آسانی سے آمادہ کر سکے۔ اس ضمن میں اس نے پہلے یہ کام کیا کہ اپنے فرقے میں ذات کے تفرقے کو مٹایا جس پر برہمن مذہب کا دار و مدار ہے اسی کے باعث سے اس مذہب کے پجاری قدرتی طور پر اس سے برافروختہ ہو گئے اور دوسرے اعلیٰ ذاتوں والے بھی اس کو مشتبہ نظروں سے دیکھنے لگے کیونکہ اس طرح ان لوگوں کو جنہیں وہ نظر حقارت سے دیکھتے تھے سکھ مذہب میں داخل کرنے سے ان کے دیرینہ

فوج غصے میں آپے سے باہر ہو رہے تھے اور ان میں ضبط و پابندی باقی نہ رہی تھی۔ ان لوگوں نے ان عورتوں کے بدن کے تمام زیور زبردستی اتار لئے اور ناکوں میں سے نتھیں کھینچ لیں۔ ہندوؤں میں ستی کی بڑی حرمت مانی جاتی ہے اور اس کے آخری الفاظ پیشین گوئی تصور کئے جاتے ہیں۔ راجہ دینا ناتھ جو رانی کے قائم مقام کی حیثیت سے وہاں موجود تھا اور دوسرے اشخاص ان عورتوں کے قدموں پر گر کر دعا کے طالب ہوئے۔ ستیوں نے دینا ناتھ اور مہاراجہ کو دعا اور خالصہ فوج کو بددعا دی۔ جب پنجاب کی آئندہ قسمت کے بارے میں ان سے دریافت کیا گیا تو انہوں نے یہ پیشین گوئی کی کہ سال بھر کے اندر ملک کی آزادی چھن جائے گی۔ خالصہ برباد اور فوج والوں کی عورتیں بیوہ ہو جائیں گی۔ اس کے بعد وہ زبردستی آگ کے شعلوں میں جھونک دی گئیں لیکن ان کی پیشین گوئی صحیح ثابت ہوئی اور ان کی بددعا ایسی پوری ہوئی کہ پہلے کبھی کوئی بددعا نہ پوری ہوئی ہو گی۔

ستی کا دوسرا واقعہ اٹاری کے سردار شام سنگھ کی بیوہ کا تھا۔ یہ شخص سکھوں میں بڑا شریف و نیک نہاد تھا۔ وہ سبراؤں کی جنگ میں کام آیا اس نے انگریزوں کے ساتھ جنگ کرنے پر اظہار ناپسندیدگی کیا تھا اور اس کو اچھی طرح معلوم تھا کہ اس جنگ کا نتیجہ کیا ہو گا لیکن باوجود اس کے وہ خالصہ کی جانب سے لڑنے پر آمادہ ہو گیا اور سبراؤں کی جنگ سے قبل کی رات کو اس نے گرنتھ پر ہاتھ رکھ کر اس امر کا عہد کیا کہ وہ میدان جنگ سے مغلوب ہو کر نہ پلٹے گا۔ صبح کے وقت وہ سفید لباس اور سفید ماویان سوار ہو کر لشکر کے روبرو آیا اور اپنے لوگوں کو مخاطب کر کے کہا کہ اگر وہ خالصہ کے سپوت ہیں تو اپنی جان دے دیں لیکن شکست گوارا نہ کریں۔ جنگ کے ابتدائی حصے میں تو وہ ہر جگہ پہنچ کر سکھوں کی ہمت افزائی کرتا رہا لیکن جب اس نے دیکھا کہ ہزیمت یقینی ہے تو وہ خود تلوار لے کر پچاسویں رجمنٹ پر گھوڑے کو مہمیز کر کے جا پڑا اور فوج والوں کو اپنا ساتھ دینے کے لئے پکارتا رہا۔ تقریباً پچاس آدمیوں نے اس کا ساتھ دیا لیکن وہ پسپا ہو کر ستلج میں دھکیل دیئے گئے اور شام سنگھ کے سات گولیاں لگیں جس سے وہ ہلاک ہو کر سواری سے گر پڑا۔ لڑائی کے بعد اس کے خادموں نے

نے اس کی نعش ڈھونڈنے کی اجازت طلب کی۔ بڈھے سردار کا اپنے سفید لباس و سفید لبی داڑھی کی وجہ سے باآسانی پتہ چل گیا اور جس جگہ کشتوں کے پشتے لگے ہوئے تھے وہیں اس کی بھی لاش ملی۔ اس کے نوکروں نے اس کی نعش کو ایک چوگھڑے پر رکھا اور اور اس کے ساتھ دریا میں پیر کر پار اتر گئے لیکن لاش تیسرے دن سے پہلے اس کے وطن اٹاری نہ پہنچ سکی۔ اس کی بیوہ نے جسے اس کے ارادے اور عزم بالجزم کا علم تھا کہ وہ شکست کھا کر زندہ نہ رہے گا اس ملبوس کے ساتھ جو سردار نے شادی کے دن پہنا تھا اس کے آنے سے قبل جل کر جان دے دی۔ ستی کا یہ واقعہ پنجاب میں سب سے آخری تھا۔ جس مقام پر یہ واقعہ ہوا وہاں ایک ستون بطور یادگار بنایا گیا جو اب تک اٹاری کی چار دیواری کے باہر ایستادہ ہے۔

اولاد کا ناجائز ہونا اس کے توریث کا مانع سمجھا جاتا تھا۔ لیکن اس نامہذب زمانے میں جب کہ زبردست کی مرضی ہی قانون سمجھی جاتی تھی ناجائز اولاد کو اکثر وہ رتبہ حاصل ہو جاتا تھا جس کے وہ ازروئے پیدائش مستحق نہ تھے۔ اس کے علاوہ کسی عورت پر چادر ڈالنے سے اس کی حیثیت جائز بیاہی ہوئی کی سی ہو جاتی تھی اس وجہ سے جائز و ناجائز اولاد میں امتیاز کرنا دشوار تھا قطع نظر اس کے ناجائز اولاد اور جائز و ناجائز آشناؤں میں بھی مدارج تھے۔ لونڈی کی اولاد اس اولاد کے مساوی تصور نہ کی جاتی تھی جو کسی شریف عورت کے بطن سے پیدا ہوتی جو سردار کے گھر میں اس کی دلہن کے ساتھ آتی۔

یک جدیوں کے توریث کے بارے میں بھی طرز عمل مختلف تھا لیکن عام قاعدے کے مطابق اس کی مخالفت کی جاتی تھی جیسا کہ کریوا طریقہ ازدواج سے ثابت ہوتا۔ جس کے رو سے وہی شخص توریث کا مستحق ہوتا جو اپنے بھائی کی بیوہ سے شادی کر ورنہ اور کسی طرح اسے کوئی حق حاصل نہ ہوتا تھا۔ مہاراجہ رنجیت سنگھ نے یک جدیوں کو کسی قسم کا حق دینے سے قطعی انکار کیا اور لوگوں کے اولاد ذکور نہ ہونے سے فوت ہونے پر بذات خود ان کی جائدادوں پر قبضہ کر لیا گو بعد میں بھاری رقم جرمانہ یا نذرانہ دینے پر جائدادیں کسی عزیز کے نام واگزاشت کر دی گئیں۔ ستلج اس پار کے زیر

حقوق کی تحقیر اور ان کے تلف ہونے کا خوف تھا۔ نانک کا یہ عمل اونچی ذات کے ہندوؤں کی تبدیل مذہب کے لئے سد راہ تھا لیکن گرو گوبند کی طرح اس نے اس امر کو زیادہ اہمیت نہیں دی تھی۔

گوبند سنگھ کی دوسری ہدایتیں جو اس نے اپنے پیروؤں کو ہندوؤں کی عام جماعت سے جدا کرنے کی غرض سے کی تھیں ان سے زیادہ بحث کرنے کی ضرورت نہیں۔ یہ ہدایتیں زیادہ تر طرز لباس' آداب اکل و شرب و پرستش کے بارے میں تھیں۔ سکھوں کو نیلے لباس پہننے کی ہدایت کی گئی تھی لیکن عرصے سے یہ طریقہ متروک ہو گیا ہے صرف اکالی سکھ اس کے پابند ہیں۔ انہیں تلوار باندھنے کی ہدایت کی گئی تھی اور اس کے علاوہ اور پانچ اشیاء رکھنے کی جن کے نام پنجابی زبان میں حرف ک سے شروع ہوتے ہیں۔ کیس یعنی ڈاڑھی و سر کے بال' کھنڈا یا خنجر' کنگھا یا شانہ' کڑا یا آہنی چوڑی' کچھ یا گھٹنوں تک پاجامہ' پانچویں چیز کے استعمال کی ہدایت اس لئے کی گئی تھی کہ ان کا ہندوؤں سے امتیاز ہو جائے۔ کیونکہ ہندو عموماً دھوتی باندھتے ہیں۔ اس کے علاوہ سکھوں کو تمباکو نوشی کی بھی ممانعت کی گئی جس کا عام طور پر ہندوؤں میں رواج ہے۔ اس کی پابندی میں یقیناً دقت ہوئی ہو گی مگر اس کا نتیجہ بھی مفید نہ ہوا۔ کیونکہ سکھ اس کے نتیجے میں افیون و بھنگ کے بہ کثرت عادی ہو گئے جو تمباکو سے بدرجہا زیادہ مضر ہے وسط ایشیا کے جوشیلے مسلمانوں میں بھی اس قسم کے ممانعت کا یہی نتیجہ ہوا تھا۔

دختر کشی کی ممانعت کی گئی اور اس کے مرتکب کو ملعون قرار دیا گیا۔ گوبند سنگھ کے زمانے میں اور سرکار انگریزی کے پنجاب کو الحاق کرنے کے وقت تک یہ رسم پنجاب میں شدت سے جاری تھی خصوصاً اونچی ذاتوں میں جیسے راجپوت جنہیں اپنی لڑکیوں کی شادی کرنے میں بڑی دقت پیش آتی تھی۔ مثلاً جموں کے مہاراجہ گلاب سنگھ کے راجپوت خاندان کا ذکر کیا جا سکتا ہے۔ اس خاندان میں علی العموم یہ رسم جاری تھی اور 1871ء تک اس خاندان میں کبھی کسی لڑکی کی شادی نہیں ہوئی۔ اس سال مہاراجہ کی پوتی کی شادی جسوال کے قدیم خاندان کے لڑکے کے ساتھ بڑی دھوم دھام سے

رچائی گئی۔ باوجود گوبند کی ممانعت کے سکھوں میں مدت تک یہ رسم جاری رہی اور اب بھی پنجاب کے بعض مقامات میں سکھ پوجاریوں کے بعض خاندان ہیں جن میں اس رسم کے رواج کا شبہ باقی ہے لیکن عام طور پر انگریزی حکومت کے اثر نے اس بزدلانہ قبیح رسم کا پنجاب میں خاتمہ کر دیا ہے۔ لڑکی یا بہن کو دان لے کر بیاہنے کی بھی ممانعت کی گئی تھی لیکن اس حکم سے بھی اکثر پہلو تہی کی جاتی ہے۔

سکھوں کو اس ذبیحے کا گوشت کھانے کی ممانعت تھی جو عام طریقے پر کیا جائے اور یہ ہدایت تھی کہ جس جانور کا گوشت وہ کھائیں اسے تلوار کی ایک ہی ضرب سے ہلاک کیا جائے۔ جس کو عموماً جھٹکا کہتے ہیں۔ گرنتھ میں گائے کے گوشت کی کوئی خاص ممانعت نہیں ہے لیکن قدیم روایات کا گہرا اثر دلوں پر بیٹھا ہوا تھا اور سکھوں کے نزدیک بھی گائے کی وہی حرمت برقرار رہی جو ہندوؤں کے نزدیک ہے۔ سرحدی لوٹ مار میں جب کبھی مغلوب مسلمان سکھوں کے قدموں پر گر پڑتے اور گھانس کا چھوٹا سا پولا اٹھا کر اپنے دانتوں میں دبا لیتے اور پکارتے کہ "میں تمہاری گائے ہوں۔" مسلمان خاص طور پر ملعون تصور کئے جاتے تھے اور سکھوں کو ٹوپی پہننے سے باز رکھنے کا مقصد یہ تھا کہ لباس میں بھی ان کا مسلمانوں سے امتیاز ہو۔ ان دشمنان ایمان کے ساتھ لڑائی کرنے کی ہدایت تھی اور انہیں کسی طرح امان دینے کی اجازت نہ تھی۔ ان کے علاوہ ان سکھوں کو جو مذہب کے پابند نہ ہوں اور جین اور جوگیوں کو بھی ملعون قرار دیا گیا تھا۔

دوسرے جزوی امور کے جواز و عدم جواز کے متعلق بھی ہدایتیں کی گئی تھیں۔ ایک سب سے اہم فرض گرنتھ کا روز پڑھنا قرار دیا گیا تھا۔ جس کی تعمیل ناممکن تھی کیونکہ سکھ عموماً ناخواندہ ہوتے تھے اور مجبوراً" انہیں اسی امر پر قناعت کرنا پڑا کہ وہ گاہے بگاہے اس کو پوجاریوں یا گرنتھوں سے پڑھوا کر سن لیا کریں یا اس کا کوئی حصہ جسے انہوں نے حفظ یاد کر لیا ہو دہرا لیا کریں۔

گوبند سنگھ کی تعلیمات کے شائع ہونے کے بعد سکھوں کے عقائد میں کوئی تغیر واقع نہیں ہوا لیکن جیسا کہ کسی دوسری جگہ بیان ہو چکا ہے ان ہدایتوں کی تعمیل میں

سہل انگاری ہونے لگی یہاں تک کہ ابھی چند سال قبل مسلموں کی ایک جماعت پیدا ہو گئی جس کی بناء راولپنڈی کے ایک اداسی فقیر نے قائم کی- اس کا جانشین ضلع لدھیانہ کا ایک نجار رام سنگھ نامی بڑا صاحب اثر شخص ہو گیا اور بہت سے فدائی اس کے ساتھ ہو گئے جو کہ کوکا کے نام سے موسوم کئے گئے- ان لوگوں کی شناخت ایک خاص لباس اور مخصوص راز دارانہ الفاظ اور سیاسی جمعیت تھی-

اصل تحریک کا رنگ شروع میں مذہبی تھا جس کا مقصود یہ تھا کہ سکھوں کے طرز عمل کی اصلاح کر کے انہیں گوبند سنگھ کے زمانے کے مطابق بنایا جائے- جس قدر اس جماعت میں ترقی ہوتی گئی ان لوگوں کے حوصلے بھی بڑھتے گئے- یہاں تک کہ خالصہ حکومت کی تجدید اور انگریزی کے نیست و نابود کرنے کی تلقین شروع کر دی گئی- اس وقت میں حکومت پنجاب کا چیف سیکرٹری تھا اور ان دنوں میں کوکوں کی کاروائیوں سے بہت کچھ تشویش و پریشانی پیدا ہو رہی تھی- باوجود ان کے باغیانہ اور مفسدانہ تعلیم کے ان کے ساتھ کوئی مزاحمت اس وقت تک نہیں کی گئی جب تک انہوں نے اعلانیہ بغاوت پھیلا کر لدھیانے کے قریب مسلمانوں کے قصبے مالیر کوٹلہ پر حملہ نہیں کیا- اس واقعے کے بعد بغاوت نہایت سختی کے ساتھ فرو کی گئی اور سرسری سماعت کے بعد 50 اشخاص کو توپ دم کیا گیا- اس کے علاوہ کوکا سرغنوں کو پنجاب کے مختلف اضلاع میں یک ہی شب میں گرفتار کر لیا گیا اور وہ جلاوطن کئے گئے- ان میں سے کچھ رنگون بھیجے گئے کچھ عدن اور جو زیادہ اہمیت نہیں رکھتے تھے وہ پنجاب کے قید خانوں میں قید کئے گئے- قسمت انبالہ کے مقامی عہدہ داروں کا باغیوں کو توپ دم کرنا حکومت پنجاب اور حکومت عالیہ نے ناپسند کیا اور ہنگامہ فرو کرنے کے لئے اس عمل کو سنگین تصور کیا لیکن ان کی کارروائی نیک نیتی پر محمول کی گئی اور عموماً اس مصلحت کی تائید کی گئی جس کی بناء پر اس ہنگامے کو اس قدر جلد اور یقینی طور پر فرو کیا گیا- بہرحال یہ امر یقینی ہے کہ جو کارروائی اس وقت کی گئی اس نے اس زبردست اور ہیبت ناک شورش کی پورے طور پر بیخ کنی ہو گئی جو حکومت برطانیہ کے خلاف برپا کی گئی تھی اور گو کوکا جماعت نیست و نابود نہیں ہوئی لیکن یہ فرقہ ذلیل و خوار تصور کیا جانے لگا اور اس کی دست برد

و عیاشانہ روش کی وجہ سے سکھوں کی جماعت عام طور پر اسے حقیر و ذلیل سمجھنے لگی۔

عام معاملات میں سکھ ہندو شاستر کے پیرو تھے لیکن بعض اہم معاملات میں خصوصاً شادی بیاہ کے بارے میں وہ خود اپنے علیحدہ مراسم کے پابند تھے اور اس لحاظ سے وراثت و ترکے کے معاملات پر ان مراسم کا اثر پڑتا تھا یہ مسلمہ قاعدہ تھا کہ اگر ورثاء ذکور نہ ہوں تو بیوہ کو تمام جائداد ترکے میں مل جاتی تھی لیکن اس نامہذب زمانے میں جب کہ تنازعات کا تصفیہ صرف تلوار سے ہوا کرتا تھا اور مستورات میں اتنی طاقت نہ تھی کہ مردوں کی کمائی پر جو انہوں نے اپنے قوت بازو سے یا زبردستی حاصل کی تھی قبضہ برقرار رکھ سکیں اس رسم سے بڑی مشکلیں پیش آتی تھیں۔ سکھ مستورات میں بھی اپنی جنس کی بہت سی خوبیاں موجود تھیں اور اکثر اوقات دانشمندی اور خوش انتظامی میں مردوں کے ہم پایہ ثابت ہوئی تھیں پٹیالہ کی رانی اوس کور' انبالہ کی رانی دیاکور اور مائی سوڈاکور جو مدت تک زبردست کنہیا خاندان کے جتھے کی سرغنہ رہیں اس کی مثالیں ہیں۔ لیکن عموماً جب کوئی جائداد کسی سکھ بیوہ کے ہاتھ لگ جاتی تھی تو اندیشہ یہ رہتا تھا کہ وہ اس کے آشنا کے دست تصرف میں نہ آ جائے اور وہ اس کو اس وقت تک اپنے ذاتی نفع کے لئے استعمال نہ کرے جب تک کہ کوئی دوسرا شخص جس کا حق مرجح ہے اس پر قبضہ نہ کر لے۔ اس خرابی کے دفع کرنے کے لئے متوفی کے بھائی کے ساتھ اس کی بیوہ کے ازدواج کی رسم کو رواج دیا گیا جو اگلے زمانے میں یہودیوں میں جاری تھ بیوہ کو اختیار تھا کہ متوفی کے بھائیوں میں سے جسے چاہے پسند کر لے لیکن بڑا بھائی اگر چاہے تو اس کا حق مرجح سمجھا جاتا تھا۔ اس قسم کے ازدواج کو چادر ڈالنا نیز کریوا (کر ہوئی) کہتے تھے جس سے مراد یہ تھی کہ عورت کا پہلا بیاہ ہو چکا ہے۔ چونکہ اس رسم کی غرض یہ تھی کہ خاندان میں جائداد کی توریث قائم رہے اس وجہ سے اس قسم کے ازدواج سے جو اولاد پیدا ہوتی تھی وہ ویسی ہی جائز سمجھی جاتی تھی جیسے باقاعدہ شادی بیاہ کی اولاد اور توریث کے بارے میں ایسی اولاد کے حقوق بھی اس قسم کی اولاد کے مساوی تھے لیکن ان کا رتبہ و وقعت شادی کی اولاد کی سی نہ تھی۔ چادر ڈالنے کی رسم کی سہولت نے خصوصاً لڑائی کے موقع پر جب کہ شادی کے دیر طلب مراسم انجام دینے

دشوار تھے یا دلہن کے ذات و رتبے کے لحاظ سے موزوں نہ تھے جو اکثر لونڈی یا لڑائی میں گرفتار کی ہوئی کوئی لڑکی ہو سکتی تھی بھائی کی بیوہ کے علاوہ دوسروں کے ساتھ بھی اس طریقہ عمل کو عام طور پر رواج کر دیا۔ لیکن چونکہ ایسے موقعے پر خاندان میں توریث برقرار رکھنا مقصود نہ تھا اس لئے چادر ڈالی ہوئی بیوی اور اس کی اولاد کی کوئی وقعت نہ تھی اور اس کی حیثیت آشنا سے زیادہ نہ ہوتی تھی۔ چونکہ اس طریقے میں کوئی رسم ادا نہ کیا جاتا تھا اس لئے اس کی حالت ہمیشہ مشتبہ رہتی تھی اور بسااوقات لونڈیوں نے اپنے آقاؤں کی وفات کے بعد اس قسم کی چادر ڈالنے کی ازدواج کی بناء پر جائداد کا دعویٰ کیا اور لوگوں نے ان کی تائید میں جھوٹی گواہیاں دیں کیونکہ مشرق میں ایسی گواہی دستیاب کرنا کچھ دشوار نہیں ہے (11) مہاراجہ دلیپ سنگھ کی ماں کی بھی یہی حالت تھی۔ وہ صرف محل کی سازش سے لاہور کے تخت کا وارث قرار دیا گیا۔ حالانکہ اس کی ماں ایک معمولی لونڈی تھی۔

عام طور پر یہ امر تسلیم کر لیا گیا تھا کہ بیوہ جب اس کے متوفی شوہر کے بھائی اس کے خواستگار نہ ہوں تو عقد ثانی کرنے کی مجاز ہے اور ایسی مثالیں بھی موجود ہیں کہ عورتوں نے تیسرا بیاہ تک کیا ہے جس کو تھریوا کہتے ہیں۔

بیٹوں کی وراثت کے بارے میں دو رسمیں جاری تھیں۔ ایک تو چادر بند جو مانجھا سکھوں میں زیادہ مروج تھا۔ دوسرے بھائی بند جس کا رواج مالوا سکھوں میں تھا۔ پہلے کے رو سے جائداد ماؤں پر مساوی حصوں میں تقسیم ہوتی تھی اور دوسرے کے لحاظ سے بیٹوں پر مساوی حقوق میں مثلاً ایک شخص نے دو بیوائیں چھوڑیں جن میں سے ایک کے ایک لڑکا اور دوسرے کے تین لڑکے ہیں۔ چادر بند کی رو سے پہلی بیوہ کے اکیلے لڑکے کو نصف حصہ ملے گا اور اس کے باقی تین سوتیلے بھائیوں کو فی بھائی چھٹا حصہ۔ بھائی بند کے لحاظ سے ہر لڑکے کو چوتھا حصہ ملے گا۔

شادی بیاہ کی ان بے قاعدہ رسوم کی پابندی اونچی ذات والوں یعنی برہمن و کھتریوں میں باوجود مذہب سکھ قبول کرنے کے نہیں ہے۔ یہ لوگ قدیم ہندو رسموں کے پابند ہیں لیکن باوجود اس کے قدیم مذہب کی پابند جماعت انہیں ذات باہر ہی تصور کرتی ہے

اور اپنی لڑکی نہیں دیتی الا اس صورت میں کہ ایک بڑی رقم بطور معاوضہ دی جائے۔
ایسی صورتوں میں لڑکی والے اپنی لڑکی کو یہ سمجھ لیتے ہیں کہ وہ مرگئی ہے۔

لڑکیاں اور ان کی اولاد ہر صورت میں مستحق توریث نہیں سمجھی جاتیں کیونکہ اگر ایسی توریث ایسے لوگوں میں جائز رکھی جائے جن میں لڑکی سن بلوغ پر پہنچنے کے ساتھ ہی بیاہ دی جاتی ہے تو جائداد کے اصل خاندان سے منتقل ہو جانے کا اندیشہ ہے۔

اونچی ذات کے سکھ سرداروں میں ستی یا بیوہ کا اپنے خاوند کی نعش کے ساتھ جلنے کا طریقہ جاری تھا ان لوگوں میں عورت کو عقد ثانی کا حق حاصل نہ تھا۔ بسااوقات متوفی کی ملازمہ اور گھر بیٹھی آشنا کو بھی اس رسم کی پابندی کرنی پڑتی تھی۔ مثلاً جب مہاراجہ رنجیت سنگھ کا انتقال ہوا تو اس کی ایک رانی مہتاب دیوی (12) اور اس کے زنانے کی تین عورتیں جن کا مرتبہ رانی کا تھا ان کے ساتھ جلائی گئیں۔ رنجیت سنگھ کے فرزند مہاراجہ کھڑک سنگھ کی نعش کے ساتھ اس کی چادر ڈالی ہوئی بیوی ایسر کور جو بڑی حسین عورت تھی جلائی گئی۔ وہ ستی ہونے پر رضامند نہ تھی اور کہا جاتا ہے کہ دیوان دھیان سنگھ نے اسے زبردستی جلوا دیا۔ رنجیت سنگھ کے پوتے نونہال سنگھ کی دو بیویاں اس کے ساتھ ستی ہوئیں۔ ان تمام واقعات میں سے دو آخری ستیاں پنجاب کے مشہور واقعات میں سے ہیں جن سے اس رسم کے حسن و قبح کا اظہار ہوتا ہے۔ بالفاظ دیگر یا نہایت بے رحمی و سفاکی سے مذہب کے پردے میں ان کی قربانی کی گئی یا انہوں نے اپنی خوشی اور رضامندی سے جل کر جان دی اور اپنی وفاداری اور جاں نثاری کا ثبوت دے کر نیک نامی کا تمغہ حاصل کیا۔

پہلا واقعہ 22 ستمبر 1845ء میں ہوا۔ عیاش و شرابی جواہر سنگھ کو جو رانی جنداں کا بھائی اور ریاست کا دیوان تھا اہل فوج نے غصے میں آکر اس شبہ میں مار ڈالا کہ وہ خالصہ مذہب کے ساتھ بد عہدی کرتا ہے اور ان کا یہ شبہ درحقیقت ایک حد تک درست بھی تھا۔ لاہور کے قلعے کے باہر میدان میں اس کی نعش جلائی گئی۔ قرار پایا کہ اس کی چار بیوائیں بھی اس کے ساتھ جلائی جائیں۔ ان بدنصیب عورتوں نے اپنی جان بچانے کے لئے بہت التجائیں کیں لیکن ایک بھی قبول نہ ہوئی۔ چتا کا منظر بڑا دلخراش تھا۔ اہل

حفاظت ریاستوں میں انگریزوں کا طرز عمل بھی یہی رہا مگر اس کے وجوہ ان اسباب سے زیادہ قوی تھے کیونکہ مالوا سنگھ مانجھا سکھوں کے مقابلے میں دلی کی حکومت کے کہیں زیادہ فرمانبردار تھے اور مانجھا سکھ فاتح اور اپنے مقبوضات پر بلا مداخلت غیرے قابض تھے جبکہ رنجیت سنگھ محض قزاق سرداروں میں زیادہ کامیاب ۔ بمصداق اندھوں میں کانا راجہ تھا اس قاعدے کے لحاظ سے سرکار انگریزی بعض بڑی بڑی ریاستوں پر قابض ہو گئی مثلاً بوریا' انبالہ' تھانیسر' دیال گڑھ' روودور' مصطفیٰ آباد' فیروز پور اور کیتھل- 1860ء کے بعد سرکار انگریزی نے اپنی پالیسی میں تبدیلی کی اس طرح جائدادوں کو ضبط کر کے قبضہ کرنے سے دست بردار ہونے اور بڑے بڑے سرداروں کو متنبہ کرنے کا حق عطا کیا- یہ مسلمہ امر ہے کہ عموماً یہ طرز عمل دانشمندانہ تھا اور اس سے سرکار انگریزی کا اقتدار دیسی ریاستوں میں قوی و مستحکم ہو گیا لیکن بحث طلب امر یہ ہے کہ کیا اس قسم کے سلوک میں افراط اور عمومیت نہ تھی اور آیا یہ امر زیادہ مناسب نہ تھا کہ تبنیت کی اجازت ایک معینہ میعاد تک سرکاری اعلیٰ خدمات کے صلے میں خاص رعایت کے طور پر دی جاتی اور ہر منفرد صورت میں حالات پیش آمدہ کے لحاظ سے اس کے جاری رکھنے یا نہ رکھنے کا تصفیہ کیا جاتا بہ حالت موجودہ لارڈ کیننگ کے بلا امتیاز عام طور پر تبنیت کی اجازت دے دینے سے سرکار کو گویا خداوند مجازی بنا دیا جس کی بخشش و عطا مستحق و غیر مستحق ہر ایک کے لئے یکساں ہے- اس طور پر وفاداری و جان نثاری کی بہترین جزا اور بغاوت و سرکشی کی سزا دینے کا موقع ہاتھ سے نکل گیا-

رنجیت سنگھ کی پیدائش کے وقت پنجاب کی حالت

گرو گوبند سنگھ نے اپنے معتقدین کو یہ تلقین کی تھی کہ وہ آخری گرو ہے۔ اس کے مرنے پر جس کام کی انجام دہی اسے مقصود تھی اس کی تکمیل ہو چکی تھی یعنی سکھوں کی مغرور و حریص جنگجو جماعت قائم اور ان لوگوں کے دلوں میں مسلمان حملہ آور فاتحین اور آقاؤں کی جانب نفرت جاگزین ہو چکی تھی۔ گرو کے دماغ نے خالصہ جماعت اس طرح پیدا کر دی تھی جس طرح کہا جاتا ہے کہ جوپیٹر دیوتا کے سر سے مزوا پیدا ہوئی تھی۔ یہ لوگ اب فتح حاصل کرنے کے لئے مسلح اور عام ساز و سامان سے آراستہ تھے۔ صرف یکجہتی' فوجی جذبے اور ہم مذہبی نے ان برگزیدگان شمشیر کو قوی بنا رکھا تھا۔ مگر دشمن کے ہزاروں کے مقابلے میں ان کی تعداد محدود تھی اپنے مخالفین کے مقابلے میں جنہیں ہندوستان کے تمام وسائل پر اقتدار حاصل تھا یہ لوگ کم مایہ اور کم حیثیت تھے۔ سوائے مذہب' بہادری و تلوار کے ان کے پاس کچھ نہ تھا اور سلطنت مغلیہ سے صرف اسی برتے پر وہ مصروف پیکار ہوئے۔ اس سلطنت کے محاصل شاہ اورنگ زیب کے زمانے میں آٹھ کروڑ سٹرلنگ یا اس رقم کے دگنے تھے جو اب باوجہ کثرت آبادی سرکار انگریزی کو حاصل ہوئے ہیں۔ سکھوں کو خوش قسمتی سے شاہ اورنگ زیب کے تعصب نے بہت کچھ مدد دی کیونکہ اس کی وجہ سے ہر ایک ہند باجگذار ریاست میں لوگ اس کے دشمن ہو گئے تھے اور بالاخر اسی سبب سے اس کی سلطنت عظیم پاش پاش ہو گئی۔ خود مختاری جس کی بنا محض شخصی اوصاف پر ہو کبھی محفوظ نہیں رہ سکتی۔ ظلم کا خار دار شجر دانشمندی' بے غرضی اور کرم گستری کا ثمر نہیں لاتا۔ قسمت کے کھیل میں عام طور پر جہل' ظلم اور تعصب کا پانسہ ایک خود مختار بادشاہی خاندان کے نام ہی نکلا کرتا ہے۔ اگر اکبر اعظم کے مثل فرمارواؤں کا سلسلہ

جاری رہ سکتا جو غالباً تمام اوصاف کو مد نظر رکھتے ہوئے مشہور مطلق العنان حکمرانوں میں باعتبار فہم و فراست ذی شان اور فرد کامل تصور کیا جا سکتا ہے تو سلطنت مغلیہ آج بھی اسی طرح سرسبز ہوتی اور انگریز تجار تخت طاؤسی کے روبرو بہ عجز و انکسار شاہی نوازشوں کے اسی طرح طالب نظر آتے جیسے کہ شروع زمانہ سلطنت میں تھے۔ لیکن اورنگ زیب کا ناقابل برداشت تعصب جس کی ذات میں مذہبی امور سے قطع نظر کر کے بہت سی خوبیاں تھیں اور اس کی زندگی عیوب سے پاک تھی اپنے پیشروؤں اور جانشینوں کے اسراف سے زیادہ سلطنت کی بربادی کا باعث ہوا۔

اس کی ایذا رسانی سے سکھوں میں اپنے مذہب کے ساتھ وابستگی پیدا ہو گئی اور اذیت و موت کی تخویف نے ایک شخص کو بھی اسلام قبول کرنے پر آمادہ نہ کیا۔ ہمیشہ سے یہ ہوتا چلا آیا ہے کہ شہدا کا خون کشت مذہب کی سیرابی کا باعث ہوا کرتا ہے۔ اورنگ زیب اس کی بیخ کنی پر تو قادر نہ ہو سکا۔ مگر اس کے مذہبی تعصب اور ناروا داری کا یہ نتیجہ ضرور ہوا کہ سکھ مذہب کے پیروؤں میں حرارت اور جوش مذہبی پیدا ہو گیا اور سکھوں کو اسلام سے ایسی سخت نفرت ہو گئی کہ جس کی چنگاریاں اب تک ان کے سینوں میں پوشیدہ ہیں اور اگر انگریزی حکومت آج اپنا دست راست اٹھا لے تو پھر وہ شعلے آج ہی مشتعل ہو جائیں۔ دہلی نے اس حرارت کی چاشنی چکھی ہے اور ممالک مغربی و شمالی کے افغانوں نے بھی۔ اور اگر وسط ایشیا کے غازی ہندوستان کی تاخت و تاراج پر دیوانہ وار اٹھ کھڑے ہوں تو پھر وہی آگ بھڑک اٹھے گی۔

گرو گوبند سنگھ کی وفات سے لے کر رنجیت سنگھ کی پیدائش تک سکھوں کی تاریخ کا ذکر نہایت ہی مختصر الفاظ میں کیا جا سکتا ہے (خصوصاً ایسی حالت میں جب کہ میں نے سکھوں کی ابتدا و خصائص و مذہب کے بارے میں اس سے قبل ذکر کر دیا ہے) تاکہ یہ معلوم ہو جائے کہ کس قسم کے لوگوں پر مہاراجہ کی حکومت تھی اور ان کے عقائد کیا تھے جس کا منصبی حیثیت سے وہ قائم مقام تھا۔ مانجھا سکھوں کے متعلق 1708ء سے لے کر 1780ء تک 72 سال کا تاریخی مواد کم یاب و ناقابل اعتماد ہے۔ لیکن جنوبی علاقے کے سکھوں کے متعلق ہماری معلومات زیادہ ہیں اس زمانے کے اسلامی واقعات کا بیان

مختلف و دلچسپ ہے۔ یہ نادر شاہ اور احمد شاہ کے حملوں اور سلطنت مغلیہ کے بہ تدریج انحطاط کے واقعات سے پر ہیں۔ جبکہ اس سلطنت کے صوبہ داروں نے بادشاہ کے اقتدار سے سبکدوش ہو کر اپنی خود مختاری کا اعلان کر دیا تھا۔

گوبند سنگھ کا فوجی جانشین بندا تھا جس نے اورنگ زیب کے تین جانشینوں کے زمانے میں بڑی مستعدی و تھوڑی بہت فوجی قابلیت کا اظہار کیا۔ شاہی فوج کو ایک سے زیادہ موقعوں پر شکست دی باری دوآب کے قطعہ ملک کو تاخت و تاراج کیا اور بالآخر 1716ء میں اپنے ہزاروں ساتھیوں کے ساتھ گرفتار و قید ہو کے دہلی بھیج دیا گیا جہاں وہ مختلف ایذا رسانیوں کے بعد قتل کیا گیا قتل کرنے سے پیشتر اسے اس امر پر مجبور کیا گیا کہ اپنے لڑکے کو اپنے ہاتھ سے ہلاک کرے۔ اس قطعی شکست کے بعد سکھوں کے حالات کا نادر شاہ کے حملے کے زمانے تک کوئی تذکرہ نہیں ہے۔ نادر شاہ کے دہلی پر بہ آسانی فتح پانے اور شہر کی لوٹ مار سے سلطنت مغلیہ اس درجہ کمزور ہو گئی کہ سکھوں کی ہمت پھر بندھی اور وہ لڑائی پر پھر آمادہ ہو گئے۔ ان کی نظر میں تمام مسلمان خواہ وہ ایرانی ہوں یا افغان یا مغل یکساں قابل تنفر تھے اور انہوں نے بڑی سرعت کے ساتھ یا تو نادر شاہ کی منتشر فوج پر حملہ کیا یا احمد شاہ ابدالی کے لشکر کے ساز و سامان کو لوٹ لیا جو نادر شاہ کے قتل کے بعد افغانستان کا مالک بن گیا تھا اور 1747ء میں پنجاب پر حملہ آور ہوا تھا۔ اس بادشاہ نے سکھوں کی دلجوئی کی اور وہ اس بات میں خوش تھا کہ انہیں اپنا طرفدار بنا کر پہلے دہلی کی سلطنت کے خلاف اور پھر مرہٹوں کے مقابلے میں جنہیں اس نے بعد میں شکست دی ان سے کام لیتا۔ لیکن سکھ اگرچہ مغلوں سے متنفر تھے لیکن افغانوں سے بھی انہیں کوئی انس نہ تھا اور وہ یہ نہیں چاہتے تھے کہ دہلی میں ایک ایسی سلطنت قائم کر کے جو اپنی ماقبل سلطنت سے زیادہ طاقتور ہو اپنی گردنوں میں اس سے زیادہ مضبوط طوق غلامی ڈال لیں۔ سکھوں کی شہسواری' سادہ مزاجی اور سرعت نقل و حرکت نے انہیں مہیب دشمن بنا رکھا تھا اور گو انہوں نے مسلمانوں کی مرتب اور باساز و سامان آراستہ فوجوں سے سخت اور متواتر شکستیں کھائیں لیکن ان شکستوں سے ان کی ہمت نہ ٹوٹی اور وہ صرف اس لئے منتشر ہوتے تھے کہ دوسری بار اس سے

زیادہ قوت کے ساتھ مقابلے پر آئیں۔

احمد شاہ نے جو اولوالعزم سردار تھا گو اس میں اجتماع و انتظام کی قابلیت بہت کم تھی اور جس کے مفتوحہ مقامات بہت جلد اس کے قبضے سے نکل جاتے تھے کئی سال تک مسلسل ہندوستان پر حملے کئے۔ بعض اوقات وہ جنوب کے جانب دہلی تک بڑھتا چلا گیا اور دوسرے موقعوں پر لاہور یا ستلج سے آگے نہ بڑھا۔ ہر موقع پر اسے سکھوں سے مقابلہ کرنا پڑا جن کا اعتماد و قوت روبہ ترقی تھا اور جن میں ہمیشہ جتھ یا مثل بندی ہوتی رہتی تھی جس کے ذریعے سے قزاق سرداروں کا ایک گروہ جمہوریت و مساوات کے اصول پر کسی ایک طاقتور پیشوا کے جھنڈے کے ساتھ شریک اور اس کے عام احکام کا پابند ہو کر لڑنے کا عہد کیا کرتا تھا۔ اس اجتماع نے انہیں اور مہیب بنا دیا۔ مختلف پیشواؤں نے اپنی بستیوں کی جگہوں پر قلعے تعمیر کر لئے اور بتدریج پنجاب کے تمام میدان پر غالب آ گئے اور اس طور پر مسلمان صوبہ داروں کو ان کے قلعہ ہائے سرہند' دینا نگر اور لاہور میں محصور کر دیا۔ لاہور پر انہوں نے دو مرتبہ قبضہ کر لیا اور عرصے تک اس پر قابض رہے۔ انہوں نے امرتسر میں متبرک مقامات کی از سرنو تعمیر کی اور نہر جل تالاب کو پھر بھر دیا۔ جب افغان بادشاہ پہاڑوں سے اتر کر سال بہ سال ہندوستان پر حملہ آور ہوتا تو سکھ اس کے روبرو سے ہٹ جاتے اور اس کے واپس ہوتے ہی غارتگری جاری کر دیتے اور جسے وہ عارضی طور پر اس کے آنے کی وجہ سے چھوڑ بیٹھتے تھے پھر حاصل کر لیتے۔ سکھوں کی تاریخ میں 62-1761ء ایسا سال ہے جس میں سکھوں کی تاریخ میں ایک تغیر عظیم واقع ہوا۔ اس کے مختصر واقعات اس وجہ سے قابل ذکر ہیں کہ خالصہ فوج پہلی مرتبہ ایک باقاعدہ فوج کے مقابلے پر آئی۔ اگرچہ انہیں شکست فاش نصیب ہوئی لیکن انہیں اپنے آپ پر اس قدر بھروسہ ہو گیا کہ دوسرے ہی سال انہوں نے سرہند کا صوبہ فتح کر کے ایں روئے ستلج ریاستوں کی مستحکم بنا قائم کر لی۔

1761ء میں احمد شاہ نے زین خاں کو سرہند کا صوبہ دار مقرر کیا تھا۔ لیکن جوں ہی افغانوں نے وطن کی طرف مراجعت کی سکھوں نے تعداد کثیر میں مجتمع ہو کے زین خاں کو قلعے میں محصور کر دیا اور اگر مالیر کوٹلے کے مسلمان پٹھان مدد پر نہ آ جاتے تو یقیناً

سکھ قلعے پر قبضہ کر کے فوج کو تباہ کر ڈالتے احمد شاہ جب دوسرے سال ہندوستان آیا تو اس نے سکھوں کے سرہند پر حملہ کرنے کی گستاخی کی پاداش میں انہیں سزا دینے کا مصمم ارادہ کر لیا۔ سکھ برنالے کے قریب جمع ہوئے تھے جو اس زمانے میں پٹیالے کا ایک بڑا شہر تھا اور ایں روئے ستلج کے سرداروں کے علاوہ مانجھا سکھوں کے اکثر پیشوا احمد شاہ کے آگے بڑھتے ہی ستلج عبور کر کے ان کے ساتھ شامل ہو گئے تھے۔ افغانوں کی نقل و حرکت ایسی عجلت کے ساتھ تھی کہ وہ سکھوں پر دفعتہً پہنچ گئے اور ان کو محصور کر کے لڑنے پر مجبور کیا۔ سکھوں کو شکست نصیب ہوئی ان کے بیس ہزار آدمی مارے گئے اور بہت سے گرفتار ہوئے جن میں پٹیالے کا سردار آلا سنگھ بھی تھا جس کی رہائی کے لئے پانچ لاکھ معاوضہ طلب کیا گیا۔ بمشکل تمام یہ رقم ادا کی گئی۔ احمد شاہ نے جو بڑا ذی فہم تھا یہ سمجھ کر کہ سکھوں پر اپنی طاقت کا بین ثبوت دینے کے بعد ان کی تالیف قلوب کرنا بڑی دانش مندی ہے آلا سنگھ سے بغل گیر ہو کر اسے خلعت اور راجہ کا خطاب عطا کیا۔

اس غیر معمولی اعزاز سے دوسرے سکھ سرداروں کے دل میں آلا سنگھ سے کدورت و رنجش پیدا ہو گئی اور انہوں نے یہ مشہور کیا کہ اس نے ان کے ساتھ دغا کی اور یہ خطاب اسی دغا کے صلے میں اسے دیا گیا ہے اور سکھوں کے لئے یہ امر باعث توہین ہے کہ وہ ایک مسلمان غیر ملکی اور دشمن کا دیا ہوا خطاب قبول کریں۔ یہ لوگ اپنی شکست کا انتقام اس سے ضرور لیتے لیکن سردار جسا سنگھ اہلو والیہ جو اس زمانے میں آلا سنگھ سے زیادہ باثر شخص تھا اس کی طرفداری پر کمربستہ ہو گیا۔ اس وقت تو بات رفع گزشت ہو گئی لیکن آلا سنگھ کے لئے یہ لازم ہو گیا کہ وہ اپنے افعال سے یہ ثابت کر دے کہ وہ درانی بادشاہ کا محکوم نہیں ہے۔

احمد شاہ کے کابل واپس ہوتے ہی سکھوں کی ہمت پھر بڑھ گئی۔ ستلج کے شمال و جنوب کی ریاستیں پھر ایک بار باہمی تنازعات کو فراموش کر کے سرہند پر متفقہ کوشش سے دھاوا کرنے پر آمادہ ہو گئیں۔ آلا سنگھ بھی بڑے جوش و خروش سے ان کا شریک ہوا۔ سرہند کے قرب و جوار میں سکھ مانجھا سے کثیر تعداد میں جمع ہوئے اثناء راہ

میں انہوں نے لاہور کے جنوب میں قصور شہر و قلعے پر قبضہ کر لیا۔ مالوے کے سردار بھی آ ملے اور پوری فوج جو تقریباً سب کے سب سوار تھے تیئس ہزار کی تعداد تک پہنچ گئی۔ زین خاں صوبہ دار نے اس بھروسے پر کہ باقاعدہ فوج کا نظارہ سکھوں کے دلوں میں ویسی ہی دہشت پیدا کر دے گا جیسا کہ اس سے قبل ظاہر ہو چکا تھا فوج کو قلعے سے باہر لا کر لڑائی شروع کی لیکن وہ مارا گیا اور فوج کو شکست فاش ہوئی۔ سکھوں نے فوراً شہر پر قبضہ کر لیا اور اپنے گرو کے بچوں کے وہاں مارے جانے کا انتقام میں انہوں نے اسے لوٹ کر برباد کر دیا۔ سرہند کا صوبہ فاتحین پر تقسیم کیا گیا۔ سرہند شہر اور اس کے مضافات راجہ آلا سنگھ کو دیئے گئے۔ احمد شاہ جب دوسرے سال آیا تو اس نے سرہند واپس لینے یا وہاں کوئی صوبہ دار مقرر کرنے کی کوشش نہیں کی بلکہ واقعات موجودہ کے لحاظ سے آلا سنگھ کو سارا ضلع سالانہ خراج ادا کئے پر دے دیا۔ (13)

اس طور پر سکھوں نے شکست و فتح دونوں حالتوں کے لحاظ سے ایسی حیثیت پیدا کر لی جو اس سے قبل انہیں حاصل نہ تھی اور اگر خانگی تنازعات دفع کر کے وہ باہم متفق ہو جاتے جیسا کہ سرہند کی فتح کے موقع پر ہوا تھا تو وہ بھی شمالی ہند میں اسی قدر مہیب و ناقابل دفع ہو جاتے جیسے جنوب و مغرب میں مرہٹے تھے۔ لیکن سکھوں کی جمہوریت پسندی نے جو لوگوں کے عام طبائع کے مطابق تھی ایسی تمام کوششوں کی مخالفت کی جس کی اسے کوئی ایک شخص اس کا حاکم بن سکے اور مرکزی حکومت قائم ہو سکے یہاں تک کہ رنجیت سنگھ نے تمام مخالفتوں کا قلع قمع کر کے رقیب و مخالف دونوں کو ایک حالت میں لا کر مطیع کر لیا۔

1762ء سے لے کر 1780ء رنجیت سنگھ کی پیدائش یا اس کے باپ مہان سنگھ کی وفات تک سکھوں کی تدریجی ترقی کے واقعات اور خود رنجیت سنگھ کے 1791ء میں سکر چاکیا کے مثل پیشوائی جانشینی کے واقعات جو اہم دلچسپ ہیں۔ دوسری کتابوں میں دیکھنا چاہئے۔ (14)

1- یہاں صرف سکھوں کے عام جتھہ یا مثل بندی یا ریاستوں کے واقعات کی تصریح ضروری ہے اور یہ کہ کون اضلاع کس سردار کے قبضے میں تھے۔

عام طور پر سکھوں کی بارہ مثلیں مانی جاتی ہیں اور گو یہ تعداد صحیح نہیں ہے اور اس میں بہت سی ایسی ریاستیں ہیں جو اس فہرست میں شامل کئے جانے کے قابل نہیں ہیں لیکن عام خیال کے مطابق میں نے اس کی پابندی کی بہرحال میں نے ان کی ترتیب اس اہمیت کے لحاظ سے کی ہے جو مہاراجہ رنجیت سنگھ کی پیدائش کے وقت انہیں حاصل تھی۔

1- پھلکیاں	5- رام گڑھیا	9- سکر چاکیا
2- اہلو والیہ	6- سنگھ پوریا	10- دولی والہ
3- بھنگی	7- کڑوڑا سنگھیا	11- نکئی
4- کنہیا	8- نشانیا	12- شہید

مذکورہ صدر میں سے نمبر2-3-4-5-9-11 ستلج کے شمال کے قطعات پر اور مابقی 6 اس کے جنوب کے قطعات پر قابض ہیں۔ پھلکیاں کی مثل ان سرداروں کے جتھے پر مشتمل ہے جن کے آباؤ اجداد یک جدی تھے اور آج کل ان کے جانشین ان کی اولاد میں سے مہاراجہ پٹیالہ' راجگان جنید' نابھہ و سرداران بھدوڑ' ملوڈ اور بعض ان سے کم رتبہ سردار ہیں۔ سکھوں کی ابتدائی تاریخ میں اسے بہت کچھ اہمیت حاصل تھی لیکن باوجود خاندانی تعلق کے یا شاید اسی کی بنہ دولت یہ مثل شاذ و نادر باہم مل کر کام کرتے اور جو موقعے اسے حاصل تھے ان سے بہرہ ور نہ ہوتی۔

اہلو والیہ خاندان کا بانی سادھو سنگھ ایک جاٹ کلال ذات کا تھا جو موضع اہلو میں آ کر سکونت گزیں ہوا اور اس پر اس کے خاندان کا نام پڑ گیا۔ لیکن اس اتحاد کا اصلی بانی سردار جسا سنگھ جو سادھو کی پانچویں پشت میں تھا۔ یہ شخص گرو گوبند کے انتقال کے دس سال بعد 1718ء میں پیدا ہوا۔ اس نے رفتہ رفتہ بہت اقتدار حاصل کر لیا تھا۔ نہایت قابل و کامیاب فوجی پیشوا تھا۔ دوسرے سرداروں کے مقابلے میں اس نے سکھوں میں یکجہتی پیدا کرنے کے متعلق سب سے زیادہ کوشش کی اور 1783ء میں جب وہ فوت ہوا تو اس وقت سکھ سرداروں میں وہ سب سے زیادہ بااثر تھا اس کے مقبوضات زیادہ تر ستلج و بیاس کے مابین کے قطعات میں تھے۔

بھنگیوں کا نام ان کے مشہور و معروف سردار ہری سنگھ کے بھنگ کے نشے کے دلدادہ ہونے سے پڑا۔ سردار ہری سنگھ نے اپنے بھائی جھنڈا سنگھ اور گنڈا سنگھ کو ساتھ لے کر امرتسر کے ضلع کو اپنا صدر مقام بنایا اور آس پاس کے ملک میں لوٹ مار مچائی۔ ملتان کو فتح کیا اور کئی سال تک وہ اس پر قابض رہا۔ مہاراجہ رنجیت سنگھ نے اپنے ابتدائی زمانے میں ہی ان کی قوت بالکل توڑ دی جیسا کہ آگے چل کر ظاہر ہو گا۔

کنہیا بھی بھنگیوں کے طرح طاقت ور تھے۔ ان کے مقبوضات مدت تک ان کے قبضے میں رہے جس کی وجہ یہ تھی کہ رنجیت سنگھ سے ان کا ازدواجی تعلق تھا۔ ان کے سردار جے سنگھ نے اپنی شیر خوار پوتی مہتاب کور رنجیت سنگھ کو 1786ء میں بیاہ دی تھی اور رنجیت سنگھ خود اس وقت چھ سال کا تھا 1789ء میں جب جے سنگھ مرگیا تو اس کی بہو سدا کور نے جو مہتاب کور کی ماں تھی اور بڑی قابل لیکن بدچلن تھی ریاست کی عنان حکومت اپنے ہاتھ میں لی اور اپنے داماد کے خلاف 1820ء تک مقابلے میں جمی رہی۔ کنہیوں کے مقبوضات امرتسر و گرداسپور کے اضلاع وسیع قطعات پر مشتمل تھے۔ اس خاندان کی دوسری عورت رانی چند کور نے جس کی شادی کھڑک سنگھ سے ہوئی تھی جو مہاراجہ رنجیت سنگھ کا اکلوتا بیٹا تھا سدا کور کی سی زندگی بسر کی۔ ان دو سازشی عورتوں کے واقعات سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ سکھوں میں نانک و گوبند کی آزادانہ تعلیم کی بدولت عورتیں کس درجہ ذی اثر ہوا کرتی تھیں۔

رام گڑھیا مثل کنہیا مثل کے ساتھ امرتسر کے متبرک شہر اور اس کے گرد و نواح کے اضلاع پر متصرف تھی اپنے عروج کے زمانے میں وہ آٹھ ہزار فوج میدان جنگ میں لا سکتی تھی۔ سردار جسا سنگھ جو اس کا نامور سپہ سالار تھا 1758ء میں اس کا پیشوا بنا۔ اس نے پہلے امرتسر کی قلعہ بندی کی۔ اس کے اردگرد مٹی کے اونچے اونچے دھس بنائے گئے اور اس کا نام رام روتی یا خدائی قلعہ رکھا۔ اوینا بیگ نے اس کے تھوڑے ہی عرصے بعد حملہ کر کے اسے برباد کر دیا۔ یہ شخص جالندھر دوآب میں شاہ دہلی کی جانب سے صوبہ دار تھا۔ اس کے مرنے پر جسا سنگھ نے قلعے کی از سرنو تعمیر کی اور اس مرتبہ اس کا نام رام گڑھ رکھا جس نام سے اس کی ریاست موسوم ہوئی۔

یہ شخص مشہور جنگجو امیر تھا۔ اس نے بڑی مہمیں سر کیں اور دہلی کی چار دیواری تک لوٹ مار کرتا پہنچ گیا۔ ایک موقع پر یہ ناف شہر میں جا پہنچا اور مغلوں کی بستی میں سے 4 توپیں اٹھا لے گیا۔ میرٹھ کے صوبہ دار نے اسے خراج ادا کیا۔

سنگھ پوریا کی ریاست ایک زمانے میں بڑی طاقتور تھی اور جسا سنگھ اہلو والیہ' پٹیالے کے آلا سنگھ کے زمانے سے قبل اس کا بانی سردار کپور سنگھ سکھ امرا میں سب سے زیادہ باأثر شخص مانا جاتا تھا۔ یہ شخص نواب کے نام سے مشہور تھا۔ سکھوں کے مخصوص اسلامی خطاب اختیار کرنے کی یہ ایک نادر مثال ہے۔ اس نے امرتسر کے قریب موضع فیض اللہ پور کو فیض اللہ خاں سے چھین کر اس کا نام سنگھ پورہ رکھا اور اسی نام پر مثل کا نام پڑ گیا گو اسے اکثر فیض اللہ پورہ کے نام سے بھی موسوم کیا جاتا ہے۔ یہ سردار 1753ء میں فوت ہوا اور جسا سنگھ اہلو والیہ بلحاظ اقتدار و اثر اس کا جانشین ہوا گو ملک پر اس کا بھتیجا خوش حال سنگھ اور اس کی اولاد قابض رہی اس ریاست کے زیر تصرف لدھیانہ' نور پور' جالندھر اور ضلع انبالے کے شمالی مغربی قطعات تھے۔

کڑوڑا سنگھی جس کا نام سردار کڑوڑا سنگھ کے نام پر ہے دریائے جمنا و مکندا کے مابین قطعات و قابض تھے۔ کلیسا کا زبردست خاندان اس مثل کا اصلی رکن تھا اور اب تک ایں روئے ستلج میں اس کی حکومت قائم ہے۔ اس کے علاوہ سردار بھگیل سنگھ کا خاندان بھی تھا لیکن اب وہ بالکل مٹ چکا ہے۔

نشانیہ یا وہ لوگ خالصے کے نشان یا جھنڈا اٹھاتے تھے کبھی زیادہ موقر نہ سمجھے گئے۔ سردار سے سنگھ نے جو اس ریاست کا سب سے بڑا شخص تھا 1763ء میں سرہند کی فتح کے بعد جائداد حاصل کی اس مثل والوں کا قبضہ انبالہ' لدران' شاہ آباد' آملوہ اور دوسرے اضلاع میں تھا۔

سکر چاکی اپنے اصلی مقبوضات کی مقدار کے لحاظ سے نہیں بلکہ اس لحاظ سے مشہور ہیں کہ ان کا آخری قائم مقام مہاراجہ رنجیت سنگھ تھا۔ ان کے حالات مہاراجہ کے حالات کے ضمن میں بیان کیے جائیں گے۔

دولی والی ریاست کا نام سردار تارا سنگھ کے موضع کے نام پر رکھا گیا جو اس کا اصل پیشوا اور اپنے ہمراہیوں کے ساتھ جالندھر کے بالائی دوآب اور انبالہ اور لدھیانے کے شمالی حصوں اور فیروز پور کے بڑے حصوں پر قابض تھا۔ نکائی اس ملک میں سکونت گزیں تھے جو نکا کے نام موسوم ہے اور لاہور و گجیرا کے مابین ملتان کی سمت میں واقع تھا۔ ریاست کبھی طاقت ور نہ تھی لیکن لڑائی کے موقعے پر دو ہزار سوار' اونٹوں کی قطار اور چند توپیں میدان جنگ میں لا سکتی تھی۔ پنجاب کے اس حصے کے جاٹ اپنی بہادری میں مشہور ہیں اور سردار ہیرا سنگھ و رام سنگھ کی ماتحتی میں انہوں نے نو لاکھ مالیت کی جاگیر گجیرا و شرق پور میں حاصل کر لی تھی۔

شہید مثل جو ان ریاستوں میں سب سے آخر تھی فوجی جماعت سے زیادہ ایک مذہبی جتھے کی حیثیت رکھتی تھی۔ اگرچہ اس زمانے میں پجاری بھی دوسرے دنیا دار لوگوں کی طرح لڑا کرتے تھے۔ خالصہ جماعت مذہبی جنگ آزماؤں کا ایک حقیقی اور اصلی گرو شہید مثل کا بانی سڈا سنگھ تھا جو تلونڈی کے مندر کا مہنت یا پجاری تھا۔ جہاں گرو گوبند نے قیام گاہ یا دمدمہ بنایا تھا۔ جالندھر کے مسلمان صوبہ دار سے لڑتے ہوئے وہ مارا گیا اور بیان کیا جاتا ہے کہ باوجود سر کٹنے کے گھوڑے پر سے گرنے سے قبل کچھ دور تک سوار اور دشمنوں کو قتل کرتا ہوا بڑھا چلا گیا۔ اسی بناء پر اسے شہید کے لقب سے موسوم کیا گیا اور اس کے پیروؤں کا یہی نام پڑ گیا۔ ریاست بطور خود لڑنے کے بجائے دوسروں کے شریک حال ہو جاتی تھی۔ رانیا' کھاری اور جرولی کے قرب و جوار میں اس نے املاک حاصل کیں اور اس کے جانشین اب بھی دمدمے کے مندر کے متولی ہوتے ہیں۔

یہ ہے مرقع سکھوں کی ان جنگجو ریاستوں کا جو اٹھارہویں صدی اور انیسویں صدی کے اوائل میں قائم تھیں لیکن ان کی ترکیب ہمیشہ تبدیل ہوتی رہی اور ان کے مقبوضات جلد جلد ایک دوسرے کے پاس منتقل ہوا کرتے تھے۔ کیونکہ وہ آپس میں اس سے زیادہ لڑتے تھے جیسے کے اپنے عام دشمن مسلمانوں سے لڑا کرتے تھے۔ ان کی باہمی جنگ کا خاتمہ رنجیت سنگھ نے اس طور پر کر دیا کہ جو ریاستیں انگریزوں کے زیر

حفاظت نہ تھیں انہیں بالکل نیست و نابود کر دیا۔ خود ریاستوں کے حدود کے اندر امرا میں باہم لڑائیاں ہوتی رہتی تھیں اور کبھی ایک کے اور کبھی دوسرے کی طرف سے اس کی ابتدا ہوتی تھی اس کی وجہ سکھ مذہب کی ترکیب تھی جس کی رو سے کسی قسم کی متابعت یا محکومیت تسلیم نہیں کی جا سکتی تھی۔ ان کے مذہب کا اصول اخوت تھا اور سکھوں کو یہ غرہ تھا کہ وہ آزاد سپاہیوں کا ایک جتھا ہیں یہ زمانہ خالصہ کی کم عمری و امنگ کا زمانہ تھا اور کسی فرد واحد کو کوئی غیر معمولی قوت و طاقت حاصل نہ تھی۔ ایسی حالت میں آزادی کا خیال حقیقت سے بعید نہ تھا۔ لیکن جس قدر بڑے سرداروں کی قوت میں بتدریج ترقی ہوتی گئی اسی قدر ان کے چھوٹے چھوٹے پڑوسی اس امر پر مجبور ہوتے گئے کہ دوسروں کی دست برد سے محفوظ رہیں یا خود ان ریاستوں میں ضم ہونے سے بچنے کے لئے کسی ایسے پیشوا کے زیر حفاظت ہوں جو ان کی حفاظت کر سکے اور اس کے معاوضے میں وہ میدان جنگ میں اس کی خدمت کریں۔

اس زمانے میں سکھ سردار اپنے تابعین سے بجز ایک گھوڑے اور بندوق کے اور کوئی مطالبہ نہیں کرتے تھے اور جو شخص ان کا تابع ہوتا وہ صرف ان کی حفاظت اور اس اجازت کا خواستگار ہوتا کہ خدا اور گرو کے نام پر اس سردار کے جھنڈے تلے رہ کر لوٹ مار کرنے کا موقع اس کو دیا جائے۔ تنخواہ کی کوئی بحث ہی نہ تھی۔ تمام سکھ اصولاً مساوی تھے۔ ہر سکھ جو امر سنگھ مجیٹھیا کی طرح تیر کو درخت میں آر پار چھید سکے یا ہری سنگھ نلوا کی طرح شیر کو ایک ضرب تیغ میں ہلاک کر سکے اپنے آپ کو سردار کہلانے کا مستحق تھا اور ایک جماعت تابعین کی قائم کر لیتا تھا۔ ایک وقت وہ آیا کہ سکھوں نے بھی یہودیوں کی طرح اپنا بادشاہ مقرر کیا اور ایک حد تک مساوات کے خواب کو بھول گئے جو انہیں کسی زمانے میں بہت عزیز تھا۔

لیکن ستلج کے شمال و جنوب کے تمام بڑے خاندانوں کی ابتدا ایک ہی سی ہے۔ جس طرح درحقیقت دنیا کی تمام طاقت ور جماعتیں قائم ہوئی ہیں اسی طرح سکھوں کی جماعت کی بنیاد تھی جو قوت کے قانون' تلوار کی دھار اور قوت بازو پر تھی۔ ہر سکھ سردار کی بڑی خواہش یہ تھی کہ اپنی طاقت و کامیابی کی بناء پر تابعین کو اپنی جانب رجوع

کرے۔ اگر ایسے تابعین لڑنا اور سواری جانتے تھے جن سے ہر سکھ آشنا تھا تو اس کی کوئی پرواہ نہیں کی جاتی تھی کہ وہ کون ہیں اور ان کی گزشتہ زندگی کے حالات کیا ہیں۔

س زمانے میں ہر گاؤں قلعہ بنا ہوا تھا جو اونچے ٹیلے پر بسا ہوتا تھا تاکہ گرد و اطراف کے میدان پر نظر پڑ سکے۔ گاؤں میں داخل ہونے کے لئے صرف ایک راستہ ہوتا تھا اور گلیاں ایسی تنگ ہوتی تھیں کہ دو آدمی بہ مشکل پہلو بہ پہلو چل سکتے تھے۔ پڑوسی کا لفظ دشمن کا مترادف سمجھا جاتا تھا اور کاشتکار ہل جوتنے کے وقت بندوق اپنے ساتھ رکھتے تھے۔ کوئی شخص اپنی زمین، گھوڑا یا بیوی اس وقت تک محفوظ نہ سمجھتا تھا جب تک کہ خود اس میں ان کی حفاظت کرنے کی طاقت نہ ہو کیونکہ گو سکھ پیشوا مسلمانوں کو لوٹ مار کرنے اور شاہی محافظوں کے گرفتار کرنے سے بہت خوش ہوتے تھے۔ لیکن پھر بھی وہ وطن دوست ہونے سے زیادہ قزاق تھے اور بلا کسی لحاظ یا رو رعایت کے لوٹ مار کیا کرتے تھے۔ لیکن ایک امر میں ان کی تعریف کی جا سکتی ہے اور یہی چیز جو ان کو وسط ہند کے پنڈاریوں اور آج کل کے ڈاکوؤں سے ممیز کرتی ہے ور وہ یہ کہ وہ انسانوں کی طرح لڑتے اور لوٹ مار کرتے تھے۔ اور ایسے موقعوں پر یہ عفریت نہ بن جاتے تھے سکھوں کی تاریخوں میں بہت کم ایسے واقعات نظر آئیں گے جن میں عورتوں کی آبرو ریزی اور مردوں کو اذیت پہنچائی گئی ہو جیسے ظلم و ستم کے واقعات سے جنوبی ہند کی تاریخ کے صفحات آلودہ ہیں۔

یہ سچ ہے کہ لڑائی میں بہت سی خوبصورت جاٹ لڑکیاں گرفتار کی گئیں لیکن وہ خود گرفتار کئے جانے پر رضامند تھیں۔ انہیں چھٹپنے ہی سے یہ تعلیم دی گئی تھی کہ خاوند کے اوصاف صرف یہ ہیں کہ وہ شجاع و طاقتور ہو اور وہ خاموشی سے اپنے آپ کو بطور انعام اسی شخص کے حوالے کر دیتی تھیں جس نے میدان جنگ میں لڑ کر انہیں جیتا ہو اور بعد میں ان کو اپنی جائز بیوی بنا لے گو اس نے ان کے بھائیوں کو قتل اور ان کے گاؤں کو آگ لگا دی ہو۔ لیکن اگرچہ سکھ بلاشبہ قزاق تھے اور جس طرح اسکاٹ لینڈ کے سرحد پر سو سال پہلے ہوا کرتا تھا۔ مویشیوں کی چوری ان کے ہاں ایک نہایت معزز پیشہ شمار ہوتا تھا لیکن بہرحال ان کا دینی جوش اور مسلمانوں سے تنفر جنہوں نے

عرصے سے انہیں پامال کر رکھا تھا اور ان کے مذہبی پیشواؤں کو قتل اور ان کی قربان گاہوں کو مسمار کر دیا تھا۔ اس سے ان کو ایک خاص قسم کا وقار حاصل ہو گیا تھا اور ان کے اغراض و فوجی مہمات میں تقریباً قومی رنگ پایا جاتا تھا۔

سکھوں کی فوج دل خالصہ (خدائی فوج) یا بعض اوقات بدھا دل (آزمودہ کار فوج) کے نام سے موسوم کی جاتی تھی اس میں زیادہ تعداد سواروں کی ہوتی تھی جو کٹیاوند کہلاتے تھے اور جو اپنی سواری کے گھوڑے خود مہیا کرتے تھے اور مال غنیمت سے ان کو دوہرا حصہ ملتا تھا۔ ہر سردار اپنے وسائل آمدنی کے لحاظ سے اپنے تابعین کے لئے جو بار گیر کہلاتے تھے گھوڑا اور ہتھیار مہیا کیا کرتا تھا اور کیونکہ مفتوحہ ملک سے سب سے پہلے خراج میں گھوڑے ہی وصول کئے جاتے تھے۔ اس لئے بسااوقات سپاہی لڑائی کے فتح ہونے پر عموماً سوار بن جاتے تھے۔ پیادہ فوج تمام فوج میں کم رتبہ سمجھی جاتی تھی اور صرف قلعوں کی محافظت اور چھاؤنیوں کی نگہبانی پر مقرر کی جاتی تھی۔ لڑائی میں سکھ ہمیشہ سوار فوج سے کام لیتے تھے۔ صرف اکالیوں کی پیادہ فوج کی وقعت کی جاتی تھی۔ یہ معتقدین کی ایک فدائی جماعت تھی جو گہرے نیلے رنگ کے کپڑے پہنتے اور پگڑیوں میں اپنے چکر لگایا کرتے تھے جو کچھ تو خوبصورتی کے لئے اور کچھ ہتھیار کا کام دیتے تھے گو وہ زیادہ مؤثر ثابت نہ ہوتے تھے۔

ان کی دوسری امتیازی علامت یہ تھی کہ پگڑی میں چاقو گھسا ہوا ہوتا تھا۔ گردن میں تلوار لٹکی ہوئی اور ہاتھ میں ایک چوبی عصا ہوتا تھا۔ یہ لوگ بھنگ کے نشے میں چور جوش میں آ کر سب سے پہلے شہروں پر دھاوا کرتے اور بسااوقات کارہائے نمایاں انجام دیتے تھے۔ لیکن یہ بالکل بے تربیت اور ناقابل اعتماد تھے اور صلح کے زمانے میں تو ان کی آزادی کی کوئی حد ہی نہ تھی۔ سکھوں کا ہتھیار تلوار تھی جس کے استعمال میں سوار خصوصاً مشاق تھے۔ پیادہ فوج تیر کمان اور بہت کم بندوق سے کام لیتی تھی لیکن بارود بہت کم دستیاب ہوتی اور سکھ اس کے استعمال کو زیادہ پسند نہ کرتے تھے اور عموماً بندوق پر ہاتھ رکھتے ہوئے ان کو خوف معلوم ہوتا تھا۔ اسی وجہ سے ان میں توپ خانہ نہ تھا۔ گو رنجیت سنگھ نے فرانسیسی اور اطالیہ کے عہدہ داروں کی امداد سے بہت

زبردست و باقاعدہ توپ خانہ قائم کیا تھا تاہم آخر وقت تک سکھ اس خدمت سے متنفر رہے اور مسلمان عموماً اس کام پر مامور کئے گئے۔ مال غنیمت عموماً مساوی طور پر تمام سپاہیوں میں تقسیم کیا جاتا تھا۔ اگر کوئی شخص محروم ہوتا تو اس کو معاوضہ دیا جاتا اور مقتول کے فرزند یا قریبی رشتہ دار کو اس کی جگہ مامور کیا جاتا تھا۔

سردار یا امراء اپنے خاندانی ناموں سے مشہور ہوتے تھے اور یہی ان کو ایک دوسرے سے ممیز کرتے تھے کیونکہ ہندو ناموں کی تعداد کم تھی اور سنگھ کا لقب عام تھا عموماً یہ اضافہ یا تو جائے پیدائش کے لحاظ سے ہوتا تھا یا اس شہر کے نام پر جسے انہوں نے فتح کیا ہو مثلاً جسا سنگھ اہلو والہ۔ بعض اوقات ذاتی خصوصیت و اوصاف کے لحاظ سے خواہ وہ اچھے ہوں یا برے مثلاً ندان سنگھ پنج ہتھہ (پانچ ہاتھ والا بلحاظ قوت جو میدان جنگ میں ظاہر ہوتی تھی) لہنا سنگھ جمنی (پستہ قد ہونے کی وجہ سے) مہر سنگھ لمبا (دراز قد) شیر سنگھ کملا (بیوقوف) کرم سنگھ نرملا (بے عیب) اور اسی طرح کے سینکڑوں نام جن سے سکھوں کی تاریخ بھری پڑی ہے اور جو آج تک خاندانی نام کی حیثیت سے باعث افتخار متصور کئے جاتے ہیں۔

مہاراجہ

کوئی سیاح پنجاب میں جا کر مہاراجہ کی شکل و شمائل اور خصوصیات سے ناواقف نہیں رہ سکتا۔ اگرچہ اس کی وفات کو نصف صدی کی مدت گزر چکی ہے پھر بھی صوبے بھر میں اس کا نام گھر گھر زبان زد ہے اور بڑے بڑے محلوں سے لے کر جھونپڑیوں تک میں اس کی تصویریں لٹکائی جاتی ہیں۔ امرتسر و دہلی کے نقاش ہاتھی دانت پر اس کی تصویر بنایا کرتے ہیں۔ ان تصاویر میں وہ ادھیڑ یا سن رسیدہ دکھایا جاتا ہے۔ اس کے شباب یا جوانی کی تصویر بہت کم دیکھنے میں آتی ہے۔ ابتداء لاہور کے دربار میں نقاشی اور دوسری عمدہ صناعیوں کی کچھ ایسی قدر نہ تھی۔ بڑھاپے میں رنجیت سنگھ کی تصویر کچھ خوش نما نہ تھی لیکن اس کی صورت میں ایک ایسی بات تھی جسے کوئی بھول نہیں سکتا تھا۔ سخت محنت اکثر معرکہ جنگ کے ہنگاموں میں جان جوکھوں کے موقعوں پر موجود رہنے۔ شراب خواری و عیاشی نے اسے قبل از وقت بڈھا کر دیا تھا اور پچاس سال کی عمر میں وہ بوڑھا اور ضعیف' بے کار اور مضمحل ہو گیا تھا۔

اسی زمانے کے بہت سے لوگوں نے اس کا حلیہ بیان کیا ہے اور من جملہ بیرن ہیوگل کا بیان بھی جو یہاں لکھا جاتا ہے صحیح اور ہو بہو ہے:

وہ کوتاہ قد اور کم رو تھا اور اگر وہ اپنی اعلیٰ ذہانت و قابلیت سے ممتاز نہ ہو گیا ہوتا تو کوئی نظر اٹھا کر بھی اس کی طرف نہ دیکھتا۔ میں بلا مبالغہ کہہ سکتا ہوں کہ پنجاب میں میں نے اس سے زیادہ کوئی بدصورت اور کم رو شخص نہیں دیکھا۔ اس کی بائیں آنکھ سے جو بالکل بند ہے اس کی دہنی آنکھ نے اس کی صورت زیادہ بگاڑ دی ہے جو ہمیشہ غلہ سی کھلی اور پھرتی رہتی ہے اور

بیماری کی وجہ اور بھی بھیانک اور ٹیڑھی ہو گئی ہے۔ اس کے چہرے پر چیچک کے داغ ایک دوسرے سے ملے ہوئے نہیں ہیں بلکہ ہر داغ ایک علیحدہ گڑھے کی صورت میں اس کے سانولے رخسار پر نمودار ہے۔ اس کی چھوٹی سیدھی ناک آگے سے موٹی ہے۔ اس کے پتلے پتلے ہونٹ دانتوں سے ملے ہوئے ہیں۔ مگر دانت اب تک اچھے ہیں۔ اس کی کڑبڑی ڈاڑھی کلوں پر اور مونچھ گھنی ٹھوڑی کے نیچے دونوں گندھی ہوئی ہیں۔ اس کا سر جو چوڑے شانوں میں سے بالکل دھنسا ہوا ہے اس کے قد کی مناسبت سے بڑا ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ اس کو بہ آسانی جنبش نہیں کر سکتا۔ اس کی گردن موٹی اور پر گوشت ہے۔ اس کے بازو اور ٹانگیں دبلی ہیں۔ بایاں ہاتھ اور پاؤں دونوں جھولا مارے ہوئے ہیں ہاتھ چھوٹے اور مضبوط ہیں بعض اوقات وہ آدھ آدھ گھنٹے تک کسی اجنبی کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لئے رہتا اور اس کے دلی اعصابی ہیجان کا اظہار اس کی انگلیوں پر علی الاتصال دباؤ پڑنے سے اسی شخص پر ہوتا رہتا ہے۔ اس کا لباس اس کی بدصورتی کو بڑھا دیتا ہے۔ موسم سرما میں سر کی پگڑی سے لے کر پاؤں کے موزے اور زیر پائی تک وہ زرد رنگ کا لباس پہنتا ہے۔ جب وہ معمولی انگریزی وضع کی کرسی پر پالتی مار کے بیٹھتا ہے تو یہ نشست اس کے لئے اور بھی ناموزوں ہوتی ہے لیکن جب وہ گھوڑے پر بیٹھ کر اور سیاہ ڈھال پشت پر ڈال کر سوار ہوتا ہے تو اس کی شکوہ تمام نمایاں ہوتی ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ اس کی روح نے قالب کو زندہ کر دیا ہے۔ اس وقت ایک خاص شان نکلتی ہے جس کا وہم بھی نہ تھا کہ وہ ایسا ہے۔ باوجودیکہ اس کا ایک پہلو مفلوج ہو چکا ہے مگر پھر بھی وہ گھوڑے کو نہایت آسانی سے قابو میں رکھتا

ہے۔

یہ دل میں کھب جانے والی شبیہ کچھ ایسی دل آویز نہیں ہے۔ 1834ء میں رنجیت سنگھ پر فالج گرا۔ لیکن اس واقعے کے قبل اگرچہ وہ کوتاہ قد تھا اور اس کا چہرہ اس منحوس بیماری (چیچک) کی وجہ سے بد رونق ہو گیا تھا جو بسااوقات پنجاب کو خالی کر جاتی تھی اور اب بھی باوجودیکہ ٹیکہ لگائے جانے کے لوگ اس کا شکار ہوتے ہیں۔ وہ سپاہ گری میں فرد کامل' مضبوط' اکہرے بدن کا چست و چالاک' بہادر اور جفاکش شخص تھا۔ وہ بڑا شہسوار تھا اور دن بھر گھوڑے کی پیٹھ پر رہنے کے بعد بھی کبھی تھکن کے آثار اس کے چہرے سے نمایاں نہ ہوتے تھے۔ گھوڑے کا اس کو اس قدر شوق تھا کہ یہ شوق عشق کی حد تک پہنچ گیا تھا۔ اس کا اصطبل نہایت وسیع تھا جس میں ہندوستانی عربی اور ایرانی نسل کے جانور جمع تھے اور جو اس کے خاصے کے تھے۔ وہ بڑا شوقین شکاری تھا اور شمشیر زنی کے فن میں استاد تھا۔

1831ء میں اس نے روپڑ کے مقام پر اپنے اور سکنر کے سواروں کا میخ اکھاڑنے اور تلوار لگانے کے کرتبوں میں مقابلہ کیا اور کامیاب رہا۔ اس کا لباس بالکل سادہ ہوتا تھا۔ موسم سرما اور موسم بہار میں وہ عموماً زعفرانی رنگ کی کشمیر کی جامہ دار پہنا کرتا تھا اور گرمیوں میں سفید ململ کا لباس۔ وہ کسی قسم کے زیور و جواہر استعمال نہ کرتا تھا بجز خاص تقریب یا دربار کے موقعوں کے۔ اس قسم کی سادگی اکثر ایسے دیسی والیان ملک و مدبران سلطنت میں پائی جاتی ہے جو دماغی قابلیت میں ممتاز ہیں۔ یورپین اشخاص کی طرح وہ بھی وحشیوں اور عورتوں کے مانند بناؤ سنگھار کرنے کو ناپسند کرتے ہیں اندور کے مہاراجہ تکاجی راؤ ھلکر' راجہ سرڈنکر راؤ اور ریاست نظام کے وزیراعظم سرسالار جنگ عادتاً" اپنے معمولی ملازمین کی طرح سادہ لباس پہنتے تھے۔ لیکن رنجیت سنگھ کو زیور اور جواہر کے استعمال کی ضرورت اپنے امتیاز ظاہر کرنے کے لئے نہ تھی۔ یہ امر تعجب خیز ہے کہ باوجود کمزوری اندھے پن اور مفلوج ہونے کے اپنے ذی شان مہیب اور سرکش امرائے دربار پر اسے پوری پوری فوقیت حاصل تھی۔ فقیر عزیزالدین سے جو 1831ء میں لارڈ ولیم بنٹنک کے پاس شملے سے سفیر بنا کر بھیجا گیا تھا ایک انگریز

عہدہ دار نے دریافت کیا کہ مہاراجہ کس آنکھ سے کانا ہے۔ فقیر کے جواب سے اس کے دربار کی عظمت و شان اور درباریوں کے دل میں اس کی توقیر کا اندازہ ہو سکتا ہے۔ اس نے جواب دیا کہ "مہاراجہ کے چہرے پر ایسا رعب و دبدبہ ہے کہ میں نے کبھی نظر بھر کے اس کے چہرے کو نہیں دیکھا کہ معلوم کر سکوں کہ وہ کس آنکھ سے اندھا ہے۔"

مہاراجہ میں بعض نہایت نمایاں اور مخصوص عظمت کے نشان وہبی طور پر پائے جاتے تھے اور عام اخلاقی اصول و مستحسن طریق زندگی کے لحاظ سے اخلاق سے عاری تھا۔ اس کی فطرت میں درحقیقت وہ کمزوریاں اور عیب حد درجے کے موجود تھے جن کا نشوونما انسان کے دل و دماغ میں اسی طرح ہوتا ہے جس طرح خود رو گھاس پھوس۔ اس کی اخلاقی زندگی بادی النظر میں بھی اس کی ظاہری جسمانی ہستی کی طرح حقیر اور کریہہ تھی وہ خودغرض' جھوٹا اور حریص تھا۔ وہ توہمات میں شدت سے مبتلا تھا اور علانیہ بے شرمی کے ساتھ شراب خواری و عیاشی کرتا تھا۔ اوصاف حمیدہ میں اسے کوئی حصہ نہیں ملا تھا لیکن باوجود اس کمی کے وہ بڑا شخص تھا۔ اس میں دوسرے بڑے حکمرانوں کی طرح جیسے قیصر' سکندر اعظم سے لے کے نپولین بوناپارٹ تک دماغی قابلیت کے ساتھ اخلاقی خوبی کی آمیزش نہ تھی۔ وہ اس وجہ سے بڑا تھا کہ اس میں غیر معمولی طور پر وہ اوصاف پائے جاتے تھے جن کے بغیر اعلیٰ درجے کی کامیابی حاصل ہونا ناممکن ہے۔ ان اخلاقی خوبیوں کے نہ ہونے سے جو عامہ خلائق میں پائی جاتی ہیں اس کے ممیز خصائل میں نہ تو کوئی خلل واقع ہوا نہ کچھ کمی۔ وہ پیدائشی فرماں روا تھا اور اس میں حکومت کرنے کا مادہ قدرت نے ودیعت رکھا تھا۔ لوگ بے چون و چرا اس کی اطاعت کرتے تھے کیونکہ اس سے سرکشی کرنے کا کسی کو مقدور نہ تھا جو داب اس نے اپنے مرنے وقت تک امرا پجاری اور سکھوں کی عام جماعت پر قائم رکھا تھا اس سے اس کی عظمت کا اندازہ ہو سکتا ہے۔

انتہائی جرات و بہادری کے ساتھ اس میں استقلال اس بلا کا تھا کہ کسی مزاحمت سے اس کے قدم کو لغزش نہ ہو سکتی تھی اور اسے مہمات میں ناکامیابی اس وجہ سے

کبھی نہ ہوتی تھی کہ ناکامی کے امکان کا بھی اس کے دل میں کبھی خیال تک نہ آیا تھا۔
اس کی سیاسی دانشمندی بہت بڑھی ہوئی تھی اور اس کا بین ثبوت اس سے زیادہ کسی امر
سے نہیں ہو سکتا کہ جب اس نے دیکھا کہ انگریزوں کی دوستی سے ہر طرح کا امن اور
دشمنی سے بہت خوف تو وہ ان کی دوستی پر امادہ ہو گیا۔ باوجود قوی ترغیبوں کے اور
باوصف انگریزوں کی نہایت درشتی سے مزاحمت کرنے کے جس سے اس کی ستلج اس پار
کے ممالک کو فتح کرنے کی دلی تمنا بر نہ آئی تاہم اپنے دوران حکومت میں انگریزوں کے
ساتھ اس نے رابطہ اتحاد مستحکم اور مضبوط رکھا اور اس کی اس قدیم دوستی کا اثر اس
کے مرنے پر بھی ایسا مضبوط رہا کہ مہاراجہ شیر سنگھ سا کمزور شرابی راجہ بھی پنجاب میں
شورش برپا ہونے اور افغانستان میں انگریزی فوج کی بربادی کے نازک وقت میں وفادار
رہا۔ اس میں اور وصف ایسا تھا جو اکثر طباع اشخاص کے خصوصیات میں شمار ہوتا ہے اور
جس کے نہ ہونے سے بہت سے ذکی الطبع اشخاص ناکام رہتے ہیں یعنی ماتحتوں کے عمدہ
انتخاب کا ملکہ۔ وہ لوگوں سے واقف تھا اور ہر ملازم کو اس کے حسب حال خدمت کے
لئے منتخب کرتا تھا اور اسی وجہ سے ناقص و پر آشوب زمانے میں بھی حیرت انگیز طریقے
پر اس کی تمام خدمتیں انجام دی جاتی تھیں اس کے طبعی حرص و طمع کا بدل حسن
خدمات کے اعتراف و صلہ دینے میں فیاضی سے ہوتا تھا اور جو کچھ لوٹ مار کر وہ لوگوں
سے وصول کرتا تھا اسے نہایت فیاضی سے پھر لوگوں کو بانٹ دیتا تھا۔ اس کے مقبول و
منظور اشخاص کو بڑی بڑی جاگیریں یا محاصل کی مقدار وافر دی جاتی تھی اور اس کی
ضرورت زیادہ تر اس وجہ سے تھی کہ ان لوگوں کو اس آمدنی کا حصہ کثیر فوج کی آراستگی
میں صرف کرنا پڑتا تھا کہ سردار کے طلب کرنے پر فوراً" وہ ضرورت مہیا ہو سکے۔
رنجیت سنگھ کے پاس جو کچھ تھا وہ دوسروں سے چھینا جھپٹا ہوا تھا۔ فیاضی اور حرص میں
قریبی رشتہ ہے جیسا کہ مانٹی کارلو یا قمار خانوں میں روزمرہ نظر آتا رہتا ہے۔

اگرچہ رنجیت سنگھ کے عیوب اور نقائص کا خفایا پردہ پوشی تاریخی سچائی کے منافی
ہے تاہم خود اس کے یا ان معایب و نقائص کے متعلق اس وقت کی معاشرت پر غور
کئے بغیر کوئی رائے قائم کرنا نادرست ہے۔ ہر زمانہ و ہر قوم میں نیکی کا ایک خاص معیار

ہوا کرتا ہے۔ ممکن ہے کہ جو بات آج کل معیوب و ناشائستہ تصور کی جاتی ہے وہ آگے چل کر سو سال بعد عام طور پر پسندیدہ خیال کی جانے لگے۔ تہذیب و شائستگی کے زمانے میں بھی عیوب کی حالت غیر مہذب زمانے سے کم نہیں ہوتی۔ تہذیب کی حالت میں صورت حال یہ ہوتی ہے کہ جب مکاری کی ضرورت پڑتی ہے تو بڑی عیاری سے ان عیبوں کی پردہ پوشی کی جاتی ہے اور اس طور پر نیکی بدی سے گویا ایک قسم کا خراج تحسین حاصل کرتی ہے۔ شاہان جارج کے زمانے میں ہمارے آباؤ اجداد بھی اسی طرح اعلانیہ اور کثرت سے شراب خواری کرتے تھے جس طرح لاہور کے دربار کے سردار۔ "امراء کی طرح مے نوشی" ضرب المثل ہو گیا تھا جس سے اٹھارہویں صدی کے انگریز امراء کی اخلاقی حالت و عادات کا پورا پورا اظہار ہوتا تھا۔ اب یہ رنگ بدل گیا اور لوگ بہت کم یا چھپ کر شراب پیتے ہیں۔ عورت و مرد کے تعلقات کے لحاظ سے پنجاب کی اخلاقی حالت حد درجے پست تھی لیکن سکھ یہ عذر پیش کر سکتے تھے کہ ان کے یہاں عورتوں کی حالت قدرتی طور پر بہت گری ہوئی تھی اور مغربی ممالک کی طرح تعلیم اور دوسرے اثروں سے ان کی وقعت اور عظمت لوگوں کے دلوں میں جاگزیں نہ ہوئی تھی اور ایسی حالت میں عورت یا مرد سے عفت و عصمت کے بارے میں اعلیٰ خیالات کی توقع نہیں کی جا سکتی تھی۔ لیکن اگر ہم عصر تحریرات کافی شہادت متصور کی جا سکتی ہیں تو پیرس کی آج کل کی تمدنی حالت بھی ویسی ہی خراب ہے جیسی 1830ء میں پنجاب کی تھی اور لاہور کے بازار جہاں رنجیت سنگھ ہولی کا تہوار منایا کرتا تھا پکاڈلی کے شب کے نظاروں سے زیادہ شرمناک نہ تھے جو 1892ء میں نظر آتے تھے۔

یہی حال رنجیت سنگھ کے سیاسی طریقوں کا ہے۔ سکھ سردار میں ظلم و ستم مکر و فریب گویا ان کی سرشت میں داخل تھے۔ یہ اوصاف ان لوگوں کے پشت و پناہ و قوت زور تھے۔ جو ایک بداخلاق اور اسی سوسائٹی میں جس کا اجتماعی شیرازہ بکھرا ہوا تھا ہر وقت حملوں کی مدافعت اور اپنی جان و مال کی حفاظت کرنے پر مجبور تھے۔ اگر شیر کو اس کے ناخن و دنداں کے استعمال پر نامناسب سمجھا جا سکتا ہے تو مہاراجہ اور اس کے دربار کے سرداروں کی فوجی اور سیاسی تاریخ کے عنصر غالب مکر و فریب کو ان کے روزمرہ کی

زندگی اور تعلقات کے لحاظ سے غیر معمولی و نلواجبی قرار دیا جا سکتا ہے۔ آج بھی افغانستان کا حاکم اپنے نظم و نسق کی بنا انہی اصولوں پر قائم کرتا ہے جو رنجیت سنگھ کے تھے۔ تاہم سلطنت انگریزی جس کا وہ ماتحت اور فوج کی فراہمی کے لئے متعہد ہے اس بارے میں اعتراض نہیں کرتی کیونکہ وہ جانتی ہے کہ وحشی اقوام کے ساتھ سخت گیری کی ضرورت ہے اور یہ کہ اگر اور جماعت پر عقل اور قوانین کے ذریعے سے حکومت کی جا سکتی ہے تو دوسری قوم میں امن و امان کے قائم رکھنے کے لئے صرف پھانسی اور جلاد ہی کار آمد ثابت ہوتے ہیں۔ مہاراجہ رنجیت سنگھ کے اطوار و خصائل کے بارے میں تصفیہ کرتے وقت ان امور پر خوب غور کر لینا چاہئے اور اس کو ان کا پورا فائدہ دینا چاہئے۔

اگر ہم اپنے دلوں سے تعصبات اور ظاہر داری کی نیکی کے خیال کو دور کر کے صرف ان نادر اوصاف کو مد نظر رکھیں جن سے ایک شخص اپنے ہمعصروں میں ممتاز خیال کیا جا سکتا ہے تو ہم رنجیت سنگھ کو انسانوں پر حکمرانی کی حیثیت سے ایک ہیرو قرار دے سکتے ہیں اور اس مقام اعلیٰ پر جلوس کا مستحق قرار دے سکتے ہیں جو تاریخ نے ان مخصوص افراد کی عزت افزائی کے لئے معین کی ہے جن کی عظمت کے متعلق کسی قسم کا شک و شبہ نہیں ہے۔ اگر ہم جنبے اور تعصب سے اپنے دل کو صاف کریں اور رسمی نیکیوں سے قطع نظر کر کے صرف ان شاذ و نادر خوبیوں پر نظر رکھیں جو ایک فرد انسان کو بنی نوع انسان پر فوقیت دیتی ہیں۔ اس صورت میں ہم فوراً قائل ہوں گے کہ باوصف اس کے کہ وہ اپنے عہد کی عام اور بدنما برائیوں سے کماحقہ' بہرہ یاب اور نقص تعلیم و تربیت سے متاثر تھا۔ اس نے ایسے ملک پر حکومت کی جس کو اس کی فوجی ذہانت اور عزم بالجزم نے فتح کیا اور اس قابلیت کی وجہ سے اس صدی کے مدبرین کی پہلی صف میں بٹھائے جانے کے قابل ہے۔

مہاراجہ کی خصلت کی بنا خودغرضی پر تھی۔ اس کے تمام ملازمین میں کوئی شخص ایسا نہ تھا جس کے متعلق یہ کہا جا سکے کہ مہاراجہ اس کا شکر گزار اور گرویدہ تھا۔ اگر اس کلیہ کا کوئی استثناء تھا تو وہ جمعدار خوشحال سنگھ تھا جس کی قابلیت ادنیٰ درجے کی اور

عادتیں بہت مذموم تھیں- بایں ہمہ اس کے ملازمین اس کی خدمات کو اس وفاداری سے بجا لاتے تھے جس کا وہ کسی طرح مستحق نہ تھا- کپور تھلہ کے سردار فتح سنگھ کے ساتھ اس نے نمائشی محبت کے اظہار کے لئے بھائی چارے کے طور پر پگڑی بدلی- یہ وہ شخص تھا جو 20 سال تک مہمات میں اس کا رفیق و شریک رہا تھا لیکن باوجود اس کے بھی اس کو اس کے مقبوضات سے بے دخل کرنے کی کوشش کی گئی- سردار ہری سنگھ نلوا جو اس کے سپہ سالاروں میں سب سے زیادہ جری اور تہور شعار تھا جب افغانوں کی جنگ میں اس کی خدمت کی انجام دہی میں مارا گیا مہاراجہ نے فوراً اس کی بڑی جائداد پر قبضہ کر لیا اور اس کے چاروں بیٹوں کو نسبتاً مفلوک الحال کر دیا- وہ موروثی دولت و عزت کو ناپسند کرتا تھا اور تارکوئنس سپر بس قیصر کی طرح سرافرازوں کی گردنیں ہمیشہ کاٹ دیا کرتا تھا- اوائل صدی میں سردار فتح سنگھ کلیان والا تمام سکھ سرداروں میں سے ایک بڑا اور قوی سردار تھا ایک موقعے پر وزیر آباد کے مقام پر رنجیت سنگھ نے اس سے کہا کہ اپنی فوج کو ایک طرف جمع کرو تاکہ وہ اس کی تعداد کا اندازہ کر سکے- مہاراجہ کو سخت ناگوار ہوا کہ موجودہ فوج میں سے تعداد کثیر فتح سنگھ کے جھنڈے کے نیچے ہے- یہ امر اس کی آتش رشک کے بھڑکانے کو کافی تھا- 1807ء میں مہاراجہ رنجیت سنگھ نے سردار فتح سنگھ کے ہمراہی فوج کی کمان بذات خود اپنے ہاتھ میں لی اور نرائن گڑھ کا محاصرہ کیا- پندرہ روز تک بے سود محاصرہ کرنے کے بعد مہاراجہ نے سردار کو سرزنش کی کہ اس نے اس مہم میں اتنی سرگرمی نہیں دکھائی جتنی کہ چاہئے تھی اور کہا کہ میرا ساتھ ساتھ رہنا بہتر تھا تاکہ فوج کی کمان قرار واقعی ہو- فتح سنگھ نے اس ناواجبی سرزنش سے غصے میں آکر فوراً قلعے کی فصیل پر جس میں ایک شگاف پڑ گیا تھا حملہ کر دیا- مگر یہ شگاف ناکارہ ثابت ہوا نتیجہ یہ ہوا کہ اس کو پسپا ہونا پڑا اور اسی حملے میں مارا گیا- مہاراجہ کو اس طور پر اپنے رقیب سے چھٹکارا نصیب ہوا اور اس نے اس کی تمام املاک فوراً کسی دوسرے سردار کو دے دی-

سکھ ریاستوں میں سے ایک رام گڑھیا مثل بہت طاقت ور تھی- جب رنجیت سنگھ نے اس کے قلع قمع کرنے کا مصمم ارادہ کر لیا تو اس کے پیشوا سردار جودھ سنگھ

کے ساتھ بناوٹ سے محبت اور دوستی کا اظہار شروع کیا۔ اس کے اور رام گڑھیا خاندان کے مابین رفاقت دوستی کا عہد و پیان امرتسر کے مندر میں سکھوں کی مذہبی کتاب کے روبرو ہوا اور اس نے عہد نامے پر شاہی ناخواندہ طریقے سے مہراپنی ہتھیلی زعفران کے رنگ میں ڈبو کے چھاپا لگایا۔ کچھ عرصے تک اس معاہدے کی پابندی کی گئی کیونکہ جودھ سنگھ اس کا رفیق تھا اور اس کی فوج اکثر مہمات میں کارآمد ثابت ہوئی تھی۔ لیکن 1816ء میں جب اس سردار کا انتقال ہو گیا تو مہاراجہ کو اپنا کام کرنے کا موقع ہاتھ لگا۔ ورثاء کو مداؤں میں وراثت کے تصفئے کے بہانے سے طلب کر کے ان کے ڈیرے محاصرہ کیا اور سب کو قید کر لیا۔ پھر ایک زبردست فوج امرتسر روانہ کی اور رام گڑھیا کی تمام جاگیروں پر قبضہ کر لیا۔

ایک دوسرے جودھ سنگھ کے ساتھ بھی جو ایک مشہور بہادر اور جنگجو شخص اور وزیر آباد کا سردار تھا اس نے اسی قسم کا برتاؤ کیا۔ مہاراجہ نے یہ سمجھ کر کہ وہ اس قدر طاقت ور ہے کہ اس پر حملہ کرنا مشکل ہے اسے دوستانہ ملاقات کے لئے لاہور میں مدعو کیا جودھ سنگھ رنجیت سنگھ کے منصوبے کو تاڑ گیا اور اس لئے وہ فوج کی ایک کثیر تعداد اپنے ہمراہ لیتا آیا۔ رنجیت سنگھ نے اس سے درخواست کی کہ وہ فوج کو واپس بھیج دے اور اس نے بھی غرور و نخوت کی وجہ سے اس فرمائش کی تعمیل کی۔ دوسرے دن وہ صرف پچیس ہمراہیوں کے ساتھ دربار میں حاضر ہوا اور اپنے ساتھیوں کو باہر چھوڑ کر خود اندر داخل ہوا۔ مہاراجہ نے بڑے تپاک سے اس کی آؤ بھگت کی لیکن تھوڑی ہی دیر بعد دفعتاً" کھڑے ہو کر اپنے آدمیوں کو اس کے گرفتار کرنے کا اشارہ کیا۔ جودھ سنگھ تلوار کھینچ کر کھڑا ہو گیا اور اس نے لوگوں کو مخاطب کر کے کہا کہ وہ جنگ کے لئے تیار ہو جائیں کیونکہ وہ کبھی زندہ گرفتار نہ ہو گا اور اس نے کبھی دشمن کے مقابلے میں پیٹھ نہیں دکھلائی۔ اس کی اس جرات و دلیری کا مہاراجہ کے دل پر ایسا اثر ہوا کہ اس نے بہ عزت و احترام اس کو بیش بہا تحفے تحائف دے کر رخصت کیا اور اس کی ریاست میں اور اضافہ کر دیا۔ یہاں تک تو رنجیت سنگھ اور جودھ سنگھ دونوں کا طرز عمل قابل تحسین رہا۔ لیکن تھوڑے ہی عرصے بعد جودھ سنگھ چھوٹے چھوٹے بچے

چھوڑ کے فوت ہو گیا تو مہاراجہ نے اس کی تمام املاک پر قبضہ کر لیا اور اگرچہ اس نے یہ وعدہ کیا تھا کہ بڑے لڑکے کے سن بلوغ کو پہنچنے پر وزیر آباد اس کو واپس دے دیا جائے گا لیکن اس وعدے کا ایفا کبھی نہ ہوا اور غالباً اس نے ایفا کرنے کی نیت سے وعدہ بھی نہیں کیا تھا۔

کسی سردار کے لئے اپنے تمول کا اظہار خطرے سے خالی نہ تھا۔ جب بٹالہ کے نوجوان سردار نے اپنی بہن کی شادی سردار شیر سنگھ سے کی تو دونوں خاندانوں نے اس تقریب میں دو لاکھ روپے صرف کئے ایسے جشن گجرانوالہ کے ضلع میں اس سے قبل کبھی دیکھنے میں نہ آئے تھے۔ رنجیت سنگھ نے جب اس واقعے کو سنا اور لڑکی کی ماں کے اس ڈینگ مارنے کا حال اسے معلوم ہوا کہ اس کے پاس دو پڑولے (15) روپے کے بھرے ہوئے ہیں تو اس نے فوراً اسے طلب کر کے کہا کہ جو خاندان شادیوں پر اتنا روپیہ صرف کر سکتا ہے اسے یقیناً پچاس ہزار روپیہ مجھے دینا کچھ گراں نہ گزرے گا۔

باوجود اس درجہ حریص اور طماع ہونے کے رنجیت سنگھ ظالم یا خونخوار نہ تھا۔ جب کسی قلعے پر قبضہ کر لیتا تو مفتوحین کے ساتھ لطف و ملائمت سے پیش آتا خواہ انہوں نے کتنی ہی شدت سے اس کا مقابلہ کیا ہو۔ اس کے دربار میں بہت سے سردار ایسے تھے جن کی ریاستیں اس نے چھین لی تھیں لیکن ان کو ان کی حسب حیثیت خدمت سپرد تھی اور یہ لوگ اپنی قسمت پر شاکر تھے یہی نتیجہ مشرقی جبریت کا ہے جس سے مغلوبیت کا صدمہ مٹ جاتا ہے۔ یہ سردار مختلف ریاستوں کے پیشوا و فرمانروا تھے جنہیں اس نے تباہ کر دیا تھا۔ وہ مساوات کے درجے سے گھٹا کر اس طرح بہ عزت و احترام ماتحت بنائے گئے تھے۔ ان کے علاوہ مسلمان خان و دوسرے شرفاء تھے جنہیں گوبند سنگھ سے نجات ملنا دشوار تھی جن کو گوبند ایک مختصر توبہ کی مہلت کے سوا کچھ نہ دیتا لیکن رنجیت سنگھ نے دانشمندی سے انہیں اپنا وابستہ دولت کر لیا تھا اور اس طور پر مغربی اضلاع میں اس کا اثر بہت کچھ بڑھ گیا تھا۔ مسلمانوں کے قبائل سیال، گھیبہ، ٹوانہ، کھرل اور ملتان کے نواب مظفر خاں کا خاندان ان لوگوں میں شامل تھے۔

رنجیت سنگھ نے جس طرح سے دنیا کا مشہور ہیرا کوہ نور حاصل کیا اور لیلیٰ نامی

گھوڑی جو پشاور کے افغان صوبہ دار کی ملک تھی اور اس زمانے میں کوہ نور سے کم اس کی شہرت نہ تھی جس طور پر اس کے قبضے میں آئی اس سے اس کی بدنیتی و ہٹ کا کافی ثبوت ملتا ہے اور بجائے اس کے ان واقعات کا ذکر خالص تاریخی باب میں کیا جائے اس باب میں اس کا تذکرہ زیادہ مناسب ہے۔

کوہ نور اس درجہ مشہور ہے کہ اس کے مزید حالت لکھنے کی ضرورت نہیں پائی جاتی۔ اس کے متعلق یہ خیال کیا جاتا ہے کہ وہ ہندوؤں کے وہمی اور خیالی بزرگ پانڈوں کے قبضے میں تھا۔ اس کے بعد سے سولھویں صدی تک اس کا کچھ پتہ نہ چلا۔ مگر اس وقت وہ پھر صفحہ تاریخ پر نمودار ہوا اور شاہ جہاں اور اورنگ زیب کے تخت و تاج کی زیب و زینت بنا۔ اس کے بعد مشہور قزاق بادشاہ نادر شاہ نے دہلی کے لوٹ میں اس پر قبضہ کیا۔ اس کے قتل ہونے کے بعد یہ بیش بہا جواہر احمد شاہ ابدالی کے ہاتھ آیا اور 1813ء میں جب رنجیت سنگھ کو اس کے حصول کا موقع ہاتھ لگا تو وہ شاہ شجاع معزول امیر کابل کے قبضے میں تھا جس کو اس کے بھائی نے ملک بدر کر دیا تھا اور وہ پنجاب میں جلاوطن ہو کر آیا تھا۔ رنجیت سنگھ نے کچھ تو سیاسی مصالح کے لحاظ سے یہ سمجھ کے کہ ممکن ہے اسے کوئی ایسا موقع ہاتھ لگ جائے کہ جس سے وہ افغان غاصب کے خلاف اسی سے کام لے سکے اور زیادہ تر اس غرض سے کہ مشہور ہیرا اس کے قبضے میں آ جائے شاہ شجاع کو لاہور میں پناہ دی۔ سکھ مورخین نے یہ بیان کیا ہے کہ شاہ شجاع کی بیوی شاہ بیگم نے رنجیت سنگھ کے پاس پیغام بھیجا کہ اگر وہ اس کے خاوند کی حفاظت کرے اور اس کے جانی دشمن پشاور کے صوبہ دار فتح خان کے حوالے اس کو نہ کرے تو وہ اسے کوہ نور ہیرا دے گی اور رنجیت سنگھ نے فوراً اس پیشکش کو قبول کیا اور اپنے معتمد فوجی افسر محکم چند کو روانہ کیا کہ معزول شدہ شاہ کو بہ عزت و احترام لاہور لے آئے۔

شاہ شجاع نے جو واقعات بیان کئے ہیں وہ اس سے بالکل مختلف ہیں۔ اس کا بیان ہے کہ کوہ نور کا اس وقت تک کوئی ذکر نہ آیا جب تک کہ رنجیت سنگھ نے اسے لاہور میں بلا کر اس حویلی میں نہ اتار لیا جو اس کے قیام کے لئے لاہور میں منتخب تجویز ہوئی

تھی۔ لاہور آنے اور قیام کرنے کے بعد ہیرے کا مطالبہ نہایت درشتی کے ساتھ کیا گیا۔ غریب شکست خوردہ بادشاہ نے ہیرے کے اپنے پاس موجود ہونے سے قطعی انکار کیا۔ رنجیت سنگھ نے دوبارہ پیغام بھیجا اور اس کے معاوضے میں بڑی جاگیر دینے کا وعدہ کیا۔ شاہ شجاع نے مکرر یہ کہلا بھیجا کہ وہ ایک صراف کے پاس امانت رکھوا دیا گیا ہے لیکن اس میں اور مہاراجہ میں دوستی کا تعہد اور کامل اطمینان ہو جائے گا تو اس وقت وہ اس کے حوالے کر دیا جائے گا۔ رنجیت سنگھ کو اس جواب سے سخت غصہ آیا اور مشرقی طریقہ مہمان داری کو فراموش کر کے اس نے افغان کی جائے سکونت پر پہرا بٹھا دیا اور ہر ایک شخص کی جو اس مکان سے باہر جائے تلاشی لینی شروع کی۔ کھانا بھی اس نے بند کر دیا۔ جعلی خطوط پیش کئے گئے جن کے متعلق یہ بیان کیا گیا کہ وہ راستے میں روکے گئے ہیں اور ان میں شاہ شجاع نے اپنے افغانستان کے احباب کو دعوت دی تھی کہ وہ ہندوستان پر حملہ کریں اور اس کو قید سے رہائی دلوائیں۔

شاہ شجاع کو گوبند گڑھ کے قلعے میں اسیر کرنے کی دھمکی دی گئی۔ آخرکار دو مہینے تک مدافعت کرنے کے بعد جب شاہ شجاع نے دیکھا کہ اسے لگاتار پریشان کیا جا رہا ہے اور اس کا خاندان و ملازمین بھوک سے تنگ آ گئے ہیں اور اگر انکار جاری رہا تو اسے قید یا موت نصیب ہو گی تو اس نے ہیرا دینے کا اقرار اس شرط پر کیا کہ مہاراجہ قسم کھا کر اس کی حفاظت و دوستی کا وعدہ کرے۔ اس کے لئے مہاراجہ ہر وقت تیار تھا۔ چنانچہ معاہدہ مرتب کیا گیا جن میں ادی گرنتھ اور دسویں گرو کے گرنتھ کی قسم کھا کر اس نے یہ وعدہ کیا کہ وہ ہمیشہ شاہ شجاع کا دوست رہے گا اور اس کو کابل کا تخت دلانے کی پھر کوشش کرے گا۔ اس کے بعد شاہ شجاع نے رنجیت سنگھ کو بذات خود آ کر ہیرا لے جانے کے لئے مدعو کیا۔ مہاراجہ صرف چند ہمراہیوں کے ساتھ گیا۔ گھنٹے بھر تک سکوت کا عالم رہا۔ اس کے بعد مہاراجہ نے اپنے نئے دوست و قیدی کو اپنے آنے کی وجہ سے مطلع کیا۔ شاہ شجاع نے ایک ملازم کو ہیرا لانے کا حکم دیا۔ ایک گٹھڑی سامنے لائی گئی اور جب وہ کھولی گئی اور مہاراجہ نے اس بات کا اچھی طرح اطمینان کرایا کہ وہ وہی ہیرا ہے جس کے حصول کی اسے اس درجہ تمنا تھی تو اس نے اسے نہایت بے تابی سے

اٹھا لیا اور بغیر رخصت ہوئے وہاں سے اٹھ کر چلا گیا۔ معاملہ صرف یہیں ختم نہیں ہوا۔ بلکہ کچھ عرصے کے بعد جب اسے یہ معلوم ہوا کہ ان نوواردوں کے پاس اب بھی نادرالوجود جواہرات ہیں تو اس نے بھائی رام سنگھ اور اپنی ایک بیوی کو بھیجا کہ تمام گھر یہاں تک کہ شاہ شجاع کے زنانے کی بھی تلاشی لے کر جس قدر جواہرات دستیاب ہوں ساتھ لے آئیں۔ اس حکم کی تعمیل کی گئی اور بیان کیا جاتا ہے کہ اس کی بیوی نے شاہ شجاع کی بیگمات اور اس کے خواصوں کی بھی جامہ تلاشی تک لی اور جو کچھ قیمتی سامان ملا وہ سب مہاراجہ کے پاس بھیج دیا گیا۔

1849ء تک کوہ نور لاہور میں رہا۔ پنجاب کے الحاق کے وقت بغرض اظہار اطاعت یہ ہیرا ملکہ معظمہ کے نذر کیا گیا اور حق یہ ہے کہ اس جنگ میں جس کے لڑنے کے لئے انگریزوں کو سکھوں نے مجبور کیا تھا فتح یابی کے خیال سے قطع نظر کر کے بھی یہ ہیرا شاہان مغلیہ کے جانشین ہونے کی حیثیت سے ملکہ وکٹوریہ کو ہی وراثتاً" پہنچتا تھا۔

لیلیٰ نامی گھوڑی کے واقعات مختصراً" بیان کئے جا سکتے ہیں۔ یہ گھوڑی اپنی خوبصورتی کی وجہ سے افغانستان و پنجاب میں مشہور تھی۔ 1826ء میں رنجیت سنگھ نے اس کے مالک سردار یار محمد خان صوبیدار پشاور کے پاس پیغام بھیجا کہ گھوڑی اس کے حوالے کر دی جائے۔ سردار یار محمد خان نے انکار کیا فوراً" سردار بدھ سنگھ سندھانوالیہ کو جو بہترین سکھ فوجی افسر تھا گھوڑی کو چھین لانے کے لئے روانہ کیا گیا اور اسی کے ساتھ اس کو خلیفہ سید احمد پر حملہ کرنے کا حکم دیا گیا جو پشاور کی پہاڑیوں میں سکھوں کے خلاف جہاد کا وعظ کر رہے تھے۔ سردار بدھ سنگھ نے دشمن کو شکست دی مگر جانبین کا سخت نقصان ہوا' اس کے بعد جب وہ پشاور پہنچا تو معلوم ہوا کہ لیلیٰ مر گئی ہے۔ اس کے لاہور واپس آنے پر معلوم ہوا کہ یہ افواہ غلط تھی ایک دوسری فوج پھر شہزادہ کھڑک سنگھ کے برائے نام سرکردگی میں پشاور روانہ کی گئی اور اسے حکم دیا گیا کہ یا تو گھوڑی دام دے کر خریدے یا زبردستی چھین لائے اور اگر یار محمد خان اسے ہر طرح دینے سے انکار کرے تو اسے پشاور کی صوبیداری سے معزول کر دیا جائے۔ کھڑک سنگھ نے پشاور کی طرف کوچ کیا۔ یار محمد نے جب یہ دیکھا کہ گھوڑی دینے سے اس کی آبرو پر حرف

آئے گا تو وہ پہاڑیوں میں بھاگ گیا۔ کھڑک سنگھ پشاور میں آٹھ مہینے تک قیام کرنے کے بعد واپس آگیا اور سردار سلطان محمد خان کو وہاں صوبیدار مقرر کر دیا۔ لیکن سکھوں کی فوج ابھی اٹک تک بھی نہ پہنچی ہو گی کہ یار محمد خان نے واپس آ کر نئے صوبیدار کو نکال باہر کیا۔ جنرل وینٹورا کو جس کے زیر کمان اٹک میں سکھوں کی فوج تھی مہاراجہ کی طرف سے حکم دیا گیا کہ گھوڑی کے حاصل کرنے کے متعلق کارروائی کر کے اپنی قسمت آزمائی کرے اس کے لئے جس قدر قیمت وہ مقرر کرے گا وہ منظور کی جائے گی اور اگر اس طور پر دینے میں انکار کیا جائے تو پھر لڑائی شروع کر دی جائے۔ یار محمد خان ابھی جواب دینے میں پس و پیش کر رہا تھا کہ خلیفہ سید احمد نے پہاڑ سے اتر کر پشاور کے شمالی دیہات میں لوٹ مار شروع کر دی۔ صوبیدار خلیفہ کے نکالنے کی کوشش میں مارا گیا لیکن مرنے سے پہلے اس نے لیلیٰ کو حوالہ نہ کیا تھا۔ جنرل وینٹورا خلیفہ سید احمد کو شکست دے کر پشاور کے روبرو لشکر لئے پڑا رہا اور سلطان محمد خان سے گھوڑی کا مطالبہ کرتا رہا۔ سلطان محمد خان سے وعدہ کیا گیا تھا کہ اگر وہ گھوڑی دے دے تو صوبیداری پر اسے مستقل کر دیا جائے گا۔ سلطان محمد بھی اپنے بھائی کی طرح لیت و لعل کرتا رہا اور اس وقت تک لیلیٰ حوالے نہ کی گئی جب تک کہ وینٹورا نے خود اس کے محل میں اسے گرفتار کر کے اس وقت تک مقید رکھنے کی دھمکی دی جب تک لیلیٰ حوالے نہ کی جائے۔ استقلال سے بالاخر کامیابی نصیب ہوئی جس کا وہ مستحق تھا اور جنرل وینٹورا کو وہ گھوڑی ہاتھ لگ گئی جس کے حصول کی بڑی تمنا تھی۔ گھوڑی لاہور پہنچائی گئی اور مہاراجہ نے اس کے ملنے کی بڑی خوشی کی۔

اب تک یہ امر مشکوک ہے کہ آیا اصل گھوڑی اس کو دی گئی یا نہیں۔ افغان ایسی ذات ہیں کہ بہت کم لوگ ایسے ہوں گے جنہیں وہ دھوکا نہ دیں یا نہ دے سکتے ہوں۔ 1831ء میں جب روپڑ میں مہاراجہ گورنر جنرل سے ملنے گیا تو ایک سبزہ گھوڑی اسے دکھائی گئی جو لیلیٰ بیان کی گئی۔ ہیوگل جب لاہور گیا تو اس نے خاص طور پر اس مشہور گھوڑی کے دیکھنے کی استدعا کی جس کے متعلق مہاراجہ کا بیان تھا کہ اسے حاصل کرنے کے لئے اس کو ساٹھ لاکھ روپیہ خرچ اور بارہ ہزار آدمی کا نقصان برداشت کرنا

پڑا۔ اس نے لیلیٰ کے حالات میں لکھا ہے کہ اس پر مغرق جھول پڑی ہوئی اور چاروں پیروں میں سونے کے کڑے تھے۔ وہ سبزہ رنگ تھی اور سیاہ دھبے اس کے جسم پر تھے۔ عمر میں تیرہ سال اور ناپ میں پوری سولہ ہاتھ تھی۔ وینٹورا نے ہیوگل کو یہ باور کرایا کہ اس گھوڑے کے لئے پشاور میں اس کو بہت کچھ مصیبتیں اٹھانا پڑی تھیں۔ اس کے برخلاف سکھ مورخین کا بیان ہے کہ وہ گھوڑی تھی جیسا کہ نام سے ظاہر ہوتا ہے۔ اس طرح اصلی لیلیٰ کی جنس بھی کہ وہ گھوڑی تھی یا گھوڑا تاریخی "چیستان" ہے۔ بہرحال ٹرائے کے مفتوح ہونے کے بعد سے آج تک کسی گھوڑے کی بدولت اس درجے پریشانی نہیں ہوئی اور اتنی بہادر جانیں تلف نہیں ہوئیں۔

مہاراجہ بے انتہا شرابی تھا اور اسی آتش سیال کے شوق اور اکثار نے آخر اس کی جان لی۔ جس طرح بہت سے ہندوستانی والیان ملک کی جانیں گئیں جہاں عام رائے ایسی قوی نہیں ہوتی کہ والئی ملک کو کثرت بے اعتدالی سے باز رکھ سکے۔

بعض اشخاص جو اپنے ہموطنوں (یعنی انگریزوں) کی تحقیر کے عادی ہیں اسی امر کے مدعی ہیں کہ مے نوشی کا عیب ہندوستان میں پردیسیوں کا پھیلایا ہوا ہے اور انگلستان کے ہندوستان کے فتح کرنے سے قبل ہندو پرہیز گار اور مے نوشی سے متنفر تھے پنجاب یا سکھوں کی یہ حالت نہ تھی یہ لوگ ہمیشہ سے بدمست تھے۔ باب ماسبق کے زمانے کو دیکھو جبکہ سکھ انگریزوں کے نام تک سے بالکل آشنا نہ تھے۔ 1781ء میں پٹیالے کا راجہ امر سنگھ کثرت مے نوشی سے فوت ہوا جیسا کہ اس سے قبل 1763ء میں اس کا باپ سردول سنگھ اور اس کا چھوٹا بھائی لال سنگھ اسی باعث سے ہلاک ہوئے تھے۔ بعینہٖ اسی طرح تقریباً ہر بڑے خاندان کے واقعات میں ایسی مثالیں ملیں گی۔ تلوار و جام دونوں مساوی طور پر خالصہ امرا کی تباہی کے باعث تھے۔

رنجیت سنگھ کی پسندیدہ شراب اناج کی تیز مقطر شراب تھی جس میں ماء اللحم، افیون، مشک اور بہت سی دوسری مختلف جڑی بوٹیوں کی آمیزش ہوتی تھی۔ اس قسم کی شراب وہ سرشام اور شب کو بہ کثرت پیتا تھا۔ اس کے اکثر درباری باستثنا فقیروں کے مسلمان خاندانوں کے اس کے خوش کرنے کو مے نوشی کے جلسوں میں شریک رہتے

تھے اور اس کے مثل ہمیشہ بدمست رہتے تھے۔ لیکن باوجود اس کثرت مے نوشی کے جو اس کے ملک و زمانے کے حسب حال تھی اور کوئی غیر معمولی امر تصور نہیں کی جا سکتی مہاراجہ اوقات معینہ پر کام کرنے کے لئے مستعد اور ہوش میں رہا کرتا تھا۔ غیر ملک کے لوگ جو اس کے دربار میں آتے اس کی ذہانت' شوق تجسس اور عام معلومات کو دیکھ کر دنگ رہ جاتے تھے۔ اسے دوسرے ممالک کے طریقوں اور نظم و نسق کے بارے میں گفتگو کرنے اور یورپ کی افواج و لڑائیوں کا حال سننے میں سب سے زیادہ لطف آتا تھا۔ اجنبیوں کے ساتھ اس کا برتاؤ خاص طور پر دل آویز و متواضع تھا۔ جو مسافر اس کے دور حکومت کے اواخر میں لاہور میں وارد ہوئے ان کے بیانات بہ کثرت مشہور ہیں ان سے اس امر کی تصدیق ہوتی ہے کہ وہ اپنے مقربین کو کس حد تک اپنا گرویدہ کر لیا کرتا تھا۔

اور اشخاص کی طرح جو تاریخ میں انتظامی قابلیت اور فوجی ذہانت کے لئے معروف اور ممتاز ہیں رنجیت سنگھ بھی عورتوں سے متاثر ہوتا تھا لیکن اس کا تجربہ ایسا نہ تھا جس سے پنجاب کی خواتین کے اطوار و اخلاق کے بارے میں کوئی اچھی رائے قائم ہو سکتی۔ اس کی دادی مائی دیساں کو اس کے باپ نے ایک برہمن کے ساتھ سازش کرنے کے جرم میں مار ڈالا تھا۔ خود رنجیت سنگھ نے اپنی ماں رانی راج کور کو جو مائی ملوائی کے نام سے مشہور تھی اسی قسم کے الزام پر قتل کیا تھا۔ خود اس کی بیویوں اور داشتاؤں کے واقعات ایسے بدنام ہیں کہ یہاں برسبیل تذکرہ بھی ان کا اعادہ کرنا نامناسب ہے۔ جب اس نے اپنے فرزند کھڑک سنگھ کے بہ حیثیت وارث جائز جانشین مقرر کئے جانے کا انتظام کر لیا تو اس نے زنانے کی ناشائستہ سازشوں کی طرف توجہ کرنا بالکل چھوڑ دیا۔ ان عورتوں نے اپنے بچوں کو کچھ تو سیاسی اغراض کی وجہ سے اور کچھ اس وجہ سے کہ اس طور پر اس کی نظر عنایت اپنی طرف مبذول کرائیں اس کی اولاد ہونا ظاہر کیا تھا۔ گو کہ اس زیرک مہاراجہ نے کبھی دھوکا نہیں کھایا۔ لیکن اس نے ان بچوں کو کسی قدر تمسخر کے طور سے عموماً اپنی اولاد تسلیم کیا اور وہ اکثر یہ پوچھا کرتا تھا کہ قسمت نے کیوں اس درجہ غیر معمولی فیاضی اس کے ساتھ کی ہے اپنے بیٹے کھڑک سنگھ اور

پوتے نونہال سنگھ کے پاس اس نے اپنے زنانے کی اکثر ایسی مستورات کو بھیجا جن کے اطوار مشتبہ تھے۔ ان ہی میں ایک خوب صورت ایسر کور تھی جو کھڑک سنگھ کے مرنے پر ستی ہونے کے لئے زبردستی مجبور کی گئی تھی۔

رنجیت سنگھ نے اٹھارہ عورتوں سے شادی کی۔ ان میں نو کے ساتھ تو مذہبی مراسم ادا کئے گئے تھے اور باقی نو کے ساتھ معمولی چادر ڈالنے کی رسم ادا کی گئی تھی جس کا ذکر اس سے قبل ہو چکا ہے۔ ان میں سے صرف چند کے حالات قابل ذکر ہیں۔ (16)

سب سے پہلی بیوی مہتاب کور تھی جس سے 1786ء میں بیاہ کیا گیا تھا۔ اسی شادی کی بدولت رنجیت سنگھ اس درجہ برسر اقتدار ہوا کیونکہ یہ ایک بااقتدار کنہیا امیر جے سنگھ کی پوتی اور اس کی وارث تھی۔ اس کی ماں بیوہ سدا کور نے جو درحقیقت ایک غیر معمولی عورت تھی اس امر کو سمجھ لیا تھا کہ اس کی لڑکی کا اثر قائم رہنے کے لئے یہ ضروری ہے کہ وہ اپنے خاوند کا وارث پیدا کرے اسی خیال سے اس نے مہاراجہ کی عدم موجودگی میں جب کہ وہ ایک مہم پر گیا ہوا تھا ایک لڑکے کو تلاش کر کے اسے اپنی لڑکی کی اولاد مشہور کیا۔ اس لڑکے کا نام ایسر سنگھ رکھا گیا۔ لیکن وہ صرف ڈیڑھ سال تک زندہ رہا۔ اب سدا کور نے توام کی کوشش کی۔ 1807ء میں جب مہاراجہ ستلج اس پار کے مہم پر گیا ہوا تھا اس نے مشہور کیا کہ مہتاب کور حاملہ ہے اور جب مہاراجہ واپس آیا تو اس کے سامنے مہتاب کور کے دو توام بچے پیش کئے گئے ان میں ایک تو جلاہے کا بیٹا تھا اور دوسرا مائی سدا کور کی ایک خواص کا۔ رنجیت سنگھ نے اول اول تو اس اولاد کے بارے میں ہر قسم کے اقرار سے بالکل انکار کیا لیکن دوسرے سال جب کہ وہ ستلج اس پار کے معاملے میں انگریزوں سے تقریباً برسرپیکار تھا اس نے یہ مناسب سمجھا کہ اپنی زبردست ساس کی دلجوئی کرے جس کی پشتی پر رام گڑھیا کے امراء تھے۔

اس نے ان توام لڑکوں کو اپنی اولاد تسلیم کر کے انہیں شاہزادوں کا مرتبہ دیا۔ ان میں سے ایک تارا سنگھ فاترالعقل تھا۔ دوسرا شیر سنگھ بڑا سجیلا خوش رو بہادر جوان تھا۔ لیکن ساتھ ہی اول درجے کا بیوقوف بھی تھا۔ نونہال سنگھ کے بعد وہ تخت پر بیٹھا لیکن 1843ء میں سندھانوالیہ سرداروں نے اسے قتل کر دیا۔

مہاراجہ کی دوسری بیوی راج کور تھی جو نکائی سردار رام سنگھ کی بیٹی تھی۔ 1798ء میں اس کا بیاہ مہاراجہ سے ہوا اور چار سال بعد اس کے بطن سے کھڑک سنگھ پیدا ہوا۔ یہی صرف ایک جائز یا ناجائز اولاد تھی۔ جو بیوی یا خواص کے بطن سے رنجیت سنگھ کے یہاں تولد ہوئی۔ کھڑک سنگھ بلا کسی مزاحمت کے اپنے باپ کے مرنے پر گدی نشین ہوا۔ یہ بہت کم عقل شخص تھا اور اپنے جاہ طلب فرزند نونہال سنگھ اور جموں کے سازشی راجاؤں کے ہاتھ میں کٹھ پتلی بنا ہوا تھا جنہوں نے اس سے پورے طور پر کام نکالنے کے بعد اسے زہر دے کر مار ڈالا۔ نونہال سنگھ اپنے باپ کے کریا کرم سے فارغ ہو کر واپس ہی آ رہا تھا کہ اس کا بھی کام تمام کر دیا گیا۔

دوسری بیبیاں کچھ زیادہ قابل لحاظ نہیں ہیں۔ ان میں سے ایک عورت جس نے 1833ء میں مہاراجہ نے مذہبی مراسم انجام دے کر بڑے دھوم دھام سے شادی کی گل بیگم نام امرتسر کی کسبی تھی۔ مہاراجہ ابھی کم عمر ہی تھا کہ 1806ء میں ایک دوسری کسبی موراں نے اسے اپنا گرویدہ کر لیا تھا۔ اور رنجیت سنگھ بدمستی کے عالم میں ہولی کے تہوار میں موراں کو ہاتھی پر اپنے پہلو میں بٹھا کر گشت لگاتا اور اپنے اس فعل پر کسی طرح نہ شرماتا تھا۔ اس عورت نے فیروز پور کی ملکیت کی سند حاصل کی اور اس کے مطیع کرنے کے لئے فوج روانہ کی لیکن کوئی کامیابی نہ ہوئی۔ اہل ہند عام طور پر ایسٹ انڈیا کمپنی کو عورت سمجھے ہوئے تھے۔ اس کی تضحیک میں اس عورت کے نام و تصویر کا سکہ ڈھالا گیا۔

دوسری عورت جو مہاراجہ کے انتقال کے بعد مشہور بلکہ دراصل بدنام ہوئی وہ جنداں مہاراجہ دلیپ سنگھ کی ماں تھی۔ وہ منا سنگھ نامی ایک لشکری کی بیٹی تھی اس کا باپ محل میں مامور تھا۔ یہ عورت رقص و نقالی کی وجہ سے مہاراجہ کی منظور نظر ہوئی جسے اس نے اپنے محل میں داخل کر لیا۔ یہاں اس نے اعلانیہ اس قسم کی بدفعلیاں کیں کہ لاہور کا دربار بھی باوجود اس درجے آزاد اور بداخلاق ہونے کے تعجب کرتا تھا۔ ایک ادنیٰ ملازم گلو نامی ماشکی عام طور پر دلیپ سنگھ کا باپ مانا جاتا تھا۔ بہرحال رنجیت سنگھ اس کا باپ نہ تھا کیونکہ وہ اس لڑکے کی پیدائش سے کئی سال پیشتر مفلوج

ہو چکا تھا۔ علاوہ بریں اس نے جنداں سے باضابطہ یا بے ضابطہ کبھی بیاہ بھی نہیں کیا تھا۔ بہتوں کا تو خیال یہ ہے کہ دلیپ سنگھ جنداں کے بطن سے پیدا ہی نہیں ہوا بلکہ جموں کے راجاؤں گلاب سنگھ اور دھیان سنگھ کی کامیابی کے خیال سے وہ محل میں لایا گیا تھا۔ کیونکہ یہ لوگ چاہتے تھے کہ مہاراجہ کے تمام ورثا حقیقی یا غیر حقیقی کے برباد ہو جانے کے بعد کوئی ایسا لڑکا پیش کیا جا سکے جو اس کا جانشین بن جائے اور یہ تو یقینی ہے کہ جنداں اور اس لڑکے کو ایک عرصے تک جموں میں پناہ دی گئی اور عین اس وقت پر ان کو پیش کیا گیا۔ بہرحال جو کچھ ہو شیر سنگھ کے مرنے پر جو جو فتنہ مچا اس سے دیگ کا ابال اوپر آ گیا تھا جنداں نے مع اپنے آخری عاشق راجہ لال سنگھ کے اس فتنے میں نمایاں اور شرم ناک حصہ لیا اور بالاخر اس کی اور اس کے اس نالائق عاشق کی بدمستیاں ہی تھیں جنھوں نے ستلج کی جنگ کرائی اور انجام کار سکھوں کی سلطنت کی بربادی کا باعث ہوئیں انگریز لڑائی کے بعد جب لاہور پہنچے تو دلیپ سنگھ جس کی عمر نو سال کی تھی برائے نام مہاراجہ تھا۔ چونکہ حالات موجودہ کو برقرار رکھنا مناسب تھا اور ملک کے لئے کسی برائے نام حکمران کی ضرورت تھی کیونکہ انگریزی سلطنت کو اس وقت تک پنجاب پر مستقل قبضہ رکھنا یا الحاق کرنا منظور نہ تھا اس لئے خادمہ اور آب بردار کے لڑکے کو شیر پنجاب کے تخت پر متمکن کیا گیا۔ تقدیر جس کا چرخ ہمیشہ گردش میں رہتا ہے اس انقلاب پر یقیناً خندہ زن ہو گی۔

رنجیت سنگھ کا دربار

مہاراجہ رنجیت سنگھ کی صرف مہمات کا خشک بیان ریاستوں کے الحاق اور رئیسوں کو مغلوب کرنے کے واقعات انگریزوں کو پڑھنے میں دلچسپ نہ معلوم ہوں گے کیونکہ انہیں اس امر کے معلوم کرنے کی ضرور خواہش ہو گی کہ مہاراجہ کس طور و طریق کا شخص تھا۔ اس کی حیرت ناک کامیابی کے اسباب کیا تھے اور اس کے دربار کے سردار اور امراء کا کیا رنگ ڈھنگ تھا۔ اس لئے اس باب میں اس کے خاص خاص درباریوں کا مرقع کھینچنے کی کوشش کی جائے گی۔ ان میں سے بعض کے حالات ان کے حین حیات یا ان اطلاعوں کی بنا پر اس سے قبل میں تحریر کر چکا ہوں جو ان کی اولاد و احباب سے دستیاب ہوئے۔ (17)

مہاراجہ نہایت زیرک تھا۔ وہ اپنے ماتحت عہدہ داروں کے حالات ماقبل دریافت کرنے کی تکلیف گوارا نہ کرتا تھا جب تک کوئی شخص کاروبار سلطنت یا فوجی مہمات بہ عمدگی انجام دیتا اس وقت تک وہ اس کا معتمد بنا رہتا اور اسے اس کا صلہ دیا جاتا تھا۔ جونہی وہ دیکھتا کہ اس نے خیانت کی یا وہ شخص جسے اس نے کسی خاص کام کے لئے انتخاب کیا تھا اس کام کے ناقابل یا نامناسب ہے تو وہ حقارت کے ساتھ اسے دور کر دیتا اور اس سے اس درجے بے تعلقی کرتا کہ ایسے مجرم کو سزا دینا اپنی کسر شان سمجھتا۔ 1818ء میں ملتان کی فتح کے بعد سلطنت مستحکم ہو گئی تھی اس کے بعد عام طور پر مہاراجہ کے عمل در آمد پر نظر کرنے سے حیرت ہوتی ہے کہ کیسے وفادارانہ طور پر اس کی خدمت انجام دی گئی اور اس کے کچھ ماتحت اس کے خلاف ہوئے۔ یہ سچ ہے بغاوت یا فریب سے کچھ فائدہ نہ تھا کیونکہ سلطنت کا ہر صیغہ خراب تھا عہدے دار جب، تک شاہی خزانے میں مناسب مقدار محاصل داخل کرتے رہتے اس وقت تک کاشت کاروں کے ساتھ جبر و تعدی کرنے کے متعلق کسی قسم کی باز پرس نہ کی جاتی

تھی۔ جبر و تعدی کی روک صرف لوگوں کی مزاحمت سے ہوتی تھی جس کا پنجاب ایسے گرم مزاج میں سیاسی پیمانے کی حد معینہ پر واقع ہونا یقینی تھا۔ ضلع جہلم کے جاٹ سکھ و مسلمان سرکاری دستبرد کو ایک معینہ و قدیم معمولی مقدار سے زیادہ برداشت نہیں کر سکتے۔ جب اس سے زیادہ دست درازی کی کوشش کی جاتی تو ان کے اور ان کے جرگوں کے ہاتھ فوراً تلوار کے قبضوں پر پڑ جاتے اور پھر بڑی دقتوں کا سامنا ہوتا۔

سکھ سرداروں کو جاگیریں بھی دی جاتی تھیں تاکہ وہ اس کی آمدنی سے فوج آراستہ رکھیں اور بوقت ضرورت مہیا کر سکیں۔ اس کے علاوہ یہ لوگ اپنے تابعین کی ایک مسلح رنگ برنگی جماعت ساتھ رکھتے اور اپنے ضلع میں شاہانہ تزک و احتشام سے اپنی حیثیت قائم رکھتے تھے۔ اکثروں کو انتظامی اغراض کے لئے ان کی جاگیروں کے علاوہ قطعات ملک تفویض کئے جاتے تھے گو اس نظم و نسق کا مقصد صرف یہ تھا کہ موجودہ سرکاری تحصیل وصول کی جائے۔ ایسی صورتوں میں عام کاروبار ساہوکاروں و گماشتوں کے حوالے ہوتا تھا جنہیں سکھ سردار اپنی ذمہ داریاں تفویض کر دیتے تھے۔ یہ لوگ اپنی دستوری بہ مقدار کثیر وصول کر لیتے تھے اور ان کے آقا کبھی دریافت بھی نہ کرتے تھے کہ کس قدر رقم وضع کی گئی جو حالت اس وقت پنجاب کی تھی وہی حالت اب بھی ہندوستان کی بعض جاگیری ریاستوں کی ہے مہاراجہ سندھیا آنجہانی نے بہت سی وسیع ریاستیں اپنے درباریوں کو دے رکھی تھیں ان لوگوں نے کبھی ان جاگیروں میں قدم تک نہیں رکھا اور صرف یہ انتظام تھا کہ گوالیار میں بالالتزام محاصل انہیں پہنچ جایا کرے۔ ان دور افتادہ جائیدادوں پر ہر طرح کا جور و تعدی اور بدعنوانی پھیلی ہوئی تھی تمام مالی اور عدالتی انتظام کسی لالچی برہمن یا بنئے کے ہاتھوں میں ہوتا تھا جس کی برائے نام تنخواہ ہوتی تھی اور جو آقا کے ساتھ تغلب' تصرف اور رعایا سے دست درازی کر کے متمول بنا ہوا تھا۔

مہاراجہ رنجیت سنگھ توہم پرست تھا لیکن دیندار نہ تھا۔ اسے زمانہ شباب کی آوارگی اور جوانی میں مہمات کی مصروفیت سے نہ تو اتنی فرصت ملی اور نہ اس کا میلان قلب اس جانب ہوا کہ گرو نانک کی لطیف دانش مندانہ تعلیم یا گرو گوبند کے پیچیدہ طریق زندگی کے احکام کو اخذ کر کے ان کی پابندی کرے وہ ابن الوقت تھا موقع محل

خوب دیکھتا تھا اسے صرف وہ ہی اصول پسند تھے جن سے وہ وحشی جاٹ رعایا پر اپنی حکومت کو استوار کر دے چنانچہ اس نے مناسب موقعوں پر بڑے بڑے عطیے سکھوں کے مندروں و پوجاریوں کو دیئے اور بعض اہم پیشوایان مذہب باباؤں اور بھائیوں کی اس کے دربار میں اچھی آؤ بھگت ہوئی۔ ان مذہبی بزرگوں کو جو زیادہ سے زیادہ سرسری طور سے تعلیم یافتہ تھے اور جو نانک کی صوفیانہ تعلیم سے اتنے ہی کم بہرہ ور تھے جیسے کہ آج کل کے سکھ پجاری' مذہب کی پابندی کا اسی وقت تک خیال رہتا تھا جب تک کہ عدم پابندی پر سکوت کرنے کے معاوضے میں انہیں معتدبہ رقم ملے سکے۔ سکھ مذہب کا اصل اصول اسلام کو برباد کرنا تھا۔ اس لئے مسلمانوں کو سلام کرنا ان سے میل جول رکھنا یا کسی شرط سے ان سے مصالحت کرنا ناجائز تھا لیکن مہاراجہ کے بہت سے معتمد وزراء اسی مذہب کے تھے جو مذہب سکھوں کے نزدیک قابل نفرت تھا۔ گرو گوبند سنگھ نے جسے ہندوؤں کے روحانی پیشواؤں یعنی برہمنوں نے ان کے اقتدار تسلیم نہ کرنے اور ذات پات کی قید اٹھا دینے کی وجہ سے مردود قرار دیا تھا۔ ان برہمنوں کی ماموری صریحاً ممنوع قرار دی تھی پھر بھی جمعدار خوشحال سنگھ' راجہ تیغ سنگھ' راجہ صاحب دیال' راجہ رلیا رام' دیوان اجودھیا پرشاد' پنڈت شنکر ناتھ اور بہت سے دوسرے ممتاز درباری برہمن تھے۔ مہاراجہ کی یہ بے تعصبی بے پروائی اور خودغرضی پر مبنی تھی۔ روشن خیالی کو اس میں بہت کم دخل تھا۔ یہ امر مشتبہ ہے کہ مذہبی بے تعصبی کسی ملک یا زمانے میں کوئی مستحکم بنیاد رکھتی ہے۔ تعصب سخت اور جوش افزا عقائد کی وجہ سے پیدا ہوتا ہے اور یہ مذہبی جنون اسی وقت جاتا ہے جب شک مذہب میں جگہ پا جاتا ہے اور مذہبی جوش کی آگ کے شعلے ذرا دب جاتے ہیں بہرحال اس کی اصلیت کچھ ہی کیوں نہ ہو مہاراجہ کی آزاد خیالی کا اثر اس کی سلطنت کے نظم و نسق پر بہت اچھا پڑا اور دوسری سکھ ریاستوں نے بھی فوراً اس کی تقلید کی۔ گرو گوبند سنگھ کو جو تعصب منظور تھا اور جو مسلمانوں کے تعصب کی طرح خوفناک تھا آج کہیں [illegible] نہیں چلتا۔ ستلج کے اس پار کی بڑی ریاستوں میں سے پٹیالے میں تین حکمرانوں کے زمانے میں وزیراعظم اور معتمد خارجیہ کی خدمات کو دو مسلمان شرفاء خلیفہ سید محمد حسن اور سید محمد حسین نے بڑی خوبی سے انجام دیا۔ ان کی قابلیت ایمانداری اور کمال کے لحاظ

سے کسی دیسی ریاست میں کوئی شخص ان پر فوقیت نہیں رکھتا۔ سکھوں کی ریاست ہائے کپور تھلہ' نابھہ اور جیند میں اسی مذہب کے عہدیدار معزز و ذمے دار خدمات پر مامور ہیں۔ برہمنوں کے بارے میں گوبند سنگھ نے جو قاعدہ مقرر کیا تھا اس کے متعلق احتمال یہ ہے کہ ایک مذہبی رائے سے بڑھ کر اس کی کوئی وقعت نہیں کی گئی کیونکہ ہندوؤں کی مذہبی حکومت نے ان لوگوں پر گہرا اثر ڈال رکھا تھا جو کبھی اس زمرے میں شامل تھے اور وہ اس طوق غلامی سے اپنی گردنوں کو بھی رہا نہ کر سکتے تھے۔ سکھوں میں دلیر سے دلیر بھی علانیہ طور پر برہمنوں کی بزرگی کے خیال کو پامال کرنے کی جرات نہ رکھتا تھا۔ بہرحال سکھ مذہب کے احکام مذہبی کچھ ہی کیوں نہ ہوں یہ ناممکن تھا کہ انتظام سلطنت کی پیچیدگیوں کو سلجھانے کے لئے مسلمانوں اور برہمنوں کو شریک نہ کیا جاتا کیونکہ یہی وہ لوگ تھے جن میں انتظام سلطنت کا موروثی مادہ موجود تھا۔

جمہوریت مساوات فہم کی خواہ کتنی ہی مدعی کیوں نہ ہو اور ذکی الطبع اشخاص کی کتنی ہی مدح سرائی کیوں نہ کرے لیکن یورپ و امریکہ کی جمہوریتوں کے طرز عمل نے اسی اصول کو غلط ثابت کر دیا۔ حکومت ایک فن ہے جس کی بلاشبہ غیر معمولی ذہانت کے اشخاص کو بھی بغیر خاص تعلیم کے بھی کماحقہ' مشق ہو سکتی ہے لیکن دوسرے کمالات کی طرح یہ بھی بڑی محنت و مشقت سے حاصل کی جاتی ہے اور موروثی مناسبت اور گروہ خاندان کی حکمرانی کی روایات اس کی کامیابی کے قوی اسباب ہوتے ہیں۔ اس طرح رنجیت سنگھ کے زمانے میں صرف برہمن و مسلمان ہی انتظام حکومت سے ایک قسم کی موروثی مناسبت رکھتے تھے۔ برہمن ہندوؤں کے موجودہ سیاسی نظام کے موجد ہیں اور گو انہوں نے جنگجو فرقوں کو بڑی دانشمندی سے بادشاہی شان اور اس کے ساتھ ہی خطرات بھی تفویض کر رکھے ہیں لیکن اصل اقتدار انہوں نے اپنے ہاتھ میں رکھا ہے۔ وہ بادشاہ کے روحانی پیشوا اور دنیاوی مشیر ہوتے ہیں۔ ان کے اقتدار کے روبرو بادشاہ کا اقتدار ماند پڑ جاتا ہے۔ وہ سلطنت کرتا ہے اور یہ حکومت۔ یہی حالت مسلمانوں کی ہے۔ سینکڑوں سال تک ان کے حملوں کا سلسلہ جاری رہا اور انہوں نے ملک کو فتح کر کے اس پر ایک فوجی سلطنت کی حیثیت سے حکمرانی کی۔ مگر اس پر بھی وہ ان ہندو راجاؤں کی طرح جو ان کے پیشرو تھے برہمنوں سے پورے طور پر چھٹکارا حاصل نہ کر

سکے۔ تاہم مسلمان بادشاہوں کے ملازم زیادہ تر ان کے ہم مذہب تھے جو یا تو حملہ آور فوج کے ساتھ آئے تھے یا اس کے سرداروں و عہدہ داروں کی اولاد تھے۔ اس کے علاوہ بہت سے ہندوؤں نے اسلام قبول کر لیا تھا اور اچھی خدمات پر مامور ہو گئے۔ یہ لوگ ہندوؤں کی جماعت میں نہایت ہوشیار تھے کیونکہ فاتح کا مذہب قبول کر لینا اس امر کا بین ثبوت ہے کہ وہ غیر معمولی طور پر دانشمند اور زیرک تھے۔

ان ذہین و تعلیم یافتہ اقوام کا غریب جاٹ کاشتکار بھلا کیا مقابلہ کر سکتے تھے جن کی سمجھ ان کی بھینس کی سمجھ سے ہرگز زیادہ نہ ہوتی تھی۔ دربار کی فضا میں سیاسی فتوحات اور ذہانت آزمائی سے انہیں کسی قسم کا تعلق نہ تھا۔ وہ اچھی چنائی کرنے اور لڑنے کے سوا اور کسی کام کے نہ تھے۔ برہمن اور مسلمانوں کی ذہانت کے مقابلے میں ان کی حالت بعینہ ویسی ہی تھی جیسے اصیل گھوڑے کے مقابلے میں کرایہ کا ٹٹو۔ مہاراجہ رنجیت سنگھ نے اس حقیقت کو اپنے ابتدائی زمانے میں محسوس کر لیا تھا۔ 1807ء میں سردار فتح سنگھ کلیان والا نے جس کا ذکر پہلے ہو چکا ہے بستر مرگ پر پڑے ہوئے اس بارے میں اور بھی زور دیا تھا۔ فتح سنگھ اس زخم کی وجہ سے ہلاک ہوا جو نارائن گڑھ کے محاصرے میں لگا تھا جہاں اسے ناکامیابی نصیب ہوئی تھی۔ اس سردار نے یہ مشورہ دیا تھا کہ کبھی کسی جاٹ سکھ کو دربار میں کوئی بااقتدار خدمت نہ دی جائے اور فوجی خدمات کی حد میں رکھا جائے۔ یہ روایت خواہ صحیح ہو یا غلط یہ یقینی ہے کہ مہاراجہ نے اس اصول کو مدنظر رکھا اور اس پر عمل کیا۔ فوج میں بہادر سے بہادر عہدہ دار جاٹ تھے لیکن مجلس شوریٰ میں برہمن، راجپوت اور مسلمان یا کھتریوں مثلاً دیوان ساون مل پر اعتماد کیا جاتا تھا۔ جاٹ سکھوں کی خصوصیات میں اب بھی کوئی اصلاح نہیں ہوئی باوجودیکہ انگریزی حکومت میں ان کی دو پشتیں گزر گئیں لیکن ان کی جو حالت اس وقت تھی وہی اب بھی ہے اور ان میں کسی قسم کی تبدیلی واقع نہیں ہوئی وہ اب بھی تعلیم سے گھبراتے ہیں۔ عقل کے ٹھوس اور اپنے عادات و خیالات میں ویسے ہی سادہ ہیں جیسے رنجیت سنگھ کے زمانے میں تھے جس نے انہیں کچھ عرصے کے لئے برائے نام ایک قوم بنا دیا تھا۔

اجنبی جو رنجیت سنگھ کے دربار میں جاتے تھے ان کو سب سے نمودار شخص فقیر

عزیزالدین وزیر خارجیہ نظر آتا تھا۔ یہ شخص اور اس کے دونوں بھائی نورالدین و امام الدین بخارا کے ایک معزز خاندان کے تھے اور اب تک اس ملک میں اس کی اولاد سکونت گزیں ہے۔ اس کا باپ غلام محی الدین ایک ہوشیار طبیب تھا۔ 1799ء میں لاہور کے افسر الاطبا نے جس کے پاس عزیزالدین زیر تعلیم تھا اسے رنجیت سنگھ کے خدمتیوں میں مامور کرا دیا۔ اس وقت لاہور پر قبضہ کرنے کے بعد ہی رنجیت سنگھ کو آشوب چشم کی شکایت پیدا ہو گئی اس نوجوان حکیم نے جس ہوشیاری و توجہ سے اس کا علاج کیا اس سے رنجیت سنگھ کے دل میں ان کی عزت بڑھ گئی۔ عزیزالدین کو بہت سے دیہات عطا کئے گئے اور وہ مہاراجہ کا خاص حکیم مقرر کیا گیا اور جس طرح رنجیت سنگھ کے ملک و دولت میں اضافہ ہوتا گیا اسی طرح عزیزالدین کی دولت اور جاگیروں میں بھی زیادتی ہوتی گئی۔ یہ اسی شخص کا دانشمندانہ اثر تھا کہ رنجیت سنگھ 1808ء میں انگریزوں کے خلاف اعلان جنگ کرنے سے باز رہا جب کہ انہوں نے سب سے اول اس کی قوت کو ستلج کے شمالی فتوحات تک محدود کر دیا تھا۔ مہاراجہ عزیزالدین کے اس دانشمندانہ مشورہ کا اس درجہ قائل ہوا کہ اس کے بعد کبھی کوئی اہم کام بغیر اس کے مشورے کے نہیں کیا۔ یورپین اور انگریزی حکومت کے متعلق ہر معاملے کا تصفیہ کرنے کے لئے عزیزالدین ہی کو مامور کیا جاتا تھا۔ اس شخص کی روشن خیالی اور آزادانہ مشورہ کی بدولت انگریزی حکومت کے اور مہاراجہ کے مابین رابطہ اتحاد آخر تک قائم رہا۔ فقیر عزیزالدین پر اس کو ایسا اعتماد تھا کہ مہاراجہ اکثر اپنی پوری فوج لے کر دور دراز مہمات پر چلا جاتا اور صرف چند آدمیوں کے ساتھ اسے لاہور کی حفاظت کے لئے چھوڑ جاتا۔ کبھی فقیر عزیزالدین فوجی خدمت پر بھی مامور کیا جاتا اور جب کبھی کسی خاص سفیر کے بھیجنے کی ضرورت ہوتی مثلاً 1831ء میں لارڈ ولیم بنٹنگ کے پاس اور 1835ء میں امیر دوست محمد خاں کے پاس۔ فقیر عزیزالدین ہمیشہ انتخاب کیا جاتا اور وہ اپنے آپ کو اس کا اہل ثابت کرتا۔ 1831ء میں مہاراجہ کے گورنر جنرل سے روپڑ کے مقام پر ملاقات کے مشہور تاریخی موقعے پر جو پارچہ طلائی کے میدان کی ملاقات کے نام سے مشہور ہے اور اسی طرح کے دوسرے یادگار و عظیم الشان ملاقات کے موقعے پر جو 1838ء میں فیروز پور کے مقام پر لارڈ آکلینڈ سے کی گئی تھی تمام ذمے داریوں کی

خدمات فقیر عزیزالدین ہی کے تفویض ہوتی تھیں۔ وہ بڑا قابل اور رنجیت سنگھ کے درباریوں میں یقیناً سب سے زیادہ ایماندار اور دیانتدار شخص تھا۔

عزیزالدین ایسا ملنسار اور آداب مجلس سے اس درجہ واقف تھا کہ بہت کم لوگ اس سے برسرِ پرخاش ہوتے گو اس میں شک نہیں کہ اس کی ترقی اور رسوخ کی وجہ سے لوگوں کو اس سے حسد ضرور تھا۔ باوجود مسلمان ہونے کے ہندو ریاست میں وزارت کی خدمات انجام دے کر اس طرح ہردلعزیز رہنے کی ایک وجہ یہ تھی کہ وہ عقائد میں بالکل آزاد تھا۔ وہ صوفی منش تھا۔ اس فرقے کو اگرچہ کٹر مسلمان بے دین تصور کرتے ہیں لیکن مشرق کے اعلیٰ درجے کے شعراء اور خوش خیال لوگ اسی گروہ کے تھے وہ زاہد خشک نہ تھا بلکہ تمام مذاہب کو ان کی خوبیوں اور خامیوں کے حوالے سے دیکھتا تھا۔ ایک مرتبہ رنجیت سنگھ نے اس سے دریافت کیا کہ وہ ہندو مذہب کو زیادہ پسند کرتا ہے یا اسلام کو۔ اس نے جواب دیا کہ "میری حالت اس شخص کی سی ہے جو کسی بڑے دریا میں شناوری کر رہا ہو اور جب ادھر ادھر نظر دوڑائے تو اسے دونوں کنارے بالکل یکساں نظر آئیں۔" وہ اپنے زمانے میں فصاحت و بلاغت میں مشہور تھا اور جیسی اس کی تقریر تھی ویسی ہی تحریر۔ اس کی مرتبہ تحریرات سلطنت ایشیائی مذاق کے لحاظ سے ذوق سلیم و خوش تحریری کا نمونہ مانی جاتی ہیں۔ وہ خود مشرقی علوم کے تمام شعبوں میں کامل دستگاہ رکھتا تھا اور علم کا بڑا فیاض حامی اور خدا شناس تھا۔ لاہور میں اس نے اپنے صرفے سے ایک دارالعلوم عربی و فارسی تعلیم کے لئے جاری کیا اور پنجاب کے سابق علماء عربی کی ایک کثیر تعداد اسی درس گاہ سے مستفید ہوئی تھی۔

شاعر کی حیثیت سے عزیزالدین کا پایہ بہت بلند ہے اس کی فارسی نظم جس کا رنگ صوفیانہ ہے اپنی سادگی اور بلند خیالی کے لحاظ سے بہت دل آویز ہے۔ چند قطعات کا ترجمہ صوفی رنگ سے واقف کرنے کی غرض سے درج ذیل کیا جاتا ہے۔

"اگر تم دنیا پر غور کرو تو تم دیکھو گے کہ وہ سایہ کی طرح گریزاں ہے۔

بے جا خواہشات سے کیوں اپنی طبیعت مکدر کرتے ہو در آں حالیکہ تمہیں ان کے انجام دہی کی قدرت نہیں۔

خود کو فراموش کر کے سرانجام خدا پر چھوڑ دو اور صبر کے ساتھ اس پر بھروسہ رکھو۔ تاکہ وہ تم کو اپنی نعمتوں سے مالا مال کر دے۔ اس کی رحمت کے منتظر رہو اور جو کچھ اس نے دیا ہے اس پر شکر کرو۔

دنیا کے مکروہات و مصائب سے کان بند کر لو۔ خدا ہی سے دل شاد کرو اور اسی کے رحم کا آسرا رکھو۔ عقلاً مجھ کو بت پرست تصور کریں گے اگر میں خودی کا بے سوچے سمجھے مدعی ہوں۔ دانشمند اور صاحب ادراک کے نزدیک اپنی ہستی کا ادعا حماقت ہے۔

گو سہراب' زال و رستم کو بھی تو نیچا دکھا دے لیکن آخرکار تیری توانائی نااستوار و نقش بر آب ہے۔ یہ وسواس ہی وسواس ہے کہ تخیل مکڑی کا سا جالا تنے۔ یہ کافی ہے کہ میں آزادی کی ہوا کھاؤں کیونکہ میں جانتا ہوں کہ ہر چیز کا انحصار خدا ہی پر ہے۔"

عزیزالدین کے شریفانہ برتاؤ اور چاپلوسی و تحسین میں مبالغہ کرنے کا پردیسیوں پر بہت گہرا اثر پڑتا تھا اور لاہور کے نامہذب و وحشیانہ انداز کے خیال سے اس کی یہ کیفیت اور بھی تعجب خیز تھی۔ بخارا اور دہلی کے مسلمان درباریوں کی اصلی شان کا اس ان پڑھ سکھ سردار کے وزیر میں پائے جانے سے تعجب ہوتا تھا۔ بیرن چارلس ہیوگل نے 36-1835ء میں پنجاب میں سفر کیا تھا اور پنجاب کے الحاق سے قبل جس قدر سفر نامے اس ملک کے متعلق لکھے گئے تھے ان میں سب سے زیادہ دلچسپ اس شخص کا سفرنامہ ہے۔ اس شخص کے دل پر عزیزالدین نے گہرا اثر کیا تھا۔ اس کی رنگین بیانی کی اس نے بہت سی مثالیں تحریر کی ہیں۔ فقیر عزیزالدین حسب معمول مہاراجہ اور اس کے یورپین مہمان کے مابین متوسط ہوتا تھا۔ بیرن ہیوگل کو بہت کچھ ترغیب دلائی گئی کہ وہ چھ ہزار کی بیش قرار ماہوار پر مہاراجہ کی ملک ملازمت میں داخل ہو۔ کیونکہ اس نوجوان سیاح کی قابلیت و کمال نے مہاراجہ کو متحیر کر دیا تھا۔ معلوم ہوتا ہے کہ باوجود

مبالغہ تحسین جو فارسی زبان کی مروجہ آداب کلام کی چاشنی سے مملو تھا بیرن ہیوگل کے دل میں اس وزیر کی سچی عظمت تھی۔

1842ء میں عزیزالدین کو لارڈ ایلن برا کے ملاقات کے لئے فیروز پور روانہ کیا گیا جہاں بہت بڑا دربار منعقد ہونے والا تھا۔ گورنر جنرل کے استقبال کے متعلق سکھ وفد کے حاضر نہ ہونے کی وجہ سے جس سوء ادبی کا خیال کیا گیا تھا اس کا سبب اس نے ایسی قابلیت اور خوش اخلاقی سے پیش کیا کہ گورنر جنرل نے اسے بھرے دربار میں ہر دو سلطنتوں کی دوستی کے محافظ کے لقب سے موسوم کیا اور اپنی جیبی طلائی گھڑی تحفے میں دی۔ میں نے یہ گھڑی اس کے فرزند سید جمال الدین میر منشی کے پاس اکثر دیکھی ہے جو لاہور میں میرا معتمد تھا۔ فقیر عزیزالدین کا دسمبر 1845ء میں عین اس شکست فاش سے قبل جو سکھوں کو پہلی لڑائی میں نصیب ہوئی انتقال ہوا۔ وہ مرتے دم تک سکھ فوج کے ستلج پر بغرض جنگ بھیجے جانے کے مخالف رہا اور اس طور پر گویا اس نے انگریزوں اور لاہور کے دربار کی آخری خدمت گزاری کی۔ گو وہ بے سود رہی۔ اس کے خاندان کے اکثر اراکین سے میری ملاقات ہے لیکن ان سب میں اس کا بھتیجا شمس الدین اس سے بہت مشابہ ہے۔ اب تو اس کا انتقال ہو چکا ہے لیکن عرصے تک ہم بے تکلف دوست رہے اور میں نے ہندوستان میں کوئی شخص اس سے زیادہ مہذب و سلیقہ شعار اور فارسی زبان کی رنگین بیانی میں اس سے بڑھ کر نہ دیکھا۔ عزیزالدین کے دونوں چھوٹے بھائی امام الدین و نورالدین مہاراجہ کے معزز اراکین تھے گو ان کی وقعت اپنے بڑے بھائی کے مثل نہ تھی خصوصاً نورالدین کی ملک میں عموماً بڑی عزت کی جاتی تھی اور 1846ء کی لڑائی کے بعد جب کہ راجہ لال سنگھ بغاوت کے جرم میں معزول کیا گیا تو مہاراجہ دلیپ سنگھ کے سن بلوغ کو پہنچنے تک جو مجلس انتظام مملکت کے لئے مقرر کی گئی تھی اس کا ایک رکن نورالدین بھی مقرر کیا گیا تھا۔ بڑا بھائی عموماً دربار میں فقیر صاحب کے لقب سے پکارا جاتا تھا اور یہ لقب اس وجہ سے انہیں دیا گیا تھا کہ یہ خاندان فقیری حیثیت قائم رکھنا باعث فخر سمجھتا تھا اور باوجود امارت فقر منش تھا اور فقر و فاقے میں دن کاٹتا تھا۔ حالانکہ یہ تینوں بھائی بہت دولتمند تھے۔ نورالدین کو دربار میں خلیفہ صاحب کے نام سے موسوم کیا جاتا تھا امام الدین رنجیت سنگھ کے عہد حکومت کے

ایک بڑے خطہ میں اور مہاراجہ شیر سنگھ کے زمانے تک امرتسر کے قلعے گوبند گڑھ کا حاکم رہا۔

دربار میں ملتان کے دو مسلمان نواب سرفراز خاں اور اس کا چھوٹا بھائی ذوالفقار خاں بہت ممتاز تھے۔ یہ دونوں بھائی سردار مظفر خاں کے فرزند تھے جو رنجیت سنگھ کے شہر ملتان پر حملہ کر کے قلعے میں روزن کرنے پر اس کی مدافعت میں اپنے پانچ بیٹوں اور جرگہ والوں کے تعداد کثیر کے ساتھ شمشیر بکف جاں بحق تسلیم ہوا۔ مہاراجہ کی فتوحات میں سے کسی فتح کے حصول میں اسے اس درجے مزاحمت و مشکل نہیں پیش آئی جیسی ملتان کی فتح میں۔ جب اس کی حکومت ملتان کے صوبے پر مستحکم طور پر قائم ہو گئی تو اس نے اپنے مفتوح دشمن کی اولاد پر عالی حوصلگی سے نوازش کی۔ وہ انہیں لاہور اپنے ہمراہ لایا اور ان کے لئے وظائف مقرر کئے جن کو سرکار انگریزی نے بھی ان کے ورثاء پر برقرار رکھا۔

دوسرا مسلمان سردار جس پر فتح حاصل کی گئی اور رنجیت سنگھ کے لواحقین میں لاہور میں تھا۔ خدا یار خاں نامی ٹوانہ کا سردار تھا۔ یہ شخص اپنے چچا زاد بھائیوں کے ساتھ 50 ٹوانہ سواروں کا سرگروہ بنا کر لاہور لایا گیا۔ پنجاب بھر میں ٹوانوں سے زیادہ کوئی شہ سوار خوبصورت جوان ملنا ناممکن ہے۔ ٹوانہ ہمیشہ سے اپنی بہادری کے لئے مشہور ہیں اور انگریز عہدہ داروں کی ماتحتی میں انہوں نے کارہائے نمایاں انجام دیئے ہیں۔

مہاراجہ کے دربار میں جمعدار خوشحال سنگھ بھی ممتاز شخص تھا۔ وہ ضلع میرٹھ کے ایک برہمن دوکاندار کا بیٹا تھا۔ 17 سال کی عمر میں وہ بتلاش معاش لاہور آیا اور دھونکل سنگھ والا فوج میں جو اس وقت مرتب کی جا رہی تھی پانچ روپیہ ماہوار پر ملازم ہو گیا۔ اس کے بعد ہی مہاراجہ کے عرض بیگی سے اس کی دوستی ہو گئی اور وہ مہاراجہ کے محافظ دستہ فوج میں مقرر کیا گیا۔ یہاں اس کی ہوشیاری خوبصورتی اور سپاہیانہ انداز کی وجہ سے مہاراجہ کی توجہ اس پر ہو گئی۔ اس کے خاندان میں یہ روایت مشہور ہے کہ ایک رات کو رنجیت سنگھ بھیس بدل کر باہر گیا' جب وہ واپس ہوا تو خوشحال سنگھ نے جو پہرے پر تھا اسے محل میں داخل نہ ہونے دیا اور رات بھر حراست میں رکھا۔ اس کی

اس ہوشیاری و مستعدی سے رنجیت سنگھ اس درجہ خوش ہوا کہ اس نے اسے اپنا خاص محافظ مقرر کیا۔ بہرحال جو کچھ ہو اس کا رنجیت سنگھ کے مقربین کے زمرے میں شمار اور روز بہ روز ترقی کرنا یقینی امر ہے۔ 1811ء میں وہ ڈیوڑھی والا یا عرض بیگی مقرر کیا گیا اور اسے جمعدار کا خطاب دیا گیا۔ اس خدمت کی بڑی وقعت تھی۔ عرض بیگی تمام مراسم کی انجام دہی کی نگرانی جلوس کی ترتیب اور دربار کی محافظت کیا کرتا تھا۔ اگرچہ روزانہ دربار میں عام شرکاء ذی وقعت عہدہ دار بلا امتیاز شریک ہو سکتے تھے لیکن مہاراجہ کی خانگی ملاقات اسی کے توسط سے ہوتی تھی ملاقاتی چاہے کتنا ہی عالی رتبہ کیوں نہ ہو۔

لاہور آنے کے پانچ سال بعد اسے سکھ مذہب میں داخل کیا گیا۔ اس کے بعد سے اس کی جلد قدر افزائی ہونے لگی اور وہ متمول ہو گیا کیونکہ جو اثر اس کا اپنے آقا پر تھا اس کی وجہ سے درباریوں سے اسے رشوت و تحائف بہ کثرت ملتے رہتے تھے۔ وہ متعدد فوجی خدمات پر مامور کیا گیا۔ 1832ء میں بہ ماتحتی شہزادہ شیر سنگھ وہ کشمیر کا صوبہ دار مقرر کیا گیا جہاں اس کے مظالم نے گرانی کو قحط سے متبدل کر دیا۔ اس میں کوئی خاص جوہر یا قابلیت نہ تھی اور گو ابتداء میں مہاراجہ کا اس کی خوش وضعی سے متاثر ہونا بیان کیا جاتا ہے لیکن اس کے بعد کی تصویروں سے تو وہ خوبصورت سکھ سرداروں سے بدرجہا بھونڈا' بدصورت' معمولی گنوار معلوم ہوتا ہے۔ دربار میں عام طور پر وہ ہردلعزیز نہ تھا۔ عموماً اس کے اطوار سے ظلم کے آثار نمودار تھے۔ اس کا بھتیجا تیج سنگھ بھی جو اس کے ساتھ لاہور آیا تھا مقربین میں شامل اور راجہ بنا دیا گیا تھا۔ جب سکھوں کی انگریزوں سے پہلی مرتبہ لڑائی ہوئی تو یہ سکھ فوج کا سپہ سالار مقرر کیا گیا تھا لیکن اس پر دغا بازی اور بزدلی کا الزام عائد کیا گیا۔ لیکن سکھ فوج کے طبائع اس قدر متلون اور شکی اور جن حالات میں اسے فوج کی سپہ سالاری کرنا پڑی اس میں اس درجے دشواریاں تھیں کہ جن لوگوں نے تیج سنگھ کے واقعات اور حالات کو غور سے دیکھا ہے وہ کمزوری و تلون مزاجی کے سوا اس کو کسی اور جرم کا مجرم بمشکل قرار دے سکتے ہیں۔

ہری سنگھ نلوا جنگجو سرداروں میں سب سے زیادہ نام آور تھا اور مہاراجہ کو اس سے بہت گرویدگی تھی۔ یہ شخص بھی رنجیت سنگھ کی طرح گوجرانوالہ میں پیدا ہوا تھا۔

وہ سب سے بہادر تھا اور مہاراجہ کے تمام سپہ سالاروں میں سب سے زیادہ ہوشیار بھی تھا اور تمام دشوار مہمات میں وہی سپہ سالار بنایا جاتا تھا۔ 1818ء میں ملتان کی فتح زیادہ تر اسی کی کارگزاری سے ہوئی۔ اس کے دوسرے سال اس نے ایک دستہ فوج لے کر کشمیر پر حملہ کیا جہاں بعد میں وہ صوبہ دار مامور کیا گیا۔ لیکن اس کی طبیعت انتظام مملکت سے مناسبت نہ رکھتی تھی اور اس وجہ سے لوگ اس سے اس درجہ بگڑ گئے کہ مہاراجہ کو مجبوراً اسے واپس طلب کر لینا پڑا۔ اس کے بعد وہ پنجاب کی سرحد پر ہزارہ کا اور بعد میں پشاور کا صوبہ دار مقرر کیا گیا۔ پشاور ہی میں وہ 1837ء میں افغانوں کی جنگ کے عین معرکے میں مارا گیا۔

ہری سنگھ نلوا کے بعد لڑنے والوں میں سردار عطر سنگھ سندھانوالیہ بہت نمودار تھا۔ یہ شخص اپنی طاقت اور جرات کی وجہ سے خالصہ کا سورما مانا جاتا تھا۔ وہ خاص پنجاب کے ایک ذی اقتدار خاندان کا رکن تھا جس سے خود مہاراجہ کا تعلق تھا۔ سندھانوالیہ گروہ بڑا شورہ پشت تھا۔ عطر سنگھ اس کے بھائی لہنا سنگھ اور اس کے بھتیجے اجیت سنگھ ان سازشوں میں شریک غالب تھے جو رنجیت سنگھ کی موت سے قبل و بعد وقوع پذیر ہوئیں۔ انہوں نے جموں کے تینوں راجاؤں کے اقتدار کی مخالفت کی اور تینوں جان سے مارے گئے۔

راجہ گلاب سنگھ راجہ دھیان سنگھ اور راجہ سچیت سنگھ ادنیٰ ڈوگر راجپوت خاندان کے افراد تھے لیکن محض اپنی قابلیت اور قوت عملی کے زور سے بادشاہت کے آخر زمانے میں عروج حاصل کیا۔ منجھلا بھائی راجہ دھیان سنگھ مہاراجہ رنجیت سنگھ کی زندگی میں ان سب میں زیادہ ممتاز تھا۔ وہ جمعدار خوشحال سنگھ کے بعد ڈیوڑھی کی خدمت پر مامور کیا گیا اور کچھ عرصے تک وہی درحقیقت مدارالمہامی کی خدمت انجام دیتا رہا کیونکہ رعایا اور مہاراجہ کے مابین وہی واسطہ تھا اور سوائے محکمہ خارجیہ اور خزانہ کے جو راجہ دینا ناتھ اور فقیر عزیزالدین سے متعلق تھے دوسرے تمام محکموں پر اسے اقتدار حاصل تھا۔ اس کے بھائی گلاب سنگھ سے عموماً فوجی خدمات متعلق تھیں۔ لیکن مہاراجہ کے انتقال اور اپنے بھائی دھیان سنگھ کے قتل کے بعد وہ کچھ عرصے تک لاہور کے دربار کا سب سے مقتدر شخص ہو گیا تھا۔ ستلج کی پہلی لڑائی کے موقع پر اس نے انگریزوں کی

ایسی خدمتیں انجام دیں جن کے لحاظ سے گورنر جنرل نے اسے صوبہ کشمیر کا خود مختار حاکم مقرر کیا۔ پنجاب کی تاریخ میں غالباً کوئی شخص راجہ دھیان سنگھ اور راجہ گلاب سنگھ سے زیادہ قابل تنفر نہیں ہے۔ ان کی اعلیٰ ذہانت اور حقیقی بہادری نے اور بھی زیادہ ان کے وحشیانہ مظالم، دغا بازی، حرص و جاہ طلبی کے عیوب کو نمایاں کر دیا ہے۔ تیسرا بھائی سچیت سنگھ فوج میں سب سے زیادہ خوش رو اور دربار میں شان دار شخص تھا۔ اس میں اپنے بھائیوں کی سی قابلیت نہ تھی اور لاہور کے سیاسی امور میں اس کی مستقل شرکت نہ تھی۔ راجہ دھیان سنگھ کا بھتیجا راجہ ہیرا سنگھ ایک ہونہار نوجوان تھا وہ اپنے باپ کی جگہ مدارالمہام مقرر کیا گیا۔ لیکن اسی کی طرح سکھوں کی پہلی لڑائی سے قبل جو شورش اور فساد برپا ہوا اس میں مارا گیا۔

مہاراجہ کی آخر زندگی میں جن لوگوں نے اقتدار میں ترقی کی ان سب میں راجہ دینا ناتھ سے بڑھ کر کوئی قابل ذکر نہیں۔ اسے پنجاب کا ٹیلرانڈ کہنا بالکل بجا و درست ہے۔ اس کی زندگی اور روش یورپ کے اس زبردست مدبر سلطنت کے بہت مشابہ تھی۔ بڑے بڑے انقلاب اس کے سامنے گزرے جس میں اس کے احباب و سرپرست تلف ہو گئے۔ خاندانوں کو عروج و زوال ہوا لیکن اس کا بال بیکا نہ ہوا۔ قتل و خونریزی میں اس کی جان کبھی معرض خطر میں نہ پڑی۔ املاک کی ضبطی اور عدالتی لوٹ مار تمام ریاست میں پھیل گئی تھی لیکن اس کی دولت و اقتدار میں مسلسل اضافہ ہوتا رہا۔ اس کی فراست اور دور اندیشی ایسی بڑھی ہوئی تھی کہ جب دوسروں کی نظر میں سیاسی مطلع پاک و صاف نظر آتا تو وہ آنے والے طوفان سے آگاہ ہو کر متنبہ ہو جاتا اور اس جماعت سے کنارہ کشی کر لیتا یا اس دوست کو ترک کر دیتا جو معرض زوال میں آنے والا ہوتا۔ ایماندار اشخاص اکثر انقلابات سے عہدہ برا نہیں ہو سکتے۔ اس کی بیوفائی اس کی کامیابی کا ذریعہ ہوئی۔ وہ محب وطن ضرور تھا لیکن اس کی حب وطن حب ذات کی تابع تھی۔ وہ انگریزوں سے سخت متنفر تھا کیونکہ وہ اس کی ذات اور اس کے ملک دونوں سے زیادہ طاقتور تھے لیکن اس کے اغراض نے ان لوگوں کی خدمت گزاری پر اسے مجبور کیا جیسے سمسن پہلوان فلسطینیوں کی خدمت پر مجبور تھا۔ وفاداری کے متعلق اس کا خاص خیال تھا۔ وہ اپنے دوست کا اس وقت تک شریک رہتا جب تک کہ خود اس کو کوئی

گزند نہ پہنچے۔ وہ اس سے صرف اپنے اقتدار و دولت کے زوال کے اندیشے کی وجہ سے قطع تعلق کرتا نہ کہ کسی ڈر سے کیونکہ وہ فطرتاً" بہادر تھا اور اس میں اعلیٰ درجے کی اخلاقی جرات تھی گو وہ بلا لحاظ نتائج حق بات کے لئے ہرگز آمادہ نہ ہوتا تھا۔ اس کی مقامی معلومات وسیع تھیں اور اسی طرح اس میں کام کرنے کی بھی بڑی صلاحیت تھی لیکن اس کی یہ خواہش کہ تمام اقتدار اس کے ہاتھ میں رہے اجرائی کار میں مخل ہوتی تھی۔ وہ بڑا دنیا دار تھا آداب صحبت سے آگاہ اور مردم شناس۔ گو وہ عالم نہ تھا لیکن اچھا تعلیم یافتہ تھا۔ انگریزوں کے ساتھ گفتگو کرتے وقت وہ جرات اور بظاہر بیباکی سے کام کرتا تھا اور چونکہ ایک ایشیائی شخص کے لئے یہ اوصاف غیر معمولی تھے اس لئے خوشنما معلوم ہوتے تھے۔

1834ء میں راجہ دینا ناتھ وزیر خزانہ مقرر کیا گیا جس کے لئے وہ بہت ہی موزوں تھا لیکن مہاراجہ کو ایک عرصے سے اس پر اعتماد تھا اور تمام اہم معاملات میں وہ اسی سے مشورہ لیا کرتا تھا۔ اپنے آقا کے مرنے کے بعد اسے سرداروں میں اور فوج پر بڑا اقتدار حاصل رہا اور سرکار انگریزی کے لاہور پر قبضہ کرنے کے بعد وہ مجلس انتظام ریاست کا رکن مقرر کیا گیا جہاں وہ بہت لائق اور کار آمد ثابت ہوا۔ اگرچہ خزانے کے افسر اعلیٰ ہونے کی حیثیت سے اسے اپنے آپ کو سرکاری رقوم سے متمول ہو جانے کا بہت کچھ موقع تھا اور گمان غالب یہ ہے کہ اس نے اس موقع سے فائدہ بھی ضرور اٹھایا لیکن اوروں کے مقابلے میں اس نے زیادہ بے غرضی سے کام کیا اور انگریزی سفیر مقیم لاہور کی بہت مدد کی۔ اس کی حساب فہمی اور کاروبار کی انجام دہی کی عادت کی وجہ سے دربار کے حساب سلجھ گئے جن کا اس کے بغیر سلجھانا ناممکن تھا۔ اور پنجاب کے الحاق کے بعد دینا ناتھ سے محاصل و جاگیرات کے متعلق اس کی مدد بھی قابل قدر تھی جیسے اس کے قبل تھی۔ سکھوں کے 1848ء میں بغاوت کرنے کے موقع پر .بعضوں کا خیال یہ ہوا کہ دینا ناتھ پوشیدہ طور پر دغا باز ہے اور خود اس نے یہ شورش برپا کرائی ہے اور یہ کہ اگر وہ دولت مند نہ ہوتا تو اور اس کے پاس مکانات و باغات کے علاوہ لاکھوں روپے نقد لاہور میں نہ ہوتے جن کی ضبطی بہت آسان تھی تو وہ بلا تردد باغیوں میں شامل ہو جاتا لیکن یہ سب قصے شاید اس کے دشمنوں نے تصنیف کئے ہیں لیکن امر یقینی یہ ہے کہ جب

اسے لاہور واپس طلب کیا گیا تو اس نے سرکار انگریزی کے حکام کے حسب خواہش بڑی سرگرمی اور مستعدی سے باغیوں کی جائیدادیں ضبط کرنے اور ان کے منصوبوں کو تباہ کرنے میں بہت کچھ مدد دی۔

دربار کے ہمیشہ حاضرباش لیکن عموماً خاموش درباریوں کے ضمن میں سکھ پوجاریوں بھائی رام سنگھ بھائی گوبند سنگھ اور بھائی گرمکھ سنگھ کا ذکر کرنا ضروری ہے۔ منجملہ پہلے دو ایک مشہور سکھ پوجاری اور گرو کے پوتے تھے جو لاہور میں رہتا تھا اور اٹھارہویں صدی میں سالہائے دراز تک سکھ اس کی عام طور پر عظمت و وقعت کرتے تھے۔ یہ مہاراجہ کے 1802ء میں لاہور فتح کرنے کے دو سال بعد تقریباً سو برس کی عمر میں فوت ہوا۔ رنجیت سنگھ اس بزرگ کی بہت عزت کرتا تھا اور اس کے پوتوں کو اس نے جاگیریں عطا کیں۔ ان میں سے رام سنگھ بہت بااثر شخص تھا اور جنگ کے معرکوں میں ہمیشہ اس کا خیمہ رنجیت سنگھ کے خیمہ کے پاس نصب کیا جاتا تھا۔ مہاراجہ ہمیشہ ایک قاصد کو انہیں عزت کے ساتھ دربار میں لانے کے لئے روانہ کیا کرتا تھا اور ان کی بڑی آؤ بھگت کی جاتی تھی۔ بھائی گرمکھ سنگھ سنت سنگھ کا لڑکا تھا جو امرتسر کے دربار صاحب کا متولی تھا وہ پوجاری بھی تھا اور سپاہی بھی اور اکثر فوجی خدمتیں بڑی قابلیت سے انجام دی تھیں۔ جب اس نے دنیاوی کاروبار کو ترک کر کے سکھوں کی مذہبی کتاب کا مطالعہ اور تشریح شروع کی تو اپنے بیٹے گرمکھ سنگھ کو دربار میں روانہ کر دیا یہ نوجوان بھی اپنے باپ کی طرح ہردل عزیز ہو گیا گو اسے کبھی اپنے حریف اور دشمن بھائی رام سنگھ کا سا اقتدار نصیب نہیں ہوا۔

لاہور کے دوسرے ممتاز لوگوں میں مشر رلیا رام کروڑ گیری کا افسر اعلیٰ تھا۔ اس کے بعد اس کا لڑکا راجہ صاحب دیال اس عہدے پر فائز ہوا۔ اٹاری والا خاندان کے سردار چتر سنگھ، شیر سنگھ اور شام سنگھ تھے۔ ان میں سے پہلے دو 1848ء کی سکھ بغاوت کے خاص سرغنہ تھے۔ مجیٹھیا خاندان کے سرداروں میں سے دیسا سنگھ اس کا بیٹا لہنا سنگھ سب سے زیادہ ممتاز تھے۔ لہنا سنگھ کو حسام الدولہ یعنی "تیغ ریاست" کا لقب دیا گیا یہ بڑا قابل شخص تھا۔ وہ کلوں کے کام کا ماہر بلکہ موجد تھا۔ اس نے سکھ توپ خانہ کی بہت کچھ اصلاح کی اور اس کی بنائی ہوئی چند خوبصورت توپیں علی وال اور مقامات

پر بھیجی گئیں۔ منجملہ اور اشیاء کے اس نے ایک گھڑی ایسی بنائی جس سے گھنٹہ' تاریخ اور چاند کی شکلات ظاہر ہوتی تھیں۔ وہ علم ہیئت اور ریاضی کا بہت شوق رکھتا تھا اور کئی زبانوں میں کامل ماہر تھا۔ حاکم ہو کے وہ بہت ہردلعزیز تھا۔ وہ کبھی غرباء پر سختی نہ کرتا تھا۔ اس کی تشخیص لگان ہمیشہ معتدل اور اس کے فیصلے منصفانہ ہوتے تھے۔ بہ حیثیت مدبر وہی ایک شخص تھا جسے لاہور کے دربار میں ایماندار کہا جا سکتا ہے۔ جعل و رشوت کا بازار گرم تھا لیکن لہنا سنگھ کے ہاتھ کبھی اس لوث سے آلودہ نہ ہوئے۔ طماع' بدنیت اور سازشی لوگوں کے نرغے میں وہ گھرا ہوا تھا مگر کبھی اس نے اپنی ایمانداری پر حرف نہ آنے دیا۔

اگر لہنا سنگھ کی سی وقعت اور انتظامی قابلیت کا کوئی شخص 1845ء میں پنجاب میں مقدم ہوتا تو ملک پر جو بلائیں نازل ہوئیں وہ نہ آتیں۔ لیکن وہ حقیقی محب وطن نہ تھا۔ وہ نہ سمجھا کہ مدبرین سلطنت بلکہ ہر ایماندار شخص کا مذہب یہ ہونا چاہئے کہ خطرے کے وقت اپنے ملک کا ساتھ دے۔ مصائب میں اس کا شریک رہے اور اگر ضرورت ہو تو اس کے زوال کے ساتھ خود ہی مٹ جائے۔

رنجیت سنگھ کی فوج اور انتظام مملکت

مہاراجہ کی فوجی طباعی کا اظہار فوج کی سپہ سالاری میں نہیں ہوتا تھا کیونکہ اس بارے میں اس کے بہت سے عہدہ دار اور دوسرے سردار اس پر سبقت لے گئے تھے۔ اس کی اس قابلیت کا اظہار اس امر سے ہوتا تھا کہ اس نے کس قدر طاقتور تربیت یافتہ اور ساز و سامان سے آراستہ فوج بے قاعدہ' سرکش اور خود سر سکھوں کی بھرتی سے قائم کی۔ درآں حالیکہ یہ لوگ جب کبھی انہیں لوٹ مار کے زیادہ مواقع دستیاب ہونے کی توقع ہوتی تو ایک سردار کا ساتھ چھوڑ کر دوسرے کے ساتھ جا ملتے اور اپنی سہولت و میلان طبع کے موافق سرداروں میں تغیر و تبدل کیا کرتے تھے۔

جس وقت اس کا دادا چڑت سنگھ اور اس کا باپ مہان سنگھ چاکیا ریاست پر حکمراں تھے اس وقت سکھ جماعت میں طوائف الملوکی پھیلی ہوئی تھی۔ ایسے خودسری کے زمانے میں جبکہ ہر شخص جو کچھ وہ چھین جھپٹ سکتا اس پر قابض ہو جاتا اور اس کے برقرار رکھنے کے لئے برسر مدافعت ہوتا تھا نئے نئے سردار و پیشوا کم و بیش اقتدار کے ساتھ پیدا ہوتے رہتے تھے لیکن ایسی پیشوائی سے لوگوں کی نگاہوں میں اس شخص کی کوئی حقیقی وقعت و عظمت نہ ہوتی تھی۔ سکھوں کی مذہبی حکومت زمانہ حال کے یورپ و امریکہ کی جمہوریت سے حقیقتاً کہیں زیادہ مساوات و اخوت پر مبنی تھی۔

سکھوں کی تنظیم و لڑائی کے طریقے کا ذکر اس کے پیشتر کے باب میں کیا گیا ہے۔ یہ لوگ بالخصوص سوار تھے نہ کہ پیادہ۔ پیادہ فوج سوار سے کم رتبہ سمجھی جاتی تھی اور جنگ کے موقع پر یا تو قلعوں کی نگہداشت اور عورتوں کی حفاظت کے لئے پیادے پیچھے چھوڑ دیئے جاتے تھے یا لڑنے والوں کے ہمراہ اس غرض سے رکھے جاتے تھے کہ جب موقعہ ملے تو اپنے لئے خواہ چرا کر یا خرید کر گھوڑا مہیا کریں اور اس طرح اپنا مرتبہ

تبدیل کر کے ان میں شامل ہو جائیں۔

مہاراجہ رنجیت سنگھ نے اپنے ابتدائی زمانے میں اپنی خداداد دانشمندی سے یہ معلوم کر لیا تھا کہ سکھوں کا طریقہ جنگ ان لوگوں کی طبیعت کے مناسب نہیں ہے اور جب تک اس میں اصلاح نہ کی جائے اس وقت تک ایسی باضابطہ فوج پر جیسی کہ انگریزی فوج ہے کوئی مستحکم فتح کی توقع نہیں ہو سکتی جس کی قواعد و فوجی تربیت کو اس نے بغور و فکر دریافت کیا تھا یا افغانوں کے مقابلے میں جو احمد شاہ کے زمانے میں معقول طور پر تربیت یافتہ ہو گئی تھی۔ جو کھلے میدانوں میں خونخوار دشمن تھے اور پہاڑیوں میں تو ان پر فتح پانا قطعاً" ناممکن تھا۔ اس نے جب انگریزی فوجی تنظیم کی خوبی سے جس کے مقابلے میں ہندوستان کی تمام جنگجو قومیں طاقت آزمائی کر کے پست ہو چکی تھیں اچھی طرح واقفیت حاصل کر لی اور اس راز سے آگاہ ہو گیا تو اس نے اس امر کا مصمم ارادہ کر لیا کہ اسی طرز پر فوج کی تربیت کرے اور اسی کے ساتھ ایسا ہی مستحکم ارادہ اس طاقت سے صلح رکھنے کا کیا جس کی وہ وقعت کرنے لگا تھا۔ ان ہی خیالات کی بنا پر مہاراجہ نے خالصہ فوج کی تنظیم کو ایک سرے سے بدل دیا۔ اب سوار فوج کی اس درجہ اہمیت باقی نہیں رہی اور پیادہ فوج زیادہ پسند کی جانے لگی اس تبدیلی میں فرانسیسی و اطالوی عہدیداروں کے تقرر سے زیادہ سہولت ہو گئی۔ ایسٹ انڈیا کمپنی سے عہدہ دار مستعار ملنے میں مہاراجہ کو ناکامیابی ہوئی تو اس نے ان عہدیداروں کو مامور کیا۔ ان پردیسی افسروں نے ان طریقوں کا فوج میں رواج دینا شروع کیا جو یورپ میں عام طور سے رائج تھے اور جہاں پیادہ فوج سوار فوج کے مقابلے میں عام طور پر زیادہ کارآمد تصور کی جاتی تھی۔ ان میں سے بعض اشخاص بہت قابل تھے اور لاہور کی فوج کی اصلاح کے بارے میں انھوں نے جو کچھ وعدے کئے تھے ان کے ایفا کی ان میں پوری صلاحیت تھی۔ ان کے زیر تربیت پیادہ فوج نہایت مہیب، منظم، باقاعدہ و مستعد بن گئی گو ان کی فوجی نقل و حرکت میں پھرتی نہ تھی۔ ان میں صبر و برداشت کا مادہ بہت تھا اور بسااوقات فوج کی فوج کئی کئی روز تک ایک ایک دن میں تیس تیس میل سفر کرتی تھی۔

مہاراجہ کے زمانے میں فوجی بھرتی خود اختیاری تھی لیکن باوجود اس کے نئے لوگوں کی دستیابی دشوار نہ تھی کیونکہ عام طور پر اس خدمت کو لوگ پسند کرتے تھے۔ سوار فوج کی تربیت اس وقت بھی تقریباً ویسی ہی تھی جیسے کہ خالصے کے زمانے میں۔ جبکہ فوج کے دل بادل افغانوں کی فوج کے کناروں پر منڈلاتے رہتے اور باضابطہ فوج پر حملہ کرنے سے خائف ہو کر صرف بدرقہ پر حملہ کر کے دشمن کی خبر رسانی کے سلسلے کو معرض خطر میں ڈال دیتے۔ اس میں شک نہیں کہ ہلکے مسلح سواروں کے اصلی فرائض میں یہ بات داخل تھی لیکن سکھوں کی سوار فوج کے گھوڑے عموماً ناقص اور اسلحہ ناکافی ہوتے تھے اور عام طور پر جب ان پر حملہ ہوتا تو بجائے اظہار مردانگی وہ بھاگنے میں زیادہ مشہور تھے۔ پیادگی کی حالت میں سکھ سپاہی نہایت جری و مستعد ثابت ہوا ہے۔ اگرچہ انگریزی فوج میں بعض نادر دستے سکھ سواروں کے ہیں جو دنیا کے دوسرے سوار دستوں کے ہم پلہ ہیں لیکن افغان و ہندوستانی جو پیادہ فوج میں ان سے گھٹے ہوئے ہیں سواروں کی حیثیت سے ان پر فوقیت رکھتے ہیں۔ مہاراجہ کے زمانے میں پیادہ فوج میں ملک کے چیدہ جوان تھے اور اس میں صرف خوش رو و مضبوط لوگ منتخب کئے جاتے تھے اس کے برخلاف سوار بے قاعدہ فوج تھی جو اس کے سرداروں کے لواحقین تھے اور بہادری یا طاقت کا کوئی لحاظ ان کے بھرتی کرتے وقت نہیں کیا جاتا تھا۔ گھوڑے کم قد کے لاغر' دوغلے اور ساز و سامان بھدا و بد قطع ہوتا تھا۔ آج کل کی سکھ ریاستوں میں فوج میں بھی جو سب میری دیکھی ہوئی ہیں اور ان میں سے ایک کو خاص طور پر میں نے ہی مرتب کیا ہے وہی طریقہ جاری ہے۔ پیادہ فوج قد و قامت اور ڈیل ڈول میں سکھوں کی انگریزی فوج کی سی تھی لیکن سوار فوج ایسی بڈھی نحیف وظیفہ خواروں کا اسپتال ہو گئی ہے جو گھوڑے کی پیٹھ پر تو بیٹھ سکتے ہیں لیکن نہ تو وہ حملہ کر سکتے اور نہ کوئی جسمانی طاقت کا کام انجام دے سکتے ہیں۔

میں نے اس سے قبل اکالیوں کا ذکر کیا ہے کہ وہ خالصے کے زمانے میں پیادہ فوج کی حیثیت سے سب سے زیادہ باوقعت سمجھے جاتے تھے مہاراجہ ان لوگوں کے بارے میں زیادہ مداخلت کرنے سے ڈرتا تھا کیونکہ اگرچہ ان کی حالت مخمور وحشیوں سے کچھ

ہی بہتر تھی لیکن سکھ ان لوگوں کو ایک حد تک بزرگ مانتے تھے اور جب کبھی ایسے کام کے سر انجام کی ضرورت پڑتی جس کی انجام دہی سے باقاعدہ فوج کے سپاہی و عہدیدار انکار کرتے تو یہی لوگ کام آتے تھے۔ ان ہی لوگوں نے مٹکاف کے مسلمان محافظ دستے پر 1809ء (18) میں دیوانہ وار حملہ کر کے مہاراجہ کو انگریزوں سے تقریباً لڑا دیا۔ ان کی بے خوف جرات نے بہت سی متزلزل لڑائیوں کو فتح سے مبدل کر دیا۔ یہ اپنی روش اور حملہ آوری کے طرز میں افغانستان و سوڈان کے غازیوں کے مشابہ تھے جن کے ہیبت ناک و سخت حملے سوائے باقاعدہ تربیت یافتہ اور تجربے کار فوج کے دوسروں کے چھکے چھڑا دیتے ہیں۔ لیکن سکھوں کی خدائی فوج کی جرات بجائے اس جوش مذہبی کے جو اسلامیوں کے دل میں ہے منشیات کی وجہ سے ہے۔ مہاراجہ کے زمانے میں ان کی ضرر رسانی اور دھاک بہت بڑھی ہوئی تھی اور وہ ہمیشہ اس کے لئے خطرے کے باعث ہوتے تھے۔ چنانچہ انہوں نے کئی بار اس کی جان لینے کی بھی کوشش کی۔

ان کی گستاخانہ لاف زنی اور یورپین لوگوں سے تنفر کرنے نے انہیں انگریزوں کے قبضے و الحاق کے ابتدائی زمانے میں اس درجے مکروہ بنا رکھا تھا کہ امرتسر کے دربار صاحب کے مندر میں اکالیوں کا صدر مقام تھا انگریزوں کا جانا خالی از خطرہ نہ تھا۔ مہاراجہ یا تو بالکل غیر متعصب تھا اور یا کم از کم لاپرواہ تھا اور وہ یہ چاہتا تھا کہ اس کی مسلمان رعایا بلا مزاحمت مراسم مذہبی ادا کرنے کے مجاز ہوں۔ لیکن اس کو مجبور ہونا پڑا کہ اونچی آواز سے اذان کی ممانعت کر دے کیونکہ اس کی آواز سے اکالی برافروختہ ہوتے تھے۔ مہاراجہ نے ان مذہبی دیوانوں کا ایک باقاعدہ گروہ بنانے کی کوشش کی اور اس لئے اس نے ایک فوج قائم کی جس میں تین ہزار بے قاعدہ سوار تھے لیکن اس کا بہت کم اثر ہوا۔ وہ ہمیشہ حملہ کرتے وقت گھوڑوں پر سے اتر پڑتے اور اور دو رخی تلوار استعمال کرتے تھے جو انہیں بہت عزیز تھی۔ لوہے کے چکر جو ہمیشہ ان کی پگڑیوں میں لگے رہتے تھے جن کا قطر "6 سے "8 انچ تک ہوتا تھا اور ان کے کنارے دھار دار ہوتے تھے ایسے خطرناک نہ تھے جیسے کہ وہ لوگ ان کو تصور کرتے تھے اور اصل یہ ہے

کہ یہ دوست، دشمن سب کے لئے یکساں خطرناک تھے۔ مجھے کبھی کوئی ایسا اکالی نہیں ملا جو ان چکروں کو اچھی یا یقینی طور پر استعمال کر سکتا ہو۔ میں نے اکثر کامیابی کے ساتھ انہیں ان کے خلاف استعمال کیا ہے۔ ان کی زد ساٹھ سے لے کر سو گز تک ہوتی ہے۔

پردیسیوں میں سے جو مہاراجہ کی ملازمت کے سلسلے میں داخل ہوئے جنرل وینٹورا سب سے زیادہ باوقعت تھا۔ وہ اطالیہ کا معزز و معروف شخص تھا۔ اس نے اسپین و اٹلی کی افواج میں نپولین کی ماتحتی میں خدمات انجام دی تھیں اور صلح کے بعد جب اس نے دیکھا کہ وہاں اس قسم کے کاموں کی قدر نہیں رہی تو وہ قسمت آزمائی کرنے کے لئے نکل کھڑا ہوا۔ دنیا کے جس قطعہ ملک میں اسے موقع ملا وہاں جا پہنچا۔

ایسی طرز و حیثیت کا ایک دوسرا شخص جنرل الارڈ تھا۔ یہ بھی نپولین کا ایک عہدہ دار تھا جو اپنی قابلیت و بہادری کے جوہر سے اکثر مہمات میں ممتاز رہا تھا۔ ان لوگوں نے پہلے تو اپنی قسمت آزمائی مصر و ایران میں کی لیکن جب انہوں نے دیکھا کہ شاہ عباس کے یہاں جو بادشاہ وقت تھا ان کی رسائی ناممکن ہے تو وہ ہرات و قندھار کے راستے سے ہندوستان چلے آئے۔ یہاں مہاراجہ نے بہت پس و پیش اور عرصے تک ان کے اوصاف کی جانچ پڑتال کرنے کے بعد انہیں مامور کیا۔ دونوں نے رنجیت سنگھ کی خدمت نہایت وفاداری سے اور عرصے تک انجام دی۔ الارڈ کو سواروں کی فوج بھرتی کرنے کی اجازت دی گئی اور وینٹورا کو فوج خاص کی کمان سپرد کی گئی۔ یہ حصہ فوجی تربیت و ساز و سامان کے لحاظ سے تمام سکھ فوج میں اول درجے کا شمار ہوتا تھا اس کی اصلی تعداد 4 پیادے اور سوار دستے تھے اور اگرچہ مہاراجہ نے بعد میں اس میں اضافہ کر کے 5 پیادے اور 3 سوار دستے قائم کئے لیکن وینٹورا کی درخواست پر اسے پھر اگلی تعداد پر قائم کر دیا۔ جنرل وینٹورا نے اس فوج کے ہمراہ بہت سے مہمات میں کارہائے نمایاں انجام دیئے' علی الخصوص پہاڑیوں کے گرد اور پشاور کے اطراف میں۔ مہاراجہ ہمیشہ اس کو معتبر سمجھتا اور اس کی عزت کرتا تھا۔ اس نے اسے لاہور کا قاضی یا صوبہ دار مقرر کیا جس کی وجہ سے دربار میں اس کا درجہ تیسرا شمار کیا جانے لگا۔

کرنل کورٹ جو فرانسیسی تھا اور جس نے پیرس کی اکولی پولی ٹیکنیک میں تعلیم پائی

تھی گورکھا فوج کے دو دستوں پر برسر کمان تھا۔

کرنل گارڈنر آئرلینڈ کا باشندہ تھا نہ اس کی تعلیم زیادہ ہوئی تھی اور نہ طور طریقہ پختہ تھا لیکن خاصی قابلیت رکھتا تھا۔ یہ شخص توپ خانے پر مامور کیا گیا۔ (19)

کرنل وان کورٹ لینڈ بھی ایک فوجی عہدہ دار تھا۔ یہ شخص مخلوط النسل تھا۔ سکھوں کی حکومت کے زوال کے بعد یہ شخص سرکار انگریزی کے ملکی شعبہ ملازمت میں داخل ہوا اور غدر کے زمانے میں اس نے کارہائے نمایاں انجام دیئے۔

جنرل اوی تابیل نیپلس کا باشندہ تھا۔ ایران میں ملازمت کرنے کے بعد وہ وینٹورا کے آنے کے چند سال بعد لاہور آیا۔ یہ عام طور پر انتظامی خدمات پر مامور کیا جاتا رہا۔ سب سے پہلے راوی و چناب کے مابین کے قطعہ ملک رچنا دوآب پر مقرر کیا گیا۔ اس کے بعد کئی سال تک پنجاب کے شورش خیز قطعہ ضلع پشاور پر جہاں اس کے سخت دہشت ناک طور و طریقوں نے اس وحشی قطعہ میں رہ کر ایسا امن قائم کر دیا تھا جو اس ملک کی تاریخ میں پہلا موقع تھا۔ خیبر کے گرد و اطراف میں متمرد جرگوں میں اب تک اس کے نام سے لوگ دہشت کرتے ہیں۔ اس نے ان چور و قاتلوں کی تعداد کثیر کو شہر کی فصیل کے گرد سولیاں دی تھیں۔ اس کا سزا دہی کا طریقہ نہایت سخت تھا اور اگرچہ انگریزوں کا طریقہ اس ہیبت ناک اطالوی شخص کے مقابلے میں بہت نرم ہے لیکن پھر بھی جن لوگوں کو شمالی مغربی سرحد پر نظم و نسق قائم رکھنا پڑتا ہے۔ انہیں تعجیل و سخت گیری سے کام لینا پڑتا ہے۔ ہائی کورٹ اور بیرسٹر ججوں کے ذریعے سے آہستہ و طول طویل کارروائی کرنا ایسے مواقع پر حماقت ہے جہاں مجرم کا فوراً تعاقب کر کے اسے عین مصروفیات کی حالت میں گرفتار کر لیا جائے قبل اس کے کہ وہ پہاڑیوں میں پہنچ کر محفوظ ہو جائے۔ ایسی حالت میں سرسری اقرار جرم کے بعد کسی قریب کے درخت پر اسے لٹکا دینا مناسب ہے۔

پردیسیوں نے جو مہاراجہ کی ملازمت میں داخل تھے خصوصاً جنرل وینٹورا جو فوج خاص کی کمان پر مامور کیا گیا تھا اور کورٹ جو اس فوج کی کمان پر مقرر کیا گیا تھا جو فرانسیسی فوج کے نام سے موسوم تھی رنجیت سنگھ کے فوج کی تربیت اور قواعد میں بہت

کچھ ترقی دی- یہ لوگ فوجی مہمات کے موقعوں پر افواج کے سپہ سالار مقرر نہیں کئے جاتے تھے کیونکہ یہ خدمت برائے نام شہزادوں یعنی کھڑک سنگھ' شیر سنگھ یا دوسرے بڑے بڑے سرداروں کے تفویض کی جاتی تھی- مہاراجہ کے تمام اعلیٰ فوجی افسروں میں دیوان محکم چند سب سے اچھا تھا- یہ شخص ذات کا کھتری تھا- 1806ء سے 1814ء تک جب کہ اس کا انتقال ہوا تمام سکھ فوج کا درحقیقت یہی سپہ سالار اور مہاراجہ کے تمام فتوحات میں اس کا شریک تھا- اس کا پوتا رام دیال بھی جو 1820ء میں ہزارا میں مارا گیا بہت ہوشیار فوجی افسر تھا- اگر وہ جیتا رہتا تو ممکن ہے کہ بڑا نام پیدا کرتا- مشر دیوان چند نے جو ہندوؤں کی تجارت پیشہ ذات کا تھا اور اس وجہ سے سکھ اس سے نفرت کرتے تھے 1818ء میں ملتان فتح کیا- اس کے دوسرے سال اس کی سرکردگی میں کشمیر پر فوج روانہ کی گئی جسے کامیابی نصیب ہوئی-

سکھ سرداروں میں جو لوگ زیادہ ممتاز رہے وہ سردار فتح سنگھ کلیان والا' سردار نہال سنگھ اٹاری والا جس نے 1801ء سے 1817ء تک مہاراجہ کے تمام مہمات میں کارہائے نمایاں انجام دیئے- سردار فتح سنگھ اہلو والیہ جو مہاراجگان کپور تھلہ کے اجداد میں سے تھا- سردار بدھ سنگھ سندھانوالیہ اور اس کا بھائی عطر سنگھ تھے- عطر سنگھ سردار ہری سنگھ نلوا کے 1836ء میں جمرود میں انتقال کرنے کے بعد خالصے کا سورما مانا جاتا تھا- ہری سنگھ بڑا جری و بہادر سردار تھا- فوج والے اس سے بے انتہا الفت کرتے تھے گو مخالف کے لشکر کی تعداد کچھ ہی کیوں نہ ہو وہ ہمیشہ حملہ کرنے اور فتح حاصل کرنے پر آمادہ ہو جاتا تھا- اس کے بیٹے جواہر سنگھ میں جو میرا بڑا دوست تھا باپ کے تمام اوصاف موجود تھے- اس شخص نے بے قاعدہ سواروں کے دستے کے ساتھ بڑی عمدگی سے چیلیاں والا میں انگریزوں پر حملہ کیا جس کے باعث سے فتح آفت و مصیبت سے تقریباً مبدل ہو گئی- میں مہاراجہ کے اور بہت سے مشہور فوجی عہدہ داروں کے نام بیان کر سکتا ہوں جو اب تک پنجاب میں زبان زد خاص و عام ہیں لیکن انگریز قارئین کو اس سے دلچسپی نہ ہو گی-

رنجیت سنگھ اور اس کے جانشینوں کے زمانے کے فوج کی ترکیب کے بارے میں

پوری واقفیت تنخواہوں کی بر آورد اور قبض الوصول کے نقشوں سے ملتی ہے جو 1846ء میں پنجاب پر قبضہ کرنے کے بعد لاہور کے دفاتر سے دستیاب ہوئی۔ فوج خاص کی ترکیب جو جنرل وینٹورا کے زیر نگرانی تھی تمثیلاً بیان کی جاتی ہے۔ جنرل وینٹورا نے اس فتنہ و فساد سے تنگ آ کر جس میں یوماً فیوماً ترقی ہو رہی تھی اور آنے والی تباہی کے اندیشے سے جس کا پیش آنا لازمی تھا 1843ء میں استعفیٰ دے دیا۔ مہاراجہ کے مرنے کے بعد اس وقت تک اس نے استعفیٰ نہیں دیا جب تک اسے عملاً یہ ثابت نہ ہو گیا کہ مہاراجہ کے بعد سلک ملازمت میں رہنا اندیشہ ناک ہے۔ کیونکہ جنرل کورٹ کی فوج کی تین پلٹنوں نے اس پر اور خود جنرل کورٹ پر حملہ کیا اور وینٹورا کو مجبوراً اپنی اور اپنے دوست کی حفاظت کے لئے اپنے توپخانے سے کام لینا پڑا۔ فوج خاص کی ترکیب 1845ء میں جنگ ستلج سے قبل حسب ذیل تھی۔

فوج باقاعدہ پیادہ	3176
فوج باقاعدہ سوار	1667
توپخانہ مع 34 ضرب توپ	855
جملہ	5698

پیادہ فوج کے خاص پلٹن میں 820 سپاہی تھے۔ گورکھا پلٹن میں 707 سپاہی تھے۔ دیوا سنگھ کی پلٹن میں 839 سپاہی تھے اور شام سوتا پلٹن میں 810 سپاہی تھے۔

سوار فوج میں گرانڈیل رجمنٹ جس میں 730 نفر تھے۔ سہ نیم سوار ڈراگوں رجمنٹ جن کی تعداد 750 تھی اور اس میں شاہی محافظ دستہ شامل تھا جس میں 187 ادمی تھے۔

توپخانہ الٰہی کے پائے نام تھا جو اسی نام کے ایک مسلمان فوجی افسر کے زیر کمان تھا۔ یہ شخص سکھ فوج میں بہترین افسر توپ خانہ تھا۔

تمام فوج کی تنخواہ 96067 روپے ماہانہ تھی۔ (یہ رقم اس وقت 10 ہزار پاؤنڈ کے قریب تھی)۔

1839ء میں مہاراجہ کی وفات ہوئی۔ اس کے انتقال کے بعد فوج کی ترکیب میں بڑا

تغیر واقع ہوا۔ اس کے قوت و اقتدار نے بغاوت و شکوہ شکایت کو دبائے رکھا تھا گو خود اسے ایک مرتبہ گوبند گڑھ کے قلعے میں گورکھا پلٹن کے غصے سے پناہ لینی پڑی جو بقایا تنخواہ نہ ملنے کی وجہ سے بگڑ گئی تھی۔ اس کے جانشین اپنی جان کے جانے اور حکومت کے ضائع ہونے کے خوف سے فوج کی تعداد و تنخواہ میں اضافہ کرنے پر مجبور ہوئے یہاں تک، کہ یہ فوج ریاست کے لئے بار گراں ہو گئی کہ ان کو برداشت کرنا مشکل تھا اور ساتھ ہی دوسری سلطنتوں کے لئے مستقل خطرہ بن گئی۔

مہاراجہ کے انتقال اور اس کے جانشینوں کے وقت باقاعدہ فوج' پیادہ سوار اور توپ خانے کی تعداد و مصارف کا اندازہ گوشوارہ ذیل سے ہو گا۔

	تعداد	توپیں	اخراجات (روپیہ)
1839ء مہاراجہ رنجیت سنگھ	29168	1932	382088
1840-43ء مہاراجہ شیر سنگھ	50065	232	548603
1844ء راجہ ہیرا سنگھ	50805	282	682984
1845ء سردار جواہر سنگھ	72370	381	852696

جواہر سنگھ کے زمانے میں توپوں کی تعداد میں جو اضافہ ہوا وہ برائے نام تھا۔ نئی توپیں بہت کم ڈھالی گئیں مگر قلعوں پر کئی پرانی توپوں کو صیقل کر کے پھڑ پھیوں پر لگا دی گئی تھیں۔ بے قاعدہ سواروں کی تعداد میں باقاعدہ فوج کی مناسبت سے اضافہ نہیں ہوا۔ ستلج کی لڑائی کی ابتدا یعنی 1845ء میں اس کی تعداد 16292 تھی۔

تمام پنجاب میں فوج کی تعداد اس وقت حسب ذیل تھی۔

باقاعدہ پیادہ فوج	53756
باقاعدہ سوار	6325
بے قاعدہ سوار	16292
توپ خانہ	10968
شتری توپ خانہ	584
متفرق	827

جملہ 886662

توپیں' فیلڈ بانری 380- قلعوں کی توپیں جملہ 484- شتری توپ خانہ 308-

بے قاعدہ جمیعت فوج اور جاگیرداروں کی امدادی سوار فوج کا شمار مندرجہ بالا گوشوارے میں نہیں کیا گیا ہے کیونکہ اس کے متعلق صحیح مواد فراہم نہیں ہو سکتا۔ اندازاً" اس کی تعداد 30000 سپاہ کے قریب تھی۔ مہاراجہ کے فوجی معائنے کے مواقع پر اس فوج کا منظر خوشنما ہوتا تھا۔ اس میں بہت سے اشخاص آسودہ حال شرفاء تھے جو ان سرداروں کی اولاد یا اعزاء تھے جن کو فوج میں داخل کر دیا تھا وہی رئیس خبر گیری کرتے تھے اور ان لوگوں کی خوشنمائی سے ان کی وقعت بڑھتی تھی۔ ان کے لباس یکساں نہ تھے۔ بعض زرہ بکتر پہنتے اور سر پر خود رکھتے تھے جن میں طلائی کام اور پروں کا طرہ یا کلغی ہوتی تھی۔ بعض مختلف رنگوں کے مخملی لباس' گلابی یا زرد پگڑی اور طلائی کام کے پٹکے باندھے زرق برق لباس میں نظر آتے تھے۔ طلائی پٹکوں پر تلوار و باروت کا سینگڑا لگا رہتا تھا۔ سب لوگوں کی پشت پر چھوٹی سی گندہ گاومیش کی ادھوڑی کی گول سپر رہتی تھی۔ ان عظیم الشان شہ سواروں میں کچھ تو تیر کمان سے مسلح ہوتے تھے اور زیادہ توڑے دار بندوقوں سے جن سے خاصی قدر اندازی کرتے تھے۔

باقاعدہ سوار فوج جاگیرداروں کی امدادی سوار فوج کی طرح زرق برق نہ تھی۔ اس فوج کی انگریزی فوج کی نقل سرخ بانات کی چست وردی تھی جو ہندوستانی فوجوں پر کسی طرح زیب نہیں دیتی۔ ان کی تنخواہ کمپنی کی فوج کی تنخواہ سے مناسبتاً" معقول تھی۔ دس روپے ماہانہ پیادہ کو ملتے تھے لیکن انہیں کوئی وظیفہ نہیں دیا جاتا تھا۔ سواروں کو 25 روپے دیئے تھے کیونکہ انہیں گھوڑا اور سامان اپنا رکھنا پڑتا تھا۔

مہاراجہ رنجیت سنگھ کے ملکی انتظام کے بارے میں کسی طولانی بحث کی ضرورت نہیں کیونکہ میں پہلے ہی بیان کر چکا ہوں کہ غریب کاشتکار سے دام دام جو اس کے پاس تھا چھین لیا جاتا تھا۔ ظلم و زیادتی کی روک صرف اس اندیشے سے ہوتی تھی کہ کاشتکار بغاوت نہ کریں یا بددل و ناامید ہو کر اراضی ترک کر کے نہ چلے جائیں۔ اصل یہ ہے کہ سکھ زمیندار اس مرغی کو جان سے مارنا پسند نہ کرتے تھے جو سونے کا انڈا دیتی تھی

لیکن اس کے پر ایک ایک کر کے جہاں تک بس تھا نوچ لیتے تھے۔ بندوبست اراضی کے رپورٹ کے چند فقرات کے یہاں اعادہ کرنے سے ظاہر ہو گا کہ سرکار انگریزی کے عہدہ دار سکھوں کے اس طریقے کو کس نظر سے دیکھتے تھے۔ سرکار انگریزی کے عہدہ دار جس طرح پر انتظام کرتے تھے وہ سکھوں کے طریقے سے ایسا ہی مختلف ہے جیسا تاریکی سے روشنی اور اصل یہ ہے کہ اس طریقے میں سرکار انگریزی سخاوت کے برتاؤ میں زیادتی کر کے غلطی کرتی ہے کاشتکاروں سے اتنی نرمی برتی جاتی جس کے وہ مستحق نہیں۔ سرکار انگریزی بلا معقول وجوہ شکایت اس حصہ لگان میں بہت کچھ اضافہ کر سکتی ہے، جو وہ ہندوستان کے وسیع قطعات اراضی سے بطور محاصل وصول کرتی ہے۔ میں نے پنجاب کی رپورٹ نظم و نسق بابت 73-1872ء میں یہ تحریر کیا تھا کہ :

> "سکھ درحقیقت زمین کی پیداوار خام کا نصف حصہ تک لے لیا کرتے تھے اور اس کے علاوہ بہت سے ابواب تھے جو ان لوگوں کو ادا کرنے پڑتے تھے۔ اس کے برخلاف ہمارا مطالبہ کبھی چھٹے حصے سے زیادہ نہیں ہوا اور اکثر تو آٹھویں دسویں اور بارہویں حصے سے بڑھ کر نہیں ہوتا۔ بعض صورتوں میں تو اوسط پیداوار کے اوسط نرخ کے حساب سے پندرہواں حصہ بیس سے لے کر تیس سال تک معین کر دیا گیا ہے۔"

رنجیت سنگھ کے آخری زمانے میں چنگی کی آمدنی 16,37,000 روپے اور اخراجات وصول 1,10,000 روپے یا تقریباً 7 فی صدی تھے 48 مدات کے متعلق چنگی وصول کی جاتی تھی۔ تقریباً روزمرہ کی ہر قابل استعمال شے پر جس میں شوقینی اور ضرورت کا کوئی امتیاز نہیں کیا جاتا تھا۔ غرباء کے استعمال کی چیزیں مثلاً ایندھن' غلہ یا ترکاری پر کسی کم شرح سے چنگی وصول نہ کی جاتی تھی۔ وصول کرنے کا طریقہ نہایت آزاردہ تھا۔ تمام ملک میں چنگی کی چوکیاں قائم تھیں جہاں تجار کے ساتھ نہایت بدتمیزی اور جبر کا برتاؤ کیا جاتا تھا۔ سامان جب شہر میں داخل ہوتا تو اس پر محصول لیا جاتا۔ دوسری مرتبہ جب وہ دکان پر جاتا تو محصول ادا کرنا پڑتا تھا اور اگر اس کو پھر شہر سے باہر روانہ کیا جاتا تو تیسری

دفعہ اس پر محصول عائد کیا جاتا تھا۔

مسٹر ایبٹسن نے بندوبست کی رپورٹ سے اقتباسات ذیل اخذ کر کے اپنی قابل قدر رپورٹ مردم شماری بابتہ 1883ء میں شائع کئے ہیں اس سے نہایت وضاحت سے سکھوں کا طریقہ نظم و نسق معلوم ہوتا ہے اور چونکہ وہ مختلف اضلاع اور مختلف اسناد پر مبنی ہے اس لئے کسی شخص واحد کی رائے کے مقابلے میں اس سے زیادہ تر صحیح اندازہ اس طریقے کا ہو سکتا ہے۔ (20)

"1800ء سے لے کر 1820ء تک پشاور میں متواتر ہلچل مچی رہی۔ اس عرصے میں اس کے حکمران برابر بدلتے رہے۔ مگر ان میں کوئی بھی وحشی باشندوں پر حقیقی حکومت نہ کر سکا۔ پہاڑی جرگے اسی کا ساتھ دیتے جس سے سب سے زیادہ وصول ہوتا۔ سکھوں کا وقتاً فوقتاً اس سمت میں آنا وہاں کے باشندوں کے لئے بلائے جان تھا۔ ان کا وہاں پہنچنا اس امر کی علامت تھی کہ مال و متاع اور بیش قیمت اسباب کسی دوسری جگہ منتقل کر دیا جائے یہاں تک کہ دروازے اور کھڑکیاں تک نکال لی جاتی تھیں۔ عورتیں اور بچے کثیر تعداد میں گھربار چھوڑ کر بھاگ جاتے تھے اور ملک میں جلا وطنوں کی نوآبادیاں نظر آیا کرتیں۔ یہ نفرت زدہ دشمن جہاں تک آگے بڑھتے تمام قطعہ ملک کو برباد کرتے جاتے اور جو کچھ سامنے آتا اسے تاخت و تاراج کرتے اور کھیتوں اور زراعتوں تک کو تباہ کر دیتے۔ وادی کے دہانے سے لے کر دریائے سندھ تک شاید ہی کوئی موضع ایسا ہو جسے سکھ فوجی افسر نے نہ لوٹا ہو اور وہاں آگ نہ لگائی ہو۔ ان کی آمد سے اس درجہ خوف سمایا ہوا تھا کہ مائیں اپنے ضدی بچوں کو اس کا نام لے کر خاموش کرتیں۔ اس ملک میں آج بھی سفر کرتے وقت بوڑھے جن کی لمبی سفید داڑھیاں اور چہروں پر کثرت سے

زخموں کے نشان ہیں ان پہاڑیوں کی نشاندہی کرتے ہیں جہاں سکھ بھیڑ بکریوں کی طرح ان کو ہنکا دیتے تھے اور جوان لوگ اب تک ان مقامات کو بتا سکتے ہیں جہاں ان کے آبا و اجداد لڑ بھڑ کے گرے تھے۔ ان کے آنے سے تباہی و بربادی کا لوگوں کو اس درجہ یقین تھا کہ چند گاؤں جہاں راستوں کی دشواری سے پہنچ نہ ہوتی دشمن یا تو بالکل چھوڑ دیتے تھے اور یا مدافعت کی وجہ صرف ایک حصہ اس کا انہیں بہ ہیئت مجموعی کم برباد کر سکے تھے ناقابل تسخیر سمجھے جاتے تھے۔ سمجھتے تھے کہ ان کو ایک زبردست فتح نمایاں اپنے دشمن پر حاصل ہوئی۔"

"لیکن اس بدقسمت ضلع کے باشندوں کو سکھوں کے واپس جانے کے بعد کے وقفے میں بھی چین نصیب نہ ہوتا۔ اس امر کا اندازہ مشکل ہے کہ آیا سکھوں کے ان خوفناک مگر وقتیہ حملوں نے ان لوگوں کو زیادہ نقصان پہنچایا یا ان کی باہمی خانہ جنگیوں نے جو ایک دوسرے کے ساتھ دشمنی کرنے سے ہوا کرتی تھیں اور ایسے افعال یا تو اس وجہ سے سرزد ہوتے تھے کہ حملہ آور عنایت کا برتاؤ کریں یا اپنے ذاتی کینہ و انتقام لینے کے خیال سے وہ ان کے ساتھ ہو گئے کیونکہ جیسا پست حالت اقوام کی عموماً عادت ہوتی ہے۔ ان اغراض کے لئے ایک دوسرے کے ساتھ دغا کرنے اور جاسوس یا مخبر بن کر اپنے ہمسایوں کو سکھوں کے مظالم میں گرفتار کرا دینے میں ان لوگوں کو کوئی باک نہ ہوتا تھا اور اس درجہ کمینہ پن کرتے تھے کہ اگر ان کے آبا و اجداد زندہ ہوتے تو وہ ان افعال سے سخت تنفر کرتے۔ ہمکیاں کے سردار کو سکھوں نے جن شرائط پر اراضی دی تھی ان میں سے ایک شرط یہ تھی کہ ہر سال 20 آفریدیوں کے سر پیش کئے جائیں۔ بڈھا سردار

ان دغا بازیوں کو بیان کرنے سے نہیں شرماتا ہے جو اس شرط کی تکمیل کے لئے اسے بعض اوقات عمل میں لانا پڑتے تھے۔"

کرنل کراکرافٹ اور مسٹر ای ایل برینڈرتھ کی اضلاع راولپنڈی و جہلم کی بندوبست کی رپورٹ میں ہم کو معلوم ہوتا ہے کہ:

"صدیوں سے فتنہ و فساد پھیلا ہوا تھا اور بہت زمانہ قدیم سے اس ضلع پر یونانیوں سے لے کے افغانوں تک کے گروہ حملہ آور ہوا کرتے تھے۔ وہ آندھی کی طرح ایک باری نازل ہوتے ضلع کا صفایا کر جاتے تھے اور پھر غائب ہو جاتے۔ عارضی بربادی۔ لوٹے ہوئے مکانات اور ویران گھر وقتی بلائیں تھیں اور اب لوگ ان کو بھول گئے تھے۔ لیکن اصل میں یہ کام سکھ کارداروں کا ہی تھا جو لاہور سے اتنے دور تھے۔ نہ ان پر کسی قسم کی نگرانی قائم رہ سکتی تھی کہ انہوں نے گکھڑ اور راجپوت کو اس افلاس کی حالت پر پہنچا دیا۔ ان کی حکومت فوجی مطلق العنان جبریت تھی اور ان کا مقصد یہ تھا کہ ایسے تمام فرقوں و خاندانوں کو نیست و نابود کر دیا جائے جنہیں حکومت کا کوئی دعویٰ ہو اور اس لئے وہ گکھڑوں اور ان لوگوں کے مقابلے میں جو انتظام ملک میں ان کے شریک تھے سخت ترین تدابیر عمل میں لاتے تھے۔ اسی وجہ سے ان میں محض خانہ بدوشی ذلیل افلاس کی نوبت پہنچی یہاں تک کہ پہلے جو لوگ ان کے چرواہے تھے اب یہ لوگ خود ان کی رعایا اور کاشتکار ہیں۔ عام راستے عموماً غیر محفوظ تھے۔ مختلف اقوام کی حدود سے گزرنے کے لئے مسافروں اور قافلوں کو ان لوگوں کو دے دلا کر ان کے حرص و طمع کی آگ بجھانی پڑتی تھی بلکہ انہیں یہ گوارا کرنا پڑتا تھا کہ وہ لوگ انہیں لوٹیں اور عفت ریزی اور بدسلوکی کریں اور بعض اوقات تو بقول شخصے "جان بچی

تو لاکھوں پائے" کی نوبت ہوتی تھی۔"

اضلاع متوسط میں سکھوں کی حکومت کے بارے میں مسٹر ابیٹسن نے تحریر کیا ہے:

"اس صوبے کے وسط جنوب مغرب میں سکھوں کی حکومت زبردست اور سب جگہوں کی نسبت سے منصفانہ تھی۔ مسلوں کی نمود و ترقی سے پہلے در حقیقت اس کی حالت عام قتل و غارتگری کے نظام سے بہتر نہ تھی لیکن جب سکھوں نے ایک جمعیت کی حیثیت پیدا کر لی اور ان میں قومی جذبات پیدا ہو گئے۔ اگر اور کسی وجہ سے نہیں تو کم از کم خودغرضی کے خیال سے ان کی حکومت میں اعتدال قائم ہو گیا۔ تاہم جیسا کہ سر رابرٹ اجرٹن نے تحریر کیا ہے سکھ آبادی کا ہر فرد بشر سپاہی تھا اور ان کا ایک ہی مقصد تھا وہ یہ کہ ہندو مسلمان کاشتکاروں سے بغیر اس کے کہ انہیں کھیتوں کے چھوڑنے پر مجبور کیا جائے جہاں تک ہو سکے دام دام وصول کر لیا جائے۔ راجپوت جنہوں نے اپنی ذات کی تحقیر کے خیال سے ایک ایسے جتھے میں شریک ہونے سے انکار کیا تھا جس میں ذات پات کا لحاظ نہ تھا اور اونچی ذات والوں کی کوئی قدر نہ تھی ان کے نفرت و ظلم کا خصوصیت کے ساتھ نشانہ بن گئے تھے۔ ان کی عدم شرکت مخالفت تصور کی جاتی تھی اور جس کسی کے پاس نام چار کو دولت یا اسے کوئی اقتدار حاصل تھا اس کو بے رحمی سے پامال کیا جاتا تھا۔ اسی طریقے کو مدنظر رکھتے ہوئے جس میں کاشتکاروں کی بہت ہی کم حوصلہ افزائی ہوتی ہے جہاں تک ان سے ہو سکا انہوں نے زراعت میں ترقی و توسیع کی لیکن انہوں نے کاشتکار سے بالاتر کسی کو نہ مانا۔ انہوں نے کوئی حقوق ملحوظ نہ رکھے اور نہ کبھی ایسی جائداد کو تسلیم کیا جہاں ایسے

حقوق تسلیم کرنے سے ان کے مالی فوائد پر مخالف اثر پڑتا۔ جو شخص سکھ اور اس لئے سپاہی نہ ہوتا اس کی قدر اس حیثیت سے کی جاتی کہ اس سے لگان وصول کیا جا سکے گا۔ ان کی حکومت اس لحاظ سے بلا رو رعایت عادلانہ تھی کہ وہ سب کے ساتھ یکساں جبر و تعدی کرتے تھے۔"

اب ہمیں یہ دیکھنا چاہئے کہ راجپوت قوم کی پہاڑیوں میں سکھوں کی حکومت کس قسم کی تھی۔ کوتاہ اندیش راجاؤں نے اپنے خانگی تنازعات کی وجہ سے گورکھوں کو اپنے ہاں بلا لیا تھا اور جیسا کہ مینڈک اور بگلے کی حکایت مشہور ہے اس وحشی گروہ نے کانگڑا اور شملے کی پہاڑیوں میں ایک اودھم مچا رکھا تھا یہاں تک کہ تین برس کے فتنہ و فساد سے کانگڑا کی خوشنما وادی جنگل بن گئی اور شہر ویران ہو گئے۔ ایسے وقت میں مہاراجہ رنجیت سنگھ اور سکھوں کو مدد کے لئے طلب کیا گیا اور گورکھا ٹڈی دل کی طرح سے بھاگ گئے۔ لیکن مہاراجہ کے سکھ کاردار کچھ ان سے بہتر نہ تھے۔ مسٹر بارنس نے ضلع کانگڑا کی رپورٹ بندوبست اراضی میں تجویز کیا ہے کہ:

"کاردار عدالت و نیز مال کا عہدہ دار ہوتا تھا۔ لیکن اس کی مالی خدمات زیادہ اہم تھیں فیصلے جو رشوت لینے کے بعد صادر کئے جاتے تھے یا ناکافی پولیس ایسی خرابیاں تھیں گو کہ ان کی جانب توجہ بھی ہو تو بھی نظر انداز کی جا سکتی ہیں۔ لیکن اگر کاردار کے محاصل شاہی کی ادائی میں کچھ بقایا رہ جائے تو حکومت کے ہاتھ سے اس کا بچاؤ اور معافی بالکل ناممکن تھی۔ اس لئے اس کی زندگی کا فریضہ اعظم یہ تھا کہ جہاں تک ممکن ہو کاشت میں وسعت دے اور اسی کے ساتھ کاشتکار کو جتنا ہو سکے مفلس بنائے رکھے۔ لوگوں پر اتنا بار ڈالا جاتا تھا جتنا کہ وہ زیادہ سے زیادہ برداشت کر سکتے تھے اور تحمل کی حدیں گزر گئی تھیں۔ دیسی تحصیلدار ایسا بیوقوف نہ تھا کہ کاشتکار کو بالکل مٹا دے لیکن مٹا

دینے کے سوا اور کسی طرح کی کوتاہی نہیں کرتے۔ ان کی پالیسی
یہ ہوتی ہے کہ سوائے اس مقدار کے جو کاشتکار کے آزوقے کے
لئے کافی ہو جھنجی کوڑی اس کے پاس نہ بچے۔ لگان عموماً یکساں تھا
اور اس کا بار جو یقیناً نرمی اور انصاف کے اصول سے گراں تھا
سب کو یکساں برداشت کرنا پڑتا تھا۔"

دیوان ساون مل ملتان' لیہ' ڈیرہ غازی خاں' خان گڑھ اور جھنگ کا صوبہ دار
مہاراجہ کے تمام عمال سے بہتر تھا۔ لیکن اوبراین جس نے اس کے ایک ضلع مظفر گڑھ
کا بندوبست کیا تھا اس کے متعلق یہ تحریر کیا ہے کہ :

"دیوان ساون مل کی حکومت اس کے ماقبل کی حالت سے
بہت اچھی تھی۔ اس کی اصل غرض و غایت دیوان کے لئے
دولت فراہم کرنا تھا۔ تعمیرات کا کام' داد رسی جان و مال کی حفاظت
ضمنی امور تھے اور صرف اسی وجہ سے ان پر زور دیا جاتا تھا کہ
بغیر ان کے زراعت کو فروغ اور مالگزاری کی رقم ادا نہ ہو سکتی
تھی۔ جب کوئی شخص اس کے عائد کردہ ابواب پر غور کرتا ہے
اور یہ دیکھتا ہے کہ وہ کس طرح محصولات وصول کر کے لوگوں کو
خیرات دیتا ان کے مراسم مذہبی ادا کرتا اپنے نزدیک ایک معقول
رقم مساکین و برہمنوں کو دیتا اور باقی اپنی جیب میں داخل کر لیتا۔
اپنے وعدوں کے ایفاء کے لئے لوگوں سے کس طرح رقم اینٹھتا
اور اپنے عہدہ داروں کو رشوت لینے کی ترغیب دیتا اور پھر وہ رقم
خزانے میں داخل کرا لیتا تو جو وقعت اس کے تاریخی حالات کے
پڑھنے سے ہوتی ہے اس سے بدرجہا کم اس مشاہدے کے بعد
ہوتی۔" (21)

ایسے اقتباس کی تائید میں اور سینکڑوں اقتباس انگریزی عہدہ داروں کے لکھے
ہوئے پیش کئے جا سکتے ہیں جنہیں پنجاب کے الحاق کے 42 سال بعد تک پنجاب کے

زخم کے اندمال کی کوشش اور اس مدتوں کے اجڑے ہوئے ملک میں دوبارہ خوش حالی' آسودگی اور امن چین پھیلانے کی تدابیر عمل میں لانا پڑیں۔ لیکن ہندوستان اور انگلستان کے ان لوگوں کے لئے صرف اتنے ہی اقتباس کا نقل کر دینا سبق آموز ہے جو دنیا کو یہ باور کرانا چاہتے ہیں کہ انگریزی حکومت سخت گیر و جابر ہے اور جو ہماری قوم کے ہندوستان میں روشن خیالی سے حکومت کرنے کی عظمت کو قابل سرزنش و شرم تصور کرتے ہیں۔ انتظام کرنے والے اس سبق کو پڑھ سکتے ہیں جو کام ہم نے ہندوستان میں کیا ہے وہ ایسے جلی حروف میں ہے کہ تمام آنکھیں سوائے ان کے جو آنکھ ہی بند کر لیں اور دیکھنا نہ چاہیں اسے دیکھ سکتے ہیں۔ فتنہ و فساد' قحط اور لوٹ مار کی بجائے باقاعدگی اور انصاف کا دورہ ہوا جس کی رو سے ہر شخص اپنی املاک سے مستفید ہوتا اور کوئی اسے ڈرا دھمکا نہ سکتا۔ سکھ 12 شلنگ میں سے 6 شلنگ لگان وصول کرتے تھے۔ سرکار انگریزی صرف دو یا ایک وصول کرتی ہے۔ آبادی بہت بڑھ گئی ہے اور زراعت مناسبتاً" روبہ ترقی ہے۔ اگر انگلستان آج اپنا دست حفاظت کھینچ لے اور اگر "وہ برطانیہ کی جے" کے خاتمے کا اعلان کر دے اور ہندوستان سے علیحدگی اختیار کر کے اپنے فرائض و حقوق سے بزدلانہ طور پر دستبردار ہو جائے تو کیا کوئی سمجھ دار اس امر میں شک کرے گا کہ فتنہ و فساد پھر عود کر آئے گا۔ سکھ' مرہٹے اور افغان جان توڑ لڑائی میں پھر مصروف ہو جائیں گے۔ حملہ آوروں کے تیغ و سنان پر بچے بلند کئے جائیں گے اور پنجاب کی دوشیزہ لڑکیاں ہوس پرستوں کا شکار بنیں گی اور دہلی اور لاہور کی فصیلیں آتش زدہ مواضعات کی روشنی سے جگمگائیں گی۔

اس کے ابتدائی فتوحات

مہاراجہ رنجیت سنگھ مہان سنگھ کا بیٹا تھا جو سکر چاکیا ریاست کا ایک منچلا اور دلیر سردار تھا۔ رنجیت سنگھ 1780ء میں پیدا ہوا۔ اس کا خاندان سانسی جاٹ ذات کا تھا جس کا قریبی رشتہ سندھانوالیہ سے تھا۔ رنجیت سنگھ کی وفات کے وقت سندھانوالیہ خاندان دریائے بیاس کے شمال کے تمام سکھ سرداروں میں نہایت زبردست تھا اور اب بھی پنجاب میں سب سے بلند مرتبے پر ہے گو اب اس خاندان میں ممتاز اشخاص موجود نہیں ہیں۔ دوسرے سکھوں کی طرح سندھانوالیہ خاندان بھی راجپوت نسل سے ہونے کا مدعی ہے لیکن سانسیوں کی ذلیل اور چور قوم سے بھی اس کا قریبی تعلق ہے اور ان کا آبائی وطن راجہ سانسی جو امرتسر سے 5 میل کے فاصلے پر ہے اسی نام سے موسوم ہے۔

سکر چاکیا اور سندھانوالیہ خاندان کا بانی بدھا سنگھ ایک دلیر لٹیرا تھا۔ جسے لوٹ مار میں بہت کامیابی حاصل ہوئی تھی۔ یہ شخص جب اپنی مشہور ابلق گھوڑی دیسی پر سوار ہوتا تو گرد و اطراف کے ملک میں ہلچل مچا دیتا۔ تقریباً چالیس مرتبہ اسے برچھے' توڑے دار بندوق یا تلوار کے زخم لگے اور بالاخر بستر مرگ پر پڑ کر 1718ء میں ایک ایماندار شخص کی سی موت مرا۔ اس کے دو بیٹے چندا سنگھ و نودھ سنگھ بھی اپنے باپ کی طرح منچلے تھے۔ 1730ء کے قریب انہوں نے سکر چاکیا موضع کی از سرنو تعمیر کی جو امرتسر کے ضلع میں واقع ہے اور سکھوں کی ایک جانباز سواروں کی جماعت فراہم کر کے اس کے گرد و اطراف و گوجرانوالہ میں بہت سے موضعوں پر قبضہ کر لیا۔ چندا سنگھ سے سندھانوالیہ سردار پیدا ہوئے اور رنجیت سنگھ کا مورث اعلیٰ براہ راست نودھ سنگھ تھا۔ نودھ سنگھ افغانوں سے لڑتا ہوا مجیٹھیا میں مارا گیا۔ اس کے بعد صرف ایک لڑکا چڑت سنگھ باقی رہا تھا جس کی عمر 5 سال کی تھی۔ یہ آخر میں بہت طاقتور سردار ہوا اور

سکر چاکیا مسل کی سرکردگی اپنے ہاتھ میں لی۔ سردار جسا سنگھ اہلو والیہ اور بھنگی ریاست کی امداد سے اس نے لاہور کے افغان صوبہ دار عبید خان کو اس کے مستقر گوجرانوالہ سے نکال دیا اور اس کی تمام توپوں اور ساز و سامان پر قبضہ کر لیا۔ اس نے اہلووالیہ سردار جسا سنگھ کی مدد کی جس پر رام گڑھیا والوں نے حملہ کیا تھا اور اس کا مال لوٹ لیا تھا چنانچہ اس کی مدد سے جسا سنگھ نے رام گڑھیا کے تمام علاقے پر قبضہ کر لیا۔ جموں کے راجہ رنجیت دیو کے مقابلے پر اس کے فرزند برج راج دیو کی طرف داری کی غرض سے وہ مہم لے کر گیا لیکن اپنی توڑے دار بندوق پھٹنے کی وجہ سے ہلاک ہوا۔

اس کا بڑا بیٹا مہان سنگھ اس کی جگہ ریاست کا فرمانروا ہوا اور اس نے ریاست کے اقتدار و مقبوضات میں بہت کچھ اضافہ کیا جب اس کے باپ کا انتقال ہوا تو ابھی اس کی عمر 11-12 سال ہی کی تھی اور اس وجہ سے بڑی مصیبت کا سامنا تھا۔ راجپوت راجہ نے بھنگیوں کے سرغنہ سردار جھنڈا سنگھ کو اپنی مدد کے لئے طلب کیا تھا اور اس کے برخلاف کنہیا والے اس کے باغی فرزند کی مدد پر تلے ہوئے تھے۔ چڑت سنگھ کی بے وقت موت کی وجہ سے احتمال تھا کہ دشمن کو فتح حاصل ہو جائے لیکن اس کی بیوہ اور سردار جے سنگھ نے جو کنہیا خاندان کا سرغنہ تھا ایک مہتر کو رشوت دے کر جھنڈا سنگھ کو مروا ڈالا۔ جھنڈا سنگھ پر اس وقت گولی چلائی گئی جبکہ وہ اپنے چند ہمراہیوں کے ساتھ لشکر میں گھوڑے پر سوار گشت کر رہا تھا۔ اس کی موت سے اگلے تنازع کا خاتمہ ہو گیا اور دونوں مقابل فوجیں جموں سے واپس چلی گئیں۔

1774ء میں اپنے باپ کی وفات کے ایک سال بعد مہان سنگھ نے جیند کے راجہ گجپت سنگھ کی لڑکی راج کور سے شادی کی۔ چھ سال کے بعد اس کے بطن سے مہاراجہ رنجیت سنگھ پیدا ہوا۔ یہ امر قابل ذکر ہے کہ اس شادی کے بعد ہی فوراً ناچاقیاں پھیل گئیں جو گویا اس بچے کی آئندہ عظیم الشان زندگی کے لئے پیش خیمہ تھیں۔ مہان سنگھ ہمراہیوں کے جم غفیر کے ساتھ جیند آیا تھا اور پھلکیان خاندان کے تمام سردار اس سے ملنے کو وہاں جمع ہوئے تھے عین شادی کی تقریب کے موقعے پر جیند اور نابھے کے سرداروں میں باہم تنازع ہو گیا۔ یہ نزاع ایک گھاس کے رمنے کے

متعلق تھی۔ جو نابھے والوں کی ملک تھا اور اس میں سے براتیوں کو اپنے گھوڑوں کے لئے گھاس کاٹنے کی اجازت دی گئی تھی۔ نابھے کے سردار کے کارکن نے براتیوں پر حملہ کیا جس سے لڑائی ہو پڑی جیند کے راجہ کو جو لڑکی کا باپ تھا اس معاملے سے اپنی عزت میں بٹہ لگنے کا رنج پہنچا اگرچہ اس نے شادی کی تقریب ختم ہونے تک خاموشی اختیار کی لیکن انتقام کا مضبوط ارادہ کر لیا۔ شادی ختم ہوتے ہی اس نے نابھے کے سردار حمیر سنگھ کو فریب سے قید کر کے اس کے ملک پر حملہ کیا اور اس کے بڑے حصے پر قبضہ کر لیا چنانچہ اب تک سنگرور کی جائداد پر قبضہ قائم ہے۔

اس کے بعد کئی سال تک نوجوان مہان سنگھ کے متعلق کوئی بات سننے میں نہیں آئی۔ 1780ء میں جب کہ غالباً وہ جوان ہو گیا ہو گا اس کا نامور بیٹا پیدا ہو چکا تھا۔ جموں کا راجپوت راجہ فوت ہوا اس کے بعد مہان سنگھ نے اپنی کارروائی ایک مشہور دغا سے شروع کی راجہ برج لال دیو اپنے باپ کا جانشین ہوا اس نے مہان سنگھ سے دوستی پیدا کی اور بھائی چارے کے طور پر پگڑی بدلی۔ اس کی دوستی پر اعتماد کر کے اس نے چاہا کہ بھنگی سرداروں سے اپنا ملک واپس لے۔ اس نے کنہیا والوں کو جن کا وہ باجگذار تھا اپنی مدد کے لئے بلایا۔ پہلے تو ان لوگوں نے منظور کر لیا لیکن پھر فوراً اس کو چھوڑ کے بھنگیوں کی طرف ہو گئے اور ان سے مل کے جموں پر حملہ کرنے کی تجویز کی۔ راجہ نے اپنے نئے رفیق مہان سنگھ سے مدد طلب کی۔ وہ فوراً شمال کی طرف روانہ ہوا اور کنہیا والوں کے لشکر پر دھاوا کر دیا لیکن نقصان کے ساتھ پسپا کر دیا گیا۔ مہان سنگھ کو اطاعت قبول کرنی پڑی اور راجہ مجبوراً کنہیا سردار حقیقت سنگھ کو پچاس ہزار روپے خراج دینے پر مجبور ہوا۔ چند ماہ کے بعد جب خراج کی رقم بقایا میں پڑ گئی تو حقیقت سنگھ نے مہان سنگھ کو اپنے ساتھ شریک کر کے جموں پر حملہ کرنے پر راضی کر لیا۔ اور یہ قرار پایا کہ مال غنیمت باہم تقسیم کر لیا جائے گا۔ مہان سنگھ نے اس کو منظور کر لیا لیکن وہ دوسرے راستے سے ہو کے پہلے سے جموں پہنچ گیا اور اس نے دیکھا کہ اس میں تنہا حملہ کرنے کی قوت ہے تو اس نے دوستانہ عہد کو فراموش کر دیا اور کنہیا سردار کے ساتھ جو معاہدہ ہوا تھا اسے بھی بالائے طاق رکھ کر شہر پر دھاوا کر دیا محلات و آبادی میں

آگ لگا دی اور حقیقت سنگھ کے آنے سے پہلے ہی مال غنیمت لے کر چلتا ہوا۔ حقیقت سنگھ کا برافروختہ ہونا واجبی تھا لیکن اس میں بدلہ لینے کی سکت نہ تھی اس لئے خاموش ہو رہا۔ اور کچھ عرصے بعد اس کا انتقال ہو گیا۔ جموں کی بربادی سے کنھیا والوں کی بڑی ریاست اور ان کے سردار جے سنگھ کی آتش غضب مہان سنگھ کے برخلاف بھڑک اٹھی اور انہوں نے اس پر ایسی شدت سے حملہ کیا کہ اسے اپنے ملک کے ایک بڑے قطعے کو کچھ عرصہ کے لئے چھوڑ دینا پڑا اور معافی مانگنا پڑی۔ اس کی اس درخواست کو اس وقت تک منظور کرنے سے انکار کیا گیا جب تک کہ وہ جموں کی لوٹ کا مال واپس نہ دے لیکن سکر چاکیا سردار نے مصمم ارادہ کر لیا کہ وہ ایسا نہ کرے گا۔ اب اس نے کنھیا والوں کے مقابلے میں دوسرے علاقوں سے اتحاد کیا جس میں رام گڑھیا کا سردار جسا سنگھ جس کا ملک چند سال قبل چھین لیا گیا تھا اور راجہ سنسار چند کانگڑے کا کٹوچھ راجہ شریک تھا۔ ان سب نے متحد ہو کے بٹالے کے قریب جو کنھیا والوں کا صدر مقام تھا ان سے جنگ کی اور بڑے نقصان کے ساتھ انہیں شکست دی۔ یہ واقعہ 1784ء کا ہے سردار جے سنگھ اس نقصان اٹھانے کے بعد پھر نہ پنپ سکا۔ اس نے کٹوچھ راجہ کو کانگڑہ اور جسا سنگھ کو اس کا تمام مقبوضہ ملک واپس کر دیا اور مہان سنگھ کے بیٹے رنجیت سنگھ کے ساتھ اس نے اپنے بیٹے گر بخش سنگھ کی نابالغ بیٹی مہتاب کور کی شادی کر دی۔ اس لڑکی کا باپ گر بخش سنگھ بٹالے کی لڑائی میں مارا گیا تھا۔

مہان سنگھ کے مختصر زمانہ حیات کی سازشوں اور مظالم کا ذکر طولانی ہے۔ وہ ہمیشہ اپنے ہمسایوں اور حریفوں سے برسرپیکار رہتا خصوصاً بھنگیوں سے گو اس گروہ کے ایک زبردست سردار صاحب سنگھ نے اس کی بہن سے شادی کی تھی۔ اپنے مرنے سے پہلے دو سال تک وہ اپنے بہنوئی سے اکثر لڑتا بھڑتا رہا اور اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ صاحب سنگھ کے علاقے گجرات کا ایک شہر اس سے چھیننا چاہتا تھا جو خود اس کے مستقر گوجرانوالہ سے 30 میل شمال کے جانب واقع تھا۔ وہ صاحب سنگھ کے قلعے سوہدرہ کا محاصرہ کئے ہوئے تھا کہ سخت بیمار ہو گیا کرم سنگھ دولا چنیوٹ کا ایک بھنگی سردار صاحب سنگھ کی مدد کے لئے فوراً" روانہ ہو گیا تھا۔ مہان سنگھ نے فوراً" اس پر حملہ کر دیا لیکن

جنگ کے اثناء میں وہ اپنے ہاتھی پر بے ہوش ہو گیا اور فیلبان اپنے آقا کو یہاں سے واپس لے گیا۔ سردار کی عدم موجودگی کی وجہ سے سکر چاکیا فوج بھاگ کھڑی ہوئی اور محاصرہ اٹھا لیا گیا خود مہان سنگھ گوجرانوالہ چلا گیا اور یہاں پہنچنے کے تین دن بعد 1792ء میں صرف ستائیس سال کی عمر میں فوت ہو گیا۔

اگرچہ باپ کی موت کے وقت رنجیت سنگھ کی عمر صرف 12 سال کی تھی لیکن وہ اپنے باپ کے ساتھ لڑائی پر جایا کرتا تھا اس زمانے میں سکھ لوگ نہایت کم عمری ہی میں فن جنگ سے واقفیت حاصل کیا کرتے تھے۔ 1790ء میں اس کے باپ نے منچلر قلعے کا محاصرہ کیا تھا۔ یہ قلعہ چٹھہ جرٹ کے ایک مسلمان زبردست سردار غلام محمد کا تھا۔ جس کے ساتھ وہ ہمیشہ برسرپیکار رہتا تھا۔ غلام محمد کا چچا حشمت خاں اس ہاتھی کے اوپر چڑھ گیا جس پر رنجیت سنگھ بیٹھا تھا۔ وہ قریب ہی تھا کہ اس کا خاتمہ کر دے اس واقعے سے ہندوستان و انگلستان کی تاریخ میں ایک اہم انقلاب واقع ہو جاتا۔ لیکن رنجیت سنگھ کے ایک ساتھی نے اس کا کام تمام کر دیا باپ کے مرنے کے بعد اگر اس کی ساس سدا کور کا واسطہ نہ ہوتا تو رنجیت سنگھ کے تمام امیدوں کا خون ہو جاتا۔ یہ عورت نہ صرف بڑی قابل تھی بلکہ سردار گر بخش سنگھ کی بیوہ اور وارث کی حیثیت سے وہ کنہیا مسل کی سرغنہ بن گئی تھی۔ اس نے پورا ارادہ کر لیا تھا کہ حتی الامکان تمام اقتدار اپنے ہاتھ میں رکھے اور دونوں ریاستوں کنہیا اور سکر چاکیا کے افواج کو اپنے تمام حریفوں کے زور توڑنے کے لئے کام میں لائے۔ سب سے پہلے اس نے رام گڑھیا والوں سے بدلہ لینا چاہا جو بٹالے کی لڑائی میں شریک تھے جس میں اس کا شوہر مارا گیا تھا 1796ء میں اپنی فوج کے ساتھ نوجوان رنجیت سنگھ کی فوج کو شریک کر کے اس نے رام گڑھیا والے سردار جسا سنگھ پر دریائے بیاس کے قریب اس کے قلعہ میانی کا محاصرہ کیا۔ جسا سنگھ نے کچھ عرصے تک تو مدافعت کی لیکن سامان خوراک اور پانی ختم ہو گئے تو امرتسر کے بڑے پجاری صاحب سنگھ بیدی سے امداد کی استدعا کی۔ بیدی نے سدا کور کے پاس پیغام بھیجا کہ محاصرہ اٹھا لیا جائے لیکن سدا کور نے یہ دیکھ کر کہ دشمن اس کے قبضے میں آ گیا ہے اس حکم کی تعمیل سے انکار کیا۔ جسا سنگھ نے دوبارہ بڑے پجاری کے پاس پیغام بھیجا

جس کے جواب میں پجاری نے کہلا بھیجا کہ وہ لوگ میرا کہنا نہیں مانتے مگر خدا تمہاری مدد کرے گا۔ اسی شب بیاس میں اس درجے کا سیلاب آیا کہ کنہیا والوں کے لشکر کے سپاہی، گھوڑے اور اونٹوں کی کثیر تعداد اس میں بہہ گئی سدا کور اور رنجیت سنگھ بڑی مشکل سے جانبر ہوئے اور گوجرانوالہ ہٹ آئے۔ معلوم ہوتا ہے کہ اس مہم نے اس نوجوان سردار کی جنگجو طبیعت کو چونکا دیا اور اس نے مصمم ارادہ کر لیا کہ اپنی ماں و ساس کی اتالیقی سے آزاد ہو کر خودمختار ہو جائے۔ اپنی ماں سے تو اس نے فوراً ہی چھٹکارا حاصل کر لیا۔ یہ عورت نہایت آوارہ تھی۔ اس کے آشناؤں میں سب سے بڑا دیوان لکھپت رائے تھا جو رنجیت سنگھ کی نابالغی کے زمانے میں ریاست کا منتظم تھا رنجیت سنگھ نے اس شخص کو ایک خطرناک مہم پر کیتھل روانہ کیا جہاں وہ مارا گیا۔ بعض کا تو خیال ہے کہ رنجیت سنگھ کے ایماء سے ایسا ہوا۔ اس کی ماں غائب ہو گئی۔ بعض لوگوں کا بیان ہے کہ خود اس کے بیٹے نے اپنے ہاتھ سے اس کو مار ڈالا اور بعض کا خیال ہے کہ اسے اس کے اشارے سے زہر دے دیا گیا لیکن یہ روایتیں اس کی طبیعت کی افتاد کے خلاف ہیں کیونکہ لڑائی کے موقعوں کے سوا دوسرے مواقع پر سختی و جبر کرنا بالکل اس کے مزاج کے خلاف تھا اور اس کو عورتوں کی عصمت و عفت کا کچھ ایسا خیال نہ تھا۔ مہتاب کور اپنی ناشدنی سازشوں کی وجہ سے غالباً کسی قلعے میں قید کر دی گئی جہاں کچھ عرصے کے بعد وہ مر گئی۔

رنجیت سنگھ کو اپنی ساس سدا کور سے گلو خلاصی حاصل کرنا ذرا دشوار امر تھا اور ابتدا میں اس وجہ سے وہ اپنے میں اس کی قوت نہ پاتا تھا اس نے کوئی کوشش اس بارے میں نہیں کی۔ اس نے رنجیت سنگھ کو کسی قسم کی تعلیم نہیں دی تھی بلکہ چاہتی تھی کہ لہو و لعب و عیاشی میں گرفتار رہے اس کی ترغیب دیتی رہتی تھی۔ ہندوستان میں نابالغ شہزادوں کے ولی جنہیں اپنا اقتدار قائم رکھنا اور حقوق غصب کرنا مدنظر رہتا ہے عموماً ان کو ایسے مشغلوں میں پھنسا کے ان کی عافیت اور زندگی کو برباد کر دیتے ہیں۔ آئے دن ماتحت دیسی ریاستوں میں یہی نقشہ نظر آتا ہے اور اس کے نتائج اسی قسم کے ہوتے ہیں۔ یہ سرکار انگریزی کے عہدیدار مقامی (ریذیڈنٹ) کی ہوشیاری اور جرات کی

سخت آزمائش ہے اور سرکار انگریزی کا صیغہ خارجیہ بعض اوقات بڑی کمزوری سے کام لیتا ہے۔

رنجیت سنگھ خوش قسمتی سے ایسا ہوشیار تھا اس پر اس قسم کی بدعنوانیوں اور عیاشیوں کا مستقل اثر نہ پڑ سکتا تھا۔ اس کی جسمانی قوت ایسی تھی کہ عرصے تک ان بے اعتدالیوں کے ضرر سے محفوظ رہا۔ خاص کار نمائی کا موقعہ اس وقت پیش آیا جب کہ ہندوستان کے مشہور حملہ آور احمد شاہ کے پوتے شاہ زمان نے اس خیال سے جنوب کے جانب لشکر کشی کی اگر ممکن ہو تو اپنے آبا و اجداد کا ملک جو ہاتھ سے نکل گیا تھا واپس لے۔ 1793ء میں شاہ زمان تیمور کا جانشین ہوا دو سال کے بعد اس نے پنجاب پر حملہ کیا لیکن دریائے جہلم کے آگے جنوب کی سمت نہ بڑھ سکا۔ لیکن 1797ء اور اس کے دوسرے سال اسے زیادہ کامیابی نصیب ہوئی سکھوں نے زیادہ مزاحمت نہ کی اور لاہور پر اس کا قبضہ ہو گیا۔ سکھوں نے اس موقع پر حسب عادت چالاکی سے میدان مصاف میں جنگ کرنے سے گریز کر کے افغانی ساقہ لشکر کو پریشان کیا اور جو لوگ پیچھے رہ گئے تھے ان کو روک کے ساز و سامان لوٹنے لگے۔ بعض سکھ سرداروں نے مصالحت کو مناسب سمجھ کے لاہور جا کر شاہ زمان کی اطاعت قبول کر لی۔ رنجیت سنگھ نے افغانی حملے سے موقع پا کے جنوب ستلج میں لوٹ مار شروع کر دی تھی۔ اظہار اطاعت کے لئے اپنا ایلچی لاہور روانہ کیا۔ خانگی جھگڑوں کی وجہ سے جب شاہ زمان کو افغانستان واپس جانا پڑا رنجیت سنگھ لاہور کی طرف پلٹا کیونکہ لاہور کے لے لینے کا یہ عمدہ موقعہ تھا۔ دریائے جہلم کو سیلاب کے وقت عبور کرنے میں افغان بادشاہ کی بارہ توپیں غرق ہو گئیں اسے چونکہ اس کے نکالنے کی مہلت نہ تھی اس لئے اس نے رنجیت سنگھ سے جو اس وقت اس قطعہ ملک کا مالک تھا یہ وعدہ کیا کہ اگر وہ توپیں برآمد کر کے اس کے پاس بھیج دے تو اسے لاہور کا شہر و ضلع اور راجہ کا خطاب عطا کیا جائے گا۔ رنجیت سنگھ نے بخوشی اس کام کی انجام دہی قبول کی اور اس میں ایک حد تک کامیاب بھی ہوا۔ منجملہ 12 کے 8 توپیں اس نے نکلوا کے پشاور بھیج دیں اور زمان شاہ نے اپنا وعدہ پورا کیا۔ شاہی خطاب کا عطیہ محض بے سود تھا۔ سکھ سردار کو اپنے قوت بازو سے قبضہ حاصل

کرنا پڑا۔

شہر لاہور تقریباً 2 ہزار سال سے شاہی دارالسلطنت ہوتا چلا آتا تھا۔ سکھ سرداروں کو ہمیشہ اس پر قبضہ کرنے کی خواہش ہوئی۔ اور اٹھارویں صدی میں متعدد بار اس پر ان کا قبضہ ہوا اور جاتا رہا۔ 1764ء میں لہنا سنگھ اور گوجر سنگھ نے جو دو تہور شعار بھنگی سردار تھے بالاخر اس پر قبضہ کر لیا۔ ایک اندھیری رات میں یہ لوگ بدرو کے راستے سے اندر داخل ہوئے اور نائب صوبہ دار کو ناچ کی محفل میں گرفتار کر لیا۔ صبح ہونے تک تمام شہر پر ان کا قبضہ ہو گیا۔ اس شہر کو انہوں نے تین حصوں پر تقسیم کیا ایک حصہ سردار سوبھا سنگھ کنہیا کو ملا جو اس سازش میں شریک تھا گو وہ عین موقع پر دیر میں پہنچا۔ تین سال بعد احمد شاہ نے جب آخری مرتبہ پنجاب پر چڑھائی کی تو اس نے لاہور کے لئے جنگ کرنا مناسب نہ سمجھا اور لہنا سنگھ کا قبضہ بحال رکھا۔ جب رنجیت سنگھ کو لاہور کا شہر عطا ہوا تینوں سرداروں کی اولاد شہر پر قابض تھی۔ لیکن لہنا سنگھ اور سوبھا سنگھ کے فرزند حماقت اور عیاشی میں سخت مبتلا تھے۔ ان میں سے صرف تیسرے شخص صاحب سنگھ میں کچھ اہلیت تھی لیکن وہ موجود نہ تھا لاہور والے ان لوگوں کی جابرانہ حکومت سے تنگ آ گئے تھے رنجیت سنگھ کے پاس پیغام بھیجا گیا کہ اگر وہ ان سے نجات دلا دے تو اس کی اطاعت بخوشی قبول کی جائے گی۔ چنانچہ رنجیت سنگھ ایک بھاری فوج لے کر روانہ ہوا۔ اس کے پہنچتے ہی شہر کے دروازے کھول دیئے گئے اور دونوں سردار بغیر مقابلہ کئے فرار ہو گئے۔

جولائی 1799ء میں لاہور پر اس طرح قبضہ پانے اور راجہ کا خطاب جائز طور پر حاصل کر کے رنجیت سنگھ 20 سال کی عمر میں ایک زبردست سردار بن گیا۔ سکھ امرا اس کی کامیابی سے بہت خائف ہوئے اور خاص طور پر بھنگی اپنی راجدھانی پر قبضہ ہونے کی وجہ سے اس سے برسر انتقام ہو گئے۔ 1800ء میں اس کے خلاف ایک جماعت قائم ہوئی جس میں سردار جسا سنگھ رام گڑھیا' صاحب سنگھ و گلاب سنگھ بھنگی زیادہ سربر آوردہ تھے۔ قرار یہ پایا کہ بھسین میں ایک مجلس شوریٰ مقرر کی جائے اور وہاں رنجیت سنگھ کا کام تمام کر دیا جائے۔ لیکن رنجیت سنگھ ان کے پھندے میں کب

چھیننے والا شخص تھا وہ ۔ حسین جاتے وقت اس قدر کثیر تعداد فوج کی اپنے ہمراہ لے گیا کہ کسی کی ہمت اس کام کے انجام دینے کی نہ پڑی۔ دو مہینے تک سیر و شکار میں مصروف رہنے کے بعد وہ لاہور واپس آگیا۔ لیکن جو سازش بھنگیوں نے اس کے خلاف کی تھی اس سے وہ ناواقف نہ تھا اس نے اس بارے میں خود پیش قدمی کرنے کا مصمم ارادہ کر لیا۔ 1802ء میں اس نے ان کے صدر مقام امرتسر پر مشہور توپ زمزمہ (22) کے مطالبے کے لئے آدمی روانہ کئے جو اس کے دادا چڑت سنگھ کو 1764ء میں لاہور کے مال غنیمت سے بطور حصہ دی گئی تھی۔ بھنگیوں نے اس کے دینے سے انکار کیا اور اس بنا پر رنجیت سنگھ نے ان کے قلعہ امرتسر پر حملہ کر دیا اور انہیں وہاں سے نکال دیا۔ انہوں نے مجبور ہو کے رام گڑھیا والوں کے پاس پناہ لی جن کے ساتھ انہوں نے امرتسر کو تقسیم کر لیا تھا اور ان کے مقبوضات الحاق کر لئے تھے۔

اس جرات و کامیابی کی وجہ سے رنجیت سنگھ سکھوں کے مذہبی و ملکی دونوں صدر مقاموں پر قابض ہو گیا اور اسے اپنے فتوحات کے متعلق آئندہ کوئی اندیشہ نہ رہا کیونکہ کنہیا والوں کی بڑی ریاست بالکلیہ اس کے قبضہ اختیار میں تھی اور رام گڑھیا کا مشہور سردا جسا سنگھ ضعیف و سن رسیدہ ہو چکا تھا اور رنجیت سنگھ جانتا تھا کہ اس کی جاگیر پر قبضہ حاصل کرنے کے لئے زیادہ انتظار کرنا نہیں پڑے گا۔ سال آئندہ اس کا انتقال ہو گیا اور اس کا بیٹا جودھ سنگھ گو بہادر سپاہی تھا لیکن نہایت سادہ مزاج تھا اور مہاراجہ کا (کیونکہ اب رنجیت سنگھ کو مہاراجہ کہنا بجا تھا۔) وفادار ہو گیا تھا ایسی حالت میں ریاست کو بہ جبر لینا غیر ضروری شرارت تھی جودھ سنگھ نے رنجیت سنگھ کے ساتھ ہمیشہ رفاقت کرنے کی قسم کھائی اور رنجیت سنگھ ہر طرح اس کی خوشامد و دلجوئی کرنے لگا۔ رام گڑھیا کے قلعے کے طرز پر امرتسر میں اس کے لئے نیا قلعہ تعمیر کیا گیا۔ جودھ سنگھ رنجیت سنگھ کے ساتھ مہمات میں اکثر شریک ہوا۔ 1816ء میں جودھ سنگھ کا انتقال ہوا اور اس کے بعد اس کا جانشین رنجیت سنگھ سے برسر پرخاش ہوا رنجیت سنگھ نے قلعے پر قبضہ حاصل کر کے اسے مسمار کر دیا اور تقریباً ایک سو اور چھوٹے چھوٹے قلعے شکست کر دیئے اور اس ریاست کے مقبوضات جو امرتسر، جالندھر و گرداسپور میں تھے الحاق کر

لئے۔ مفتوحہ خاندانوں کے سرگروہوں کو اس نے اچھی اچھی جاگیریں دیں اور فوج میں یا اپنے پاس معزز عہدے عطا کئے۔

1810ء میں نکئی ریاست کا خاتمہ ہو گیا۔ یہ یاد ہو گا کہ رنجیت سنگھ نے 1802ء میں ایک نکئی لڑکی سے شادی کی تھی اور صرف اسی کے بطن سے رنجیت سنگھ کی اولاد پیدا ہوئی تھی لیکن اس شادی سے رشتہ داروں میں اچھے تعلقات قائم نہ ہوئے۔ 1807ء میں جب کاہن سنگھ راجکور رانی کا بھتیجا خاندان کا رئیس ہوا تو مہاراجہ نے اسے دربار میں آ کر رہنے کی ترغیب دی لیکن کاہن سنگھ جانتا تھا کہ ایک دفعہ آنے کے بعد پھر چھٹکارا محال ہے مرغ اسیر کو گرفتار ہونے کے بعد پھر رہائی نصیب نہیں ہوتی۔ اس لئے اس نے سخت انکار کر دیا۔ مگر اس انکار پر بھی اس کا پیچھا نہ چھوٹا کیونکہ مہاراجہ نے اس کی تمام جاگیر جو قصور' چونیاں اور گوگیرا میں لاہور سے اس قدر قریب واقع تھیں کہ اس کا بچانا بالکل ناممکن تھا الحاق کر لیں۔ مہاراجہ کے طریق عمل کی یہ عمدہ مثال ہے اس بات کے لئے کوئی حیلہ اس کے پاس موجود نہ تھا اور کاہن سنگھ نے جو قریبی رشتہ دار تھا سوائے اس کے کہ ان کے بچانے کی طاقت نہ رکھتا تھا کوئی قصور نہیں کیا تھا۔

سب سے آخری بڑی ریاست جو مہاراجہ کے دست تصرف میں آئی وہ کنہیا کی تھی جس کی رئیسہ اس کی ساس سدا کور تھی۔ پہلے بیان ہو چکا ہے کہ اس عورت نے شیر سنگھ اور تارا سنگھ دو لڑکے اس کے روبرو یہ کہہ کر پیش کئے کہ وہ مہتاب کور کے بطن سے اس کی اولاد ہیں۔ اس فریب کو جس کے اسباب باب آئندہ میں بیان کئے جائیں گے مہاراجہ نے ملکی مصالح کے لحاظ سے درست مان لیا تھا لیکن اس امر کا مصمم ارادہ کر لیا کہ اس کا بدلہ مناسب موقع پر لیا جائے۔ یہ موقع اس وقت تک حاصل نہ ہوا جب تک کہ شیر سنگھ کی عمر 12 سال نہ ہوئی اور ہزارے میں برائے نام فوج کی سرکردگی پر اسے روانہ نہیں کیا گیا۔ اس مہم میں بہادر سردار دیوان رام دیال یوسف زئیوں کے ہاتھ گند گڑھ میں مارا گیا۔ اس موقع پر شیر سنگھ نے بہت عمدگی سے کام انجام دیا اور اس کے واپس آنے پر مہاراجہ نے مائی سدا کور پر جس نے شیر سنگھ کو اپنا

متبنی بنا لیا تھا یہ مشورہ دیا کہ اب اس کا وقت ہے وہ دنیاوی امور سے بطور مناسب کنارہ کش ہو کے اپنے نواسے کو ریاست کا کام تفویض کر دے۔

بڈھی رانی ترک ریاست کے لئے آمادہ نہ تھی لیکن وہ لاہور سے چند میل کے فاصلے پر شاہدرے کے مقام پر مقیم تھی اور یہ ظاہر تھا کہ اب انکار سے خراج نتائج پیدا ہونے کا اندیشہ ہے اس لئے اس نے لیت و لعل شروع کیا اور اپنے صدر مقام بٹالے واپس جا کر اس نے انگریزوں سے نامہ و پیغام شروع کیا اور ان سے التجا کی کہ اسے ان کے زیر حفاظت ستلج اس پار کے ملک میں سکونت کرنے کی اجازت دی جائے۔ مہاراجہ کو بھی اس پیغام بھیجنے کا حال معلوم ہو گیا اور اس نے سدا کور کو اپنے سامنے طلب کر کے اپنے سابق حکم کا ڈرا دھمکا کر اعادہ کیا۔ مائی سدا کور اسی شب میانے میں سوار ہو کر فرار ہو گئی لیکن رنجیت سنگھ کے سپاہیوں نے تعاقب کر کے اسے گرفتار کر لیا اور اسے ایک قلعے میں محبوس کر دیا گیا جہاں کچھ عرصے کے بعد اس کا انتقال ہو گیا اور مہاراجہ نے اس کی تمام بڑی بڑی جاگیروں کو بلا کسی مزاحمت کے ملحق کر لیا اب صرف اٹال گڑھ اور کیری کے قلعوں پر مدافعت رہ گئی۔ اٹال گڑھ کے قلعے میں سدا کور کی ساتھی ایک عورت نے مقابلہ کیا اور کیری پر دیوان دیوی چند کو جو اس کی تسخیر کے لئے روانہ کیا گیا تھا بہت دقتیں پیش آئیں۔ بٹالہ شیر سنگھ کو جاگیر میں دے دیا گیا اور یہ چالاک عورت جس نے یہ جھوٹا شہزادہ بنا کے کنواں دوسروں کے لئے کھودا تھا خود اسی میں گر گئی۔ یہ امر بھی فراموش نہیں کیا جا سکتا کہ گو سدا کور سے اور قصور ہوئے ہوں لیکن مہاراجہ کے ساتھ اس نے نیکی کی تھی لیکن مہاراجہ نے اس کے ساتھ نہایت ناشکری کا سلوک کیا۔ اس کے روپے اور فوج سے مہاراجہ کو لاہور و امرتسر پر قبضہ نصیب ہوا اور باپ کے مرنے کے بعد جو کشمکش کی حالت تھی اس سے اسی کے بدولت اسے نجات حاصل ہوئی۔

انگریز اور ستلج اس پار کا قطعہ ملک

مہاراجہ صرف ایک دوستی میں ثابت قدم رہا اور اسی ایک اتحاد سے اس نے کبھی گریز نہیں کیا- یہ دوستانہ اتحاد انگریزی سلطنت کے ساتھ جس کی نمائندہ اس زمانے میں ایسٹ انڈیا کمپنی تھی- اس صدی کے اوائل میں جب تک وہ انگریزوں کی مصلحت و اقتدار سے پورا پورا واقف نہ تھا وہ اس شش و پنج میں رہا کہ ان پردیسیوں کے ساتھ کس طرح سلوک کیا جائے اور 1808ء میں تو اس نے تقریباً جنگ کا فیصلہ کر لیا تھا لیکن جب 1809ء کے معاہدے کے مطابق ان کی اور خود اس کی حیثیت کا ایک مرتبہ تصفیہ اور تصدیق ہو گئی جس کی رو سے اس نے ستلج اس پار کے تمام سرداروں پر سے اپنا اقتدار اٹھا لیا تو اس نے ان فرائض و ذمہ داریوں کو خوشی سے قبول کر لیا جو اس معاہدے کی رو سے اس پر عائد ہوئی تھیں اور 30 سال تک سرکار انگریزی کا سچا وفادار رہا- اس نے حکومت انگریزی کے وعدوں پر ایسا پورا پورا اعتماد کیا جس کا ایسے شکی اور بے باک فرماں روا سے تعجب ہوتا ہے- لیکن اسی کے ساتھ اس کی ملکی مصلحت بینی کا یہ بہترین ثبوت ہے- مہاراجہ کا اعتبار انگریزی حکومت سے بیجا نہ تھا- حکومت انگریزی نے بھی ہمیشہ رنجیت سنگھ کے ساتھ آزادانہ اور دوستانہ برتاؤ کیا کیونکہ سرکار انگریزی یہ سمجھتی تھی کہ اس وقت کے غیر منتظم صوبے اور شمال مغربی سرحد کے دروں کی غیر معلوم طاقت کے مابین یہ شخص روک تھام کا کام دے گا- جہاں سے ہندوستان کے میدانوں میں حملہ آور افواج کا ہمیشہ سیلاب جاری رہا ہے- اسی وجہ سے کبھی اس کے خلاف کوئی کارروائی نہیں کی گئی- لاہور کی ریاست خود اپنی اندرونی خرابیوں کی وجہ سے معرض زوال میں آئی- سرکار انگریزی نے اس کے مخالف کوئی منصوبہ نہیں کیا

تھا۔

ہندوستان کی تاریخ میں ہماری حکومت کی ابتدا اور اس کا ستلج اس پار کی ریاستوں اور مہاراجہ سے تعلق پیدا کرنے کا باب بہت سبق آموز ہے۔ لیکن وہ اس قدر طولانی ہے کہ اس کا اعادہ یہاں نہیں ہو سکتا۔ اس کا تعلق مرہٹوں کے اور ان کی تربیت یافتہ افواج سے ہے جو فرانسیسی جنرلوں کے زیر کمان رہیں نیز جارج ٹامس کے حیرت انگیز واقعات زندگی سے جو ایک انگریز تھا اور جس نے بڑی جرات و بہادری سے شمالی ہند میں ایک سلطنت کی بنیاد قائم کرنے کی کوشش کی تھی جس میں اسے کامیابی ہوتے ہوتے رہ گئی۔ ان واقعات کا صرف سرسری طور پر بیان کیا جا سکتا ہے۔ (23)

اس صدی کے اوائل میں سرکار انگریزی کی قوت ہندوستان میں سیلاب کی طرح جلد جلد بڑھ رہی تھی۔ نقشے میں جس سرخ لکیر سے اس کی حد بندی کی گئی تھی اس میں روز بروز وسعت ہو رہی تھی اور خود رنجیت سنگھ نے اس امر کی بالکل صحیح پیشین گوئی کی تھی کہ ایک دن تمام ہندوستان سرخ ہو جائے گا۔ بنگال' بنارس' اودھ' الہ آباد' کانپور' فرخ آباد یکے بعد دیگرے مطیع ہو چکے تھے کہ 11- ستمبر1803ء کو جنرل لیک نے مرہٹوں کی فوج کو جو بورقین کی سرکردگی میں تھی' دہلی کی فصیل کے نیچے شکست دی اور اس کے چار دن بعد ہندوستان کے دارالسلطنت میں بہ حیثیت فاتح داخل ہوا۔ یکم نومبر کولسواری کی جنگ ہوئی جس میں مرہٹوں کو دوبارہ نقصان عظیم کے ساتھ شکست ہوئی اور سندھیا نے سرجی انجن گاؤم کے معاہدے کی رو سے سرسہ' حصار' رہتک' دہلی' گڑ گاؤں اور آگرہ سرکار انگریزی کے حوالے کر دیئے۔ لیکن ان میں سے پہلے تین اضلاع پر 1809ء تک سرکار انگریزی نے اپنا عمل دخل نہیں کیا۔

ستلج اس پار کے سرداروں نے مرہٹوں سے دوستی کر لی تھی اور جنرل بورقین نے کیونکہ ان کے دشمن جارج تامس کو بھی شکست دے دی تھی' انہوں نے انگریزوں سے دہلی میں جنگ کی۔ مگر انہوں نے ہماری طاقت کا غلط اندازہ کیا تھا۔ 1804ء میں برابر سال بھر تک جمنا کے آس پاس انگریزوں کو بہت پریشان کیا اور دہلی کی فصیل تک

ملک میں لوٹ مار مچاتے رہے لیکن کرنل برن نے جب 18- دسمبر 1804ء کو انہیں سخت شکست دی تو انہوں نے دریا پار جا کر دم لینا غنیمت سمجھا اور ان کے دو سربر آوردہ سردار جیند کا راجہ بھاگ سنگھ اور کیتھل کا راجہ بھائی لال سنگھ انگریزی فوج سے جا ملے اور ہمیشہ کے لئے اس کے رفیق ہو گئے۔

اکتوبر 1804ء کو جسونت راؤ ہلکر نے جس نے کرنل مانسن کی بریگیڈ پر فتح حاصل کی تھی فوج کثیر سے دہلی کا محاصرہ کیا لیکن کرنل اخترلونی اور کرنل برن نے اسے پسپا کر دیا۔ دو مہینے بعد فتح گڑھ اور ڈیگ پر جنرل لیک و جنرل فریزر نے سخت قتل و خوں ریزی کے بعد مرہٹوں کو شکست فاش دی۔ ان کا سردار ہلکر بے فوج رہ گیا۔ کچھ عرصے تک تو وہ اس فضول کوشش میں رہا کہ ستلج کے جنوب میں پھر فوج جمع کرے لیکن بعد میں وہ شمال کے جانب سکھوں سے امداد لینے کے لئے چلا گیا جن کی امداد اگرچہ سندھیا کی امداد کے مقابلے میں زیادہ کارگر نہ تھی لیکن اس سے زیادہ قابل اعتماد تھی۔ سندھیا بظاہر تو اظہار دوستی پر مجبور تھا لیکن دل میں ہلکر سے سخت متنفر تھا۔ ہلکر کئی مہینے تک پٹیالے میں رہا لیکن پٹیالے کے مہاراجہ نے اس کی مدد کر کے خود نقصان اٹھانا گوارا نہ کیا اور ستلج اس پار کے دوسرے سرداروں نے بھی یہ دیکھ کر کہ اس کی کامیابی کی امید نہیں ویسی ہی دانشمندی اختیار کی۔ بالاخر اکتوبر 1805ء میں لارڈ لیک اور ہلکر سے دوبارہ سر میدان جنگ کی ٹھہری تو وہ امرتسر بھاگ گیا اور رنجیت سنگھ کو ملانے کی کوشش کی۔ رنجیت سنگھ بھی اس کی امداد پر بہت کچھ آمادہ ہو گیا تھا لیکن اس کے مشیر فتح سنگھ اہلووالیہ اور جیند کے راجہ نے اسے باز رکھا ورنہ فوراً" انگریزوں سے اس کی مڈ بھیڑ ہو جاتی۔ لارڈ لیک نے بیاس تک ہلکر کا پیچھا کیا اور اگر گورنر جنرل کو اس کی دھن نہ ہوتی کہ جس قدر جلد ہو اس سے صلح کر لی جائے تو ہندوستان میں انگریزوں کے سخت ترین دشمن کا بالکل خاتمہ ہو جاتا۔ مگر اس وقت لندن کی مجلس نظما کو پھر بزدلی کی ہوک اٹھی ہوئی تھی۔ لارڈ ویلزلی کی جو گورنر جنرلوں میں سب سے زیادہ سربر آوردہ تھا بے باک حکمت عملی سے خائف ہو کر کارنوالس سا کمزور

شخص ان کارروائیوں کے پلٹ دینے کے لئے بھیجا گیا۔

حماقت سے باہمی آشتی کو بڑی دانشمندی تصور کیا گیا۔ ھلکر کے ساتھ ایک معاہدہ کیا گیا جس کی رو سے اسے اس قطعہ ملک کا حصہ کثیر واپس دے دیا گیا جو اس سے قبل چھین لیا گیا تھا۔ یکم جنوری 1806ء کو ایک ضمنی معاہدہ رنجیت سنگھ اور اہلووالیہ سردار کے ساتھ کیا گیا۔ یہ معاہدہ گویا آنریبل ایسٹ انڈیا کمپنی اور سرداران رنجیت سنگھ و فتح سنگھ کے مابین اتحاد و دوستی قائم کرنے کی غرض سے کیا گیا تھا جس کی رو سے رنجیت سنگھ نے جسونت راؤ ھلکر کو فوراً" امرتسر سے باہر بھیج دینے اور آئندہ کسی قسم کا تعلق نہ رکھنے یا فوج یا کسی اور طریقے سے اس کی امداد نہ کرنے کا اقرار کیا۔ سرکار انگریزی نے اس کے معاوضے میں وعدہ کیا کہ جب تک یہ سردار سرکار انگریزی کے دشمنوں سے کسی قسم کا دوستانہ تعلق نہ رکھیں گے یا سرکار انگریزی کے خلاف مخاصمانہ برتاؤ کرنے سے محترز رہیں گے اس وقت تک نہ انگریزی فوج ان کے ملک میں داخل ہو گی اور نہ سرکار ان کے ملک یا مقبوضات کو ان سے لینے یا انہیں بیدخل کرنے کی کوئی کارروائی کرے گی۔

یہ معاہدے جن سے ھلکر پنجاب سے خارج ہوا رنجیت سنگھ کو عملاً انگریزوں کی دست اندازی سے نجات ہوئی کہ وہ اپنے منصوبے شمالی ستلج میں فتوحات کرنے کے لئے کام میں لائے۔ اس دریا کے جنوب کا قطعہ ملک جو سکھ سرداروں کے قبضے میں تھا اس وقت معرض بحث میں نہ آیا تھا۔ 1806ء کے موسم گرما میں پھلکیان راجاؤں کے باہمی تنازعہ نے رنجیت سنگھ کو حملہ کرنے پر آمادہ کر دیا۔ اس بدنصیب علاقے کی حالت بے حد قابل تاسف تھی۔ سکھ ریاستوں اور دہلی کے مابین کے اضلاع کی حالت جنہیں انگریزوں نے 1803ء میں حاصل کیا تھا شاید بہت قابل رحم ہو رہی تھی لیکن اس قطعہ ملک کے اس حصے کے مزارعین کی حالت بھی جو سکھوں کے حدود میں تھے ویسی ہی خراب تھی۔ مسٹر ڈینزل ایبٹسن نے کرنال کی رپورٹ بندوبست اراضی میں تحریر کیا ہے:

"اس طرح 1805ء میں اس ہولناک زمانے کا خاتمہ ہوا جس کو لوگ عموماً سکھا شاہی یا مرہٹوں کے زمانے کی بد عملی کہتے ہیں۔ اب تک دیہاتیوں کے دلوں میں اس کی یاد تازہ ہے۔ درحقیقت کبھی پانی پت کے جنوبی قطعہ ملک پر سکھوں کا قبضہ قائم نہ رہا اور اس علاقے میں جو کچھ ان کے مقبوضات تھے وہ مرہٹوں کے باجگذار کی حیثیت سے تھے۔ لیکن یہ تمام زمانہ ان دونوں قوموں کے باہمی تنازعات میں گزرا اور یہ قطعہ ملک دونوں کے مقبوضات کے مابین ایک لاوارث ملک تھی۔ دونوں اس کو لینا چاہتے تھے مگر حفاظت کا ذمہ کوئی نہ لیتا تھا۔ یہ قطعہ درحقیقت اس کا شکار تھا جو اس وقت سب سے زیادہ قوی اور دلیر اور لٹیرا ہوتا۔ 1760ء میں بھی نادر شاہ کو دوآب کے راستے سے دہلی جانا پڑا تھا کیونکہ مرہٹہ فوجوں کی ہمیشہ آمدورفت کی وجہ سے یہ قطعہ اس درجہ ویران ہو گیا تھا کہ یہاں رسد کا ملنا ناممکن تھا اور چالیس سال بعد جب ہم نے اس ضلع کو اپنے قبضے میں لیا تو یہ اندازہ کیا گیا کہ اس قطعہ ملک میں 4/5 حصہ جنگل ہو گیا تھا اور یہاں کے باشندوں کا استحصال کر دیا گیا یا جلاوطن ہو گئے۔ شاہی نہرمدت سے خشک پڑی ہوئی تھی اور زراعت کی جگہ گھنے جنگل ہو گئے جو لٹیروں' خانہ بدوشوں اور درندوں کا مامن تھے۔ 1827ء میں مسٹر آرچر نے یہ بیان کیا کہ چند سال قبل تک تمام ملک وحشی جانوروں سے بھرا ہوا تھا شارع عام کے آس پاس ویران کھنڈر اب تک اس امر کی شہادت دیتے ہیں کہ لوگوں کو ان مستحکم سے مستحکم مواضعات کو بھی ترک کرنا پڑا جہاں ان کے آباؤ اجداد صدیوں سے آباد تھے وہ ان کو چھوڑ کر ایسے مقامات پر آباد ہونے

کے لئے مجبور ہوئے جو قزاقوں کے دستبرد سے کسی قدر محفوظ تھے۔ تحصیل لگان کا اس وقت کوئی انتظام نہ تھا۔ کاشتکاروں کی حالت یہ تھی کہ تلوار ہاتھ میں لئے ہل چلایا کرتے تھے۔ محصول وصول کرنے والا اپنے ساتھ فوج لے کر لگان وصول کرنے آیا کرتا تھا اور اگر وہ اس مہم میں کامیاب ہو گیا تو اس کے پیچھے دوسرا فوراً آ موجود ہوتا تھا تاکہ بچی کچی رقم کو وصول کر کے چلتا ہو۔"

رنجیت سنگھ اپنے چچا جیند کے راجہ بھاگ سنگھ کے بلانے سے 26- جولائی 1806ء کو کثیر لشکر کے ساتھ ستلج عبور کر کے بھاگ سنگھ اور مہاراجہ پٹیالہ کے باہمی تنازع کے تصفیے کے لئے گیا۔ انگریزوں کو اس کی آمد سے یک گونہ تشویش رہی اور انہوں نے کرنال میں اپنی فوجی قوت مستحکم کر لی لیکن رنجیت سنگھ ایسا بے احتیاط نہ تھا کہ انہیں چھیڑتا۔ وہ صرف لدھیانے اور گھومگرانے کے اضلاع پر قبضہ کر کے قانع ہو گیا' جس کو اس نے اپنے دوستوں پر تقسیم کر دیا لدھیانے کا خاندان قدیم راجپوت مسلمانوں کا تھا اور اس وقت دو بیوائیں اس کی پس ماندہ تھیں۔ رنجیت سنگھ نے سخت بے حیائی سے ان کے تمام مقبوضات کو لوٹ لیا۔

دوسرے سال اسی موسم میں وہ پٹیالے پھر آیا۔ اس مرتبہ ایک کثیر تعداد فوج کی دیوان محکم چند کے زیر کمان اس کے ہمراہ تھی۔ اس نے راجہ صاحب سنگھ اور اس کی بیوی مشہور رانی اوس کور کے درمیان صفائی کرا دی جس سے دوسرے فریق کو جس نے بہت سی رشوت دی تھی بہت کچھ فائدہ ہوا۔ اب کی واپسی میں اس نے بہت سی جائیدادیں مثلاً نارائن گڑھ' ودنی' مرنڈا' زیرا وغیرہ جو زیادہ تر فیروز پور کے ضلع میں واقع تھیں چھین لیں اور انہیں اپنے متوسلوں میں تقسیم کر دیا۔

ستلج اس پار کے سردار اب سمجھ گئے کہ آپس کے جھگڑوں میں دخل دینے کے لئے رنجیت سنگھ کو بلا کے خود ایک ایسا دیو پیدا کر لیا ہے جو ان کے قابو میں نہیں رہ

سکتا۔ اسی وجہ سے مارچ 1808ء میں جیند کا راجہ' کیتھل کا بھائی لال سنگھ جو ایک سربر آوردہ سردار تھا پٹیالے کے راجہ صاحب سنگھ کے نائب کو ساتھ دہلی لے گیا کہ سرکار انگریزی کے زیڈیڈنٹ مسٹر سیٹن سے مل کے دریافت کرے کہ آیا سرکار انگریزی ان کو اپنی حفاظت میں لینے پر آمادہ ہے یا نہیں۔ سرکار انگریزی چاہتی تھی کہ ایسا ہی سمجھا جائے لیکن اس امر کا پس و پیش تھا کہ سب سے بہتر طریقہ اس کو انجام دینے کا کیا ہو۔ حکام انگریزی چاہتے تھے کہ مہاراجہ رنجیت سنگھ کی ملک گیری کی ہوس ستلج کے شمالی جانب تک محدود ہے۔ لیکن اسی کے ساتھ یہ بھی معلوم تھا کہ رنجیت سنگھ کا مصمم قصد ہے کہ دریا کے شمال و جنوب دونوں طرف کے سکھوں پر اپنا اقتدار قائم رکھے اور اس لئے اسے یہ ڈر لگا ہوا تھا کہ اس طرح یکبارگی مداخلت کرنے سے کہیں دوستانہ تعلقات میں رخنہ نہ پڑے اور وہ فرانسیسیوں کے ہتھے چڑھ گئے۔ گو اس وقت جبکہ فرانس کے مقبوضات ہند صرف دو یا تین معمولی بستیوں پر محدود ہیں یہ امر تعجب خیز معلوم ہوتا ہے لیکن صدی کے اوائل میں حالات اس سے بالکل مختلف تھے۔

انگریزوں و فرانسیسیوں کے مابین رقابت چلی آ رہی تھی جس کا نتیجہ یہ تھا کہ ان میں سے جو طاقتور رہے اسی کو دنیا میں تجارتی و ملکی اقتدار حاصل ہو۔ ہندوستان میں بھی یہ مخالفت ایسی شد و مد سے ہوتی رہی جس طرح دوسرے ممالک میں اور بالاخر اس کا خاتمہ 1783ء میں ورسیلز کے معاہدے سے ہوا۔ اس وقت سے ہندوستانی علاقے میں انگریزوں سے دشمنی و نفرت کی روایتوں کو فرانسیسیوں کے قابل جنرل بڑھاتے رہے مثلاً کامٹی ڈی بوائی' پیرن اور بورقین نے مرہٹوں کے خانہ بدوش جرگوں کو اسی طرح ترتیب دے کر آراستہ فوج بنا دیا جس طرح وینٹورا' الارڈ اور کورٹ نے چالیس سال کے بعد خالصے کی فوج کو مرتب کیا۔ اس کے بعد فرانسیسی بادشاہوں کے غضب اور جمہوریت کے غیظ سے بدرجہا زیادہ نپولین کی فراست و اولوالعزمی سے ایشیا و یورپ کے مطلع بادل سے گھرے ہوئے تھے۔ مرینجو' اسٹرلٹز اور جینا کی توپوں کی گونج طہران و لاہور تک پہنچی اور ایشیا میں کوئی دربار ایسا نہ تھا جہاں اس عظیم الشان فاتح کے حالات کا

بڑے شوق سے تجسس نہ ہو جس کی کامیابی ویسی ہی سریع و یقینی تھی جیسی سکندر اعظم و تیمور کی۔

اور سرکار انگریزی کا تردد کچھ بیجا بھی نہ تھا۔ نپولین کی اولوالعزمی کی کوئی حد نہ تھی۔ ایک وقت تو اس نے یہ ارادہ ہی کر لیا تھا کہ ہندوستان میں فرانسیسی شہنشاہی کی تجویز کو پھر عمل میں لائے جو اس سے قبل مشہور ڈوپلے کے زمانے ہی میں قائم ہو چکی ہوتی اگر اس کا احسان فراموش ملک بجائے تائید دینے کے اس سے کنارہ کشی اختیار نہ کرتا۔ 1808ء میں اس خواب کی تعبیر کے پورا ہونے کا وقت گزر چکا تھا اور نپولین کا یہ ارادہ کہ ایران کو محفوظ مرکز قرار دے کے کابل و لاہور کو یکے بعد دیگرے تسخیر کرے اس کی قوت سے باہر تھا۔ لیکن اس کے ارادے کی اطلاع یابی نے انگریزوں کو بے چین کر دیا اور اس کے توڑ کے لئے مسٹر الفنسٹن کو کابل اور مسٹر سی ٹی مٹکاف کو رنجیت سنگھ کے دربار میں معاہدات کرنے کے لئے روانہ کیا گیا۔

مہاراجہ بڑا ہوشیار تھا۔ وہ انگریزوں کی اس سراسیمگی سے آگاہ تو ہو گیا لیکن اس کی حالت ایسی نہ تھی کہ وہ اس سے کسی قسم کا فائدہ اٹھا سکتا۔ وہ اپنے آپ کو محفوظ نہ پاتا تھا۔ انگریز اس کے ستلج اس پار کے ملک پر حملہ کرنے کی وجہ سے اس سے ناراض ہو گئے تھے۔ شمال کی جانب سے افغانوں کے حملہ کرنے کا خدشہ ہر وقت لگا ہوا تھا۔ پنجاب خاص کے سکھ امراء اپنی ہٹ پر قائم تھے اور اس کی جانب سے ان کے دلوں میں شک پیدا ہو گیا تھا' جن لوگوں کو اس نے مغلوب کیا تھا وہ بدلہ لینے کے لئے بے چین تھے اور جن پر اب تک اس نے حملہ نہیں کیا تھا وہ اس کی دغا بازی اور ظلم سے ترساں تھے۔ اسی کے ساتھ اس کی یہ تجویز کہ ستلج اس پار کی تمام ریاستوں کو وہ اپنا محکوم بنا کر ایک بڑی سلطنت قائم کر لے جس میں خالصے کے تمام سپوت شامل ہوں ہمیشہ اس کے پیش نظر تھی اور اس کی تکمیل کی معقول امید بھی اس کو تھی۔ اس کے ستلج اس پار کے تین مہمات نے اس پر یہ ثابت کر دیا تھا کہ پھلکیان کے راجہ اور مالوے کے سردار کس درجہ کمزور ہیں اور ان میں باہم اس درجہ نفاق ہے کہ اس کے

مقابلے میں وہ متحد نہیں ہو سکتے اور ادھر انگریزوں نے اس وقت تک براہ راست کوئی مداخلت نہیں کی بلکہ دہلی جا کر جن لوگوں نے حفاظت طلب کی تھی انہیں بھی بلطائف الحیل ٹال دیا گیا تھا۔ انگریزی سفراء کے وسط ماہ اگست میں کرنال سے روانہ ہو کر وہاں آنے کی خبر نے رنجیت سنگھ کو گونہ متردد کر دیا لیکن شرائط کے طے ہونے سے قبل اس نے اپنی حالت کو مستحکم کرنے کا مصمم ارادہ کر لیا ستلج اس پار کے حملے کی تیاری کے لئے اس نے قصور میں فوج کشی شروع کر دی۔ مسٹر مٹکاف 11۔ ستمبر کو پٹیالے ہوتا ہوا وہاں پہنچا۔ پٹیالے پہنچنے پر راجہ نے دوبارہ حفاظت کی استدعا کی اور اس قدر ترغیب دینے کی سعی کی کہ وہ شہر کی کنجیاں اس کے حوالے کر دینا چاہتا تھا تاکہ وہ سرکار انگریزی کی طرف سے پھر اسے واپس کر دے۔

مسٹر مٹکاف نے بلا کسی پس و پیش مہاراجہ کے روبرو تجاویز کو پیش کیا جن کے لئے سرکار کی جانب سے وہ روانہ کیا گیا تھا یعنی یہ کہ فرانسیسیوں کے مقابلے میں مدافعانہ اور جارحانہ صورتوں میں معاہدہ کیا جائے کیونکہ حملہ ہونے کی صورت میں سرکار انگریزی اور ریاست لاہور دونوں کا مدافعت میں فائدہ تھا۔ مہاراجہ نے بخوشی خاطر اس تجویز کو قبول کر لیا لیکن اس کے معاوضے میں اس نے یہ چاہا کہ تمام سکھ ریاستوں اور سکھ قوم پر اس کی حکومت تسلیم کی جائے۔ مسٹر مٹکاف اس کے ادعا کے قبول کرنے کا مجاز نہ تھا اور چونکہ اس نے کلکتے سے استمزاج کی صورت میں بھی کامیابی کی توقع ظاہر نہیں کی اس لئے رنجیت سنگھ اس مقام سے کوچ کر کے ستلج کے اس پار چلا گیا۔ سفیر اگرچہ اس بدخلقی سے ناخوش ہوا لیکن اسے سوائے اس کے کوئی چارہ نہ تھا کہ اسی کے ساتھ ساتھ وہ بھی روانہ ہو جائے۔ کھئی سے فرید کوٹ جانا ہوا اور یہاں زبردستی قبضہ کر لیا گیا۔ فرید کوٹ سے مالیر کوٹلہ پہنچ کر خراج کی وافر رقم طلب کی گئی۔ مسٹر مٹکاف مہاراجہ کے لشکر کے ساتھ ساتھ رہا۔ سفیر صرف اس وقت اس سے علیحدہ ہوا جبکہ مہاراجہ نے انبالے جانے کی تجویز کی جو ان ریاستوں کے عین قلب میں واقع تھا جنہوں نے سرکار انگریزی سے حفاظت کی استدعا کی تھی۔ یہاں سے علیحدہ ہو کر سفیر

فتح آباد روانہ ہو گیا۔ مٹکاف نے جو مسودہ معاہدے کا رنجیت سنگھ کے روبرو پیش کیا تھا وہ صرف فرانسیسیوں کے مقابلے میں اتحاد کرنے کے متعلق تھا۔ بخلاف اس کے رنجیت سنگھ نے جو مطالبہ کیا تھا وہ صرف یہ نہ تھا کہ انگلستان کے ساتھ قطعی اتحاد ہو جائے اس سے اور کابل سے تنازعہ ہو تو کسی قسم کی مداخلت نہ ہو اور ستلج کے شمال و جنوب کے سکھ ممالک میں اس کی بلا شرکت غیرے حکومت تسلیم کر لی جائے۔

مہاراجہ کی پالیسی دانشمندانہ اور جری تھی اور وہ اُس قسم کی کامیابی کا مستحق تھا جو اس کو غالباً حاصل ہو جاتی خواہ فرانسیسی حملے کا اندیشہ واقعی ہوتا نہ کہ محض خیالی۔ اسے فرانس کی پروانہ تھی اور وہ یہ جانتا تھا کہ نپولین اس کا دشمن نہیں ہے بلکہ انگریزوں کا حریف ہے۔ اگر انگریز فرانسیسیوں کے خلاف اسے اپنا شریک کرنا چاہتے ہیں تو انہیں اس کا معاوضہ دینا چاہئے اس لئے اس نے اپنے مطالبات سفیر اور گورنر جنرل کے روبرو باصرار تمام پیش کئے۔ معاہدے کے دوران تصفیہ میں ستلج اس پار کا جس قدر حصہ اسے مل سکا اس پر اس نے بہ جبر قبضہ کر لیا تاکہ معاہدے کے تصفئے پر خواہ اس کا انجام کچھ ہی کیوں نہ ہو جو ملک اس کے تصرف میں آ جائے اس پر قبضہ بحال رہے۔ اس نے بڑی دانشمندی سے سفرا کو اپنے لشکر میں روکے رکھا تاکہ سرداروں کی مزاحمت قوت نہ پکڑ سکے اور اس کی کارروائی ایک طور سے سرکاری منظور شدہ تسلیم کی جائے۔

مسٹر مٹکاف کے لشکر سے چلے جانے کے بعد مہاراجہ نے فتح ممالک کا سلسلہ جاری رکھا۔ اس نے شاہ آباد اور انبالے پر قبضہ کر لیا اور پٹیالے کو بھی اپنے دست تصرف میں لے آتا لیکن اسے اندیشہ تھا کہ اس کارروائی سے صریحاً انگریزوں کے ساتھ نقض عہد ہو گا اس لئے اس نے صرف اس امر پر اکتفا کیا کہ راجہ صاحب سنگھ کو جو پہلے ہی سے خائف ہو رہا تھا اپنے لشکر میں طلب کیا اور اس کے ساتھ پگڑی بدل کر ہمیشہ بھائی چارہ قائم رکھنے کی قسم کھائی۔ اس کے بعد وہ امرتسر واپس چلا گیا۔ یہاں پر انگریزی سفیر 10- دسمبر کو اس کے پاس پہنچ گئے۔

اسی اثناء میں کلکتے سے ہدایات وصول ہو گئیں۔ فرانسیسیوں کے حملہ کرنے کے

عدم امکان کا تقریباً یقین ہوتا جاتا تھا اور ایسے وہمی اندیشے کے مقابلے میں رنجیت سنگھ سے معاہدہ کرنا بے سود سمجھا گیا۔ بہر طور کم از کم ایسی رعایت کے قابل نہ تھا کہ ایسے قوی اور بے اصول فرماں روا کو ان ریاستوں پر اقتدار عطا کیا جائے جو اس سے متنفر اور سرکار انگریزی کے زیر حفاظت آنے کی خواہشمند تھیں۔ رنجیت سنگھ کو مطلع کیا گیا کہ گورنر جنرل کو اس کے ستلج کے جنوب کے ممالک میں رسوخ پیدا کرنے کے باطل دعوے کا حال معلوم ہو کر سخت تعجب اور تشویش ہے اور اس سے زیادہ استعجاب اس امر پر ہے کہ وہ اپنے منصوبوں کی تکمیل کے لئے سرکار انگریزی کی امداد کا خواہاں ہے۔ اسے یہ بھی اطلاع دی گئی کہ سرکار انگریزی دراصل مرہٹوں کی جنہیں اس نے شکست دی جانشین ہے اور لڑائی کے زمانے میں خود مہاراجہ نے ستلج کو حد فاصل قرار دینے کی صلاح دی تھی۔ اس زمانے سے سرکار نے ستلج اس پار کے سرداروں کو تمام قسم کے خراجوں سے بری کر دیا۔ ان کا کسی کا محکوم ہونا گوارا نہ کیا اور انہیں اپنی حفاظت میں بالکلیہ لے لیا ہے۔ یہ بھی کہا گیا کہ مہاراجہ کا سفیر کے ساتھ برتاؤ خلاف اخلاق تھا اور یہ کہ جبکہ گورنر جنرل سے استمزاج کیا گیا تھا تو ایسے موقع پر اس کا ستلج اس پار کے ملک پر حملہ کرنا خلاف آداب تھا۔ مہاراجہ سے مطالبہ کیا گیا کہ ستلج کے جنوب کا جس قدر ملک سرکار انگریزی سے معاملہ رجوع کئے جانے کے بعد فتح کیا گیا ہے واپس کر دیا جائے اور سکھ فوج دریا کے شمال کی جانب واپس طلب کر لی جائے۔

مہاراجہ کو ان شرائط کے متعلق سخت شکایت تھی اور ان کی تعمیل سے پہلوتہی کرنے کی کوشش بیکار تھی۔ اس نے اس کا جواب یہ دیا کہ سفرا تو فرانس کے مقابلے میں معاہدہ کرنے اور اس کے ساتھ دوامی اتحاد کے استحکام کی غرض سے بھیجے گئے تھے لیکن معاہدہ بالکل فراموش کر دیا گیا اور صرف دوستی کا اظہار اس طور پر کیا گیا کہ اس کی دیرینہ آرزو کے بر آنے میں رخنہ اندازی کی گئی۔ وہ اس درجہ ناخوش ہوا کہ لڑائی کے لئے آمادہ ہو گیا۔ فوج اور سامان جنگ ہر طرف سے اکٹھے کئے گئے اور امرتسر کے جدید قلعہ گوبند گڑھ میں فوج و رسد لڑائی کے لئے مہیا کی گئی۔ جنرل محکم چند جو

سکھوں کا بہترین جنرل اور انگریزوں کا سخت دشمن تھا کانگڑے سے واپس طلب کر کے
ستلج پر بھلور کی طرف جو لدھیانے کے محاذ میں تھا روانہ کیا گیا۔ جہاں پہنچ کر اس نے
اپنا پڑاؤ ڈال دیا۔ اس مخاصمانہ نقل و حرکت کا جواب انگریزوں نے یہ دیا کہ کرنل اختر
لونی کے ہمراہ لدھیانے پر ایک فوج روانہ کر دی۔ اختر لونی جب پٹیالے اور نابھے میں
سے ہو کر گزرا تو لوگوں نے اس کا استقبال بہت کچھ اظہار مسرت و اطمینان سے کیا۔
اس اثناء میں لاہور میں معاملات کے تصفئے میں تعویق ہونے لگی۔ سفیر کو یہ باور
کرایا گیا کہ مہاراجہ کا ستلج پر اپنے لشکر میں آکر شامل ہونے سے یہ مقصود ہے کہ جنگ
شروع کر دی جائے اور سفیر نے سپہ سالار کو یہ مشورہ دیا کہ پنجاب پر حملہ کیا جائے
کیونکہ صرف اس طریقے پر اس ناقابل برداشت حالت کا فیصلہ ہو سکتا ہے۔ آخر
مہاراجہ کے مشیروں کی صلاہ نیک کارگر ہوئی اور اب اس کو یہ معلوم ہو گیا کہ مزید
مزاحمت بے سود ہے۔ 2- اپریل 1809ء کو اس نے فرید کوٹ کو خالی کر دیا اور انبالے
کی فوج ستلج کے شمال کی جانب ہٹا لی۔ اب معاہدے کی تکمیل کے لئے کوئی دقت باقی
نہیں رہی اور 25- اپریل کو اس کی تکمیل ہو گئی اور 30- مئی کو گورنر جنرل نے اس پر
دستخط کر دیئے۔ اس معاہدے کی رو سے سرکار انگریزی نے ستلج کے شمال کی جانب
مہاراجہ کے ملک و رعایا کے بارے میں مداخلت کرنے سے احتراز کرنے کا وعدہ کیا اور
مہاراجہ نے یہ اقرار کیا کہ دریا کے جنوبی قطعہ ملک کے سرداروں کے مقبوضات تسلیم
کئے جائیں گے۔ ان سرداروں کے بارے میں یہ اعلان بطور تکملہ شائع ہوا کہ سرکار
انگریزی نے انہیں اپنی حفاظت میں لے لیا ہے۔ ان کے حقوق و اقتدار میں کوئی
مداخلت نہ کی جائے گی اور نہ ان سے کسی قسم کا خراج لیا جائے گا اس شرط پر کہ جب
کوئی ایسا دشمن برسر مقابلہ ہو جو ان کا اور سرکار انگریزی دونوں کا دشمن ہو تو امداد و
معاونت ان کا فرض ہو گا۔

اس وقت سے لے کر پہلی سکھوں کی لڑائی کے وقت تک ستلج اس پار کی تاریخ
لاہور کی تاریخ سے بالکل علیحدہ رہی۔ مہاراجہ نہایت ایمانداری سے اپنے اقرار پر قائم

رہا اور یہ سمجھ کے کہ انگریزوں کی قوت زبردست ہے اس نے ہمیشہ کے لئے ستلج اس پار کے ممالک پر اقتدار حاصل کرنے کے منصوبے کو ترک کیا اور اپنی توجہ افغانوں کو صوبے کے شمالی اضلاع سے خارج کرنے اور ملتان' کشمیر و ڈیرہ جات کو مسخر کرنے کی جانب مبذول کی۔ یہ امر مشتبہ ہے کہ 1809ء کے اوائل میں آیا درحقیقت وہ آمادہ جنگ ہوا تھا۔ مسٹر مٹکاف کا خیال تو یہ ہے کہ وہ حقیقتاً آمادہ ہوا تھا لیکن اس زمانے میں مہاراجہ کی فراست و عیاری کا کماحقہ' علم نہ تھا یہ ممکن ہے کہ وہ شروع سے لے کر آخر تک محض دھمکانے کی غرض سے یہ چال چلا ہو تاکہ سرکار انگریزی کسی طرح اپنے بعض مطالبات سے دستبردار ہو جائے۔ اس ترکیب میں کسی حد تک تو اسے کامیابی حاصل ہو گئی کیونکہ اسے صرف ستلج اس پار کے اضلاع واپس دینے پر مجبور کیا گیا۔ جن پر اس نے اپنی آخری لشکر کشی کے بعد قبضہ کیا تھا۔ اس کے قبل چند سال پیشتر کی لڑائی میں جو ملک اس کے قبضے میں آئے یا اس نے سرداروں کو دے دیئے تھے وہ چھوڑ دیئے گئے گو اسے یہ اجازت نہیں دی گئی کہ ستلج اس پار کے ان سرداروں سے جنہیں اس نے خود ممالک عطا کئے تھے کسی قسم کی اطاعت کا دعویدار ہو۔

مابعد کی فتوحات

اس باب میں اختصار کے ساتھ یہ بیان کرنا مقصود ہے کہ مہاراجہ کو اپنے حریف مسلمانوں اور دوسرے دشمنوں پر کون کون سی فتوحات حاصل ہوئیں۔ شمالی وسطی اضلاع میں اس نے اسلامی اقوام کو کس طرح مغلوب کیا اور ملتان' کشمیر' پشاور اور ڈیرہ جات (24) پر کس طرح اس کا قبضہ ہوا۔

ملتان کے قدیم شہر و ضلع میں شاہی نسل کا ایک افغانی خاندان حکمران تھا جو 1738ء میں نادر شاہ کے حملے کے وقت نواب کی حیثیت سے مامور کئے گئے چونکہ مغلوں کی حکومت کی مجموعی طاقت میں انحطاط چلا آ رہا تھا اس لئے وہ اس امر کی خواہشمند تھی کہ مرکزی حکومت شکست کر کے ان دور و دراز ممالک کو مستحکم کرے جن کو اپنے قابو میں رکھنا اس کے لئے ناممکن ہو گیا تھا 1771ء و 1779ء کے مابین اس شہر پر تھوڑی تھوڑی مدت کے سوا بھنگی سرداروں کا قبضہ رہا اور بالاخر تیمور شاہ نے انہیں نکال باہر کیا اور 1779ء میں مظفر خاں یہاں کا صوبہ دار مقرر کیا گیا۔ یہ شخص بہت جری و مستعد تھا اور اس نے سکھوں اور ہمسایہ اقوام سیال وغیرہ کا جو اس پر حملہ آور ہوئے تھے بڑی بہادری سے مقابلہ کر کے اپنی حکومت قائم رکھی۔ 1802ء میں مظفر خاں نے نوجوان رنجیت سنگھ کو پہلی مرتبہ دیکھا جبکہ وہ لاہور سے ملک کی خفیہ دیکھ بھال کے لئے آیا تھا۔ نواب نے شہر سے 30 میل چل کر ملاقات کی اور دونوں سردار باہم ایک دوسرے کو تحائف دے کر صلح و محبت کے ساتھ جدا ہوئے۔ اس کے بعد 1806ء میں جھنگ کو مغلوب کرنے کے بعد رنجیت سنگھ ملتان کی جانب روانہ ہوا اور شہر کے شمال میں 20 میل کے فاصلے پر مہتم کے مقام پر خیمہ زن ہوا۔ نواب کو اس وقت لڑنا منظور نہ تھا

اس لئے اس نے ستر ہزار روپے دے کر اسے رخصت کر دیا۔ دوسرے سال اس کی آتش حرص پھر بھڑک اٹھی اور چونکہ پہلی مرتبہ اسے باآسانی رقم ہاتھ لگ گئی تھی اس لئے اس نے ملتان پر کثیر فوج کے ساتھ دھاوا کر دیا۔ شہر کے ایک حصے پر قبضہ کر لیا گیا لیکن قلعے پر فتح پانے کے لئے سکھ فوج کی تمام کوشش رائیگاں گئی۔ سردار فتح سنگھ کلیان والا کے ذریعے سے ایک معاہدہ کیا گیا جس کے رو سے رقم کثیر وصول ہونے پر مہاراجہ واپس چلا گیا۔ نواب مظفر خاں نے لڑائی سے تنگ آ کر مکہ کا سفر کیا اور واپس آنے پر اس امر کی کوشش کی کہ انگریز اسے اپنی پناہ میں لے لیں۔ مگر بے سود ہوئی انگریزوں نے انکار کیا۔ کیونکہ ملتان دور تھا اس وقت جس حصہ ملک پر وہ اپنا اقتدار قائم رکھنا چاہتے تھے اس حلقے سے وہ باہر تھا۔

1810ء کے اوائل میں رنجیت سنگھ نے پھر ملتان پر چڑھائی کی۔ اس کے ذرا پہلے ہی خوشاب پر اس کی ملاقات شاہ شجاع سے ہوئی اور جلاوطن حکمران نے سکھوں سے یہ استدعا کی کہ وہ ملتان اپنے قبضے میں لے کر اس کے حوالے کر دیں۔ 1803ء میں مظفر خان نے شاہ شجاع کی فوج کو پسپا کر دیا تھا۔ تالیف قلوب کے لئے متعدد بار اس نے ملتان میں سکونت اختیار کرنے کی اس سے خواہش کی تھی لیکن شاہ شجاع کو یہی دھن لگی رہی کہ شہر و ملک کو فتح کر کے اس کو اپنا بنا لے۔ رنجیت سنگھ نے اس کمزور طبیعت کے بادشاہ کی بڑی آؤ بھگت کی لیکن جب اس سے کچھ رقم پلے نہ پڑی تو اس نے بطور خود ملتان پر قبضہ حاصل کرنے کا ارادہ کر لیا۔ 24- فروری 1810ء کو وہ شہر پناہ تک پہنچ گیا اور اس کے دوسرے روز شہر پر قبضہ کر لیا۔

کچھ عرصے تک قلعے پر بے سود گولہ باری ہوتی رہی اس کے بعد سرنگ لگائی گئی لیکن محصورین نے کامیابی کے ساتھ سرنگ کو اڑا دیا جس سے عطر سنگھ دھاری کا توپ خانہ اڑ گیا اور وہ اور اس کے بارہ آدمی ہلاک ہو گئے۔ 21- مارچ کو پھر جمع ہو کر یکبارگی دھاوا کیا گیا لیکن سکھوں کو نقصان عظیم کے ساتھ پسپا ہونا پڑا۔ لشکر میں اب رسد کی قلت ہو گئی تھی اور سکھوں میں بددلی پھیل گئی۔ دیوان محکم چند ان کا سپہ سالار سخت

علیل تھا۔ بہت سے سردار مارے گئے تھے اور قلعے کی ایک اینٹ تک نہ اکھڑی تھی۔ 25- مارچ کو دوسرا دھاوا کیا گیا لیکن اس کا بھی وہی حشر ہوا اس لئے مجبوراً محاصرہ برخاست کرنا پڑا اور رنجیت سنگھ کو یہ ذلت نصیب ہوئی کہ مظفر خان کی سابقہ پیش کردہ شرائط جن کے قبول کرنے سے وہ پہلے انکار کر چکا تھا اب اسے ان پر رضامند ہونا پڑا۔ شرائط یہ تھیں کہ ڈھائی لاکھ نقد' 20 جنگی گھوڑے اور بوقت جنگ امداد دی جائے۔ مہاراجہ 30 ہزار روپے بطور بیعانہ تاوان وصول کر کے 14- اپریل کو ملتان سے روانہ ہو گیا۔

رنجیت سنگھ نے یہ دیکھ کر کہ اس میں تنہا اتنی قوت نہیں کہ ملتان پر فتح پا سکے گورنر جنرل سے انگریزی فوج بھیج کر کمک دینے کی درخواست کی۔ اس کی اس تحریک پر التفات نہ کیا گیا۔ زیادہ تر اس وجہ سے کہ اس نے یہ بھی تحریک کی کہ بجائے اس کے فوج پنجاب میں سے ہو کر گزرے ستلج کے جنوبی ویران قطعہ ملک میں سے ہو کر جائے۔ شاہ شجاع نے بھی بطور خود ملتان پر دھاوا کرنے کی تیاری کی لیکن اس میں اتنی سمجھ تھی کہ وہ اس مہم سے جس میں اسے کامیابی کی کوئی توقع نہ تھی باز رہا۔

فروری 1816ء میں ایک بے قاعدہ حملہ سکھوں نے ملتان پر کیا۔ ایک مضبوط دستہ فوج خراج وصول کرنے کے لئے بہاولپور ملتان روانہ کیا گیا۔ مظفر خاں کو خراج ادا کرنے میں کچھ دیر لگی تو پھولا سنگھ اکالی نے بھنگ سے بدمست ہو کر دیوانہ وار فدائیوں کی ایک جماعت کے ساتھ شہر پر دھاوا کر دیا اور اس زور سے شور سے حملہ کیا کہ قلعے کی بلائی فصیل کے ایک حصے پر قابض ہو گیا۔ لیکن فقیر عزیزالدین نے معذرت پیش کی جس پر مظفرالدین نے رقم خراج جلد ادا کر دی ورنہ وہ اس قدر جلد ہرگز ادا نہ کرتا۔ سکھ فوج منکیرا کی جانب روانہ ہو گئی۔ 1817ء میں سکھ فوج نے دیوان چند کے زیر کمان ملتان کی جانب کوچ کر کے قلعہ پر حملہ کیا لیکن پسپا کر دی گئی۔ دس ہزار روپے وصول کرنے کے بعد یہ لوگ واپس چلے گئے۔ یہ کارروائی دفع الوقتی کے طور پر کی گئی تھی۔ اس اثناء میں مہاراجہ ایک بڑی مہم کی تیاریاں کر رہا تھا اور اس نے قسم

کھائی تھی کہ ملتان پر جہاں اسے متعدد بار ہزیمت نصیب ہوئی قبضہ حاصل کر کے رہے گا۔ 1817ء کے موسم سرما میں اس نے ہر طرف سے فوج و رسد جمع کرنا شروع کی اور جنوری 1818ء کو اٹھارہ ہزار سپاہیوں کی فوج لاہور سے روانہ ہوئی جس کی سرکردگی برائے نام شہزادہ کھڑک سنگھ کے حوالے تھی لیکن دراصل مشر دیوان چند سپہ سالار تھا۔ ملتان جاتے وقت راستے میں خان گڑھ و مظفر گڑھ کے قلعوں پر قبضہ کیا گیا۔ اوائل فروری میں شہر کا محاصرہ کر کے قبضہ کیا اور قلعے پر گولہ باری شروع کی گئی۔ نواب کے پاس صرف دو ہزار آدمی تھے اور قلعے میں محاصرہ برداشت کرنے کے لئے لڑائی کا سامان اور رسد موجود نہ تھی لیکن پھر بھی اس نے ایسی بہادری سے مقابلہ کیا کہ اس سے قبل سکھوں کو کبھی ایسا موقع پیش نہ آیا تھا۔

2- جون تک گولہ باری ہوتی رہی۔ دیوار میں آخر دو شگاف پڑ گئے کیونکہ احمد شاہ والی توپ زمزمہ جو بھنگیوں کے پاس تھی لاہور سے ساتھ لائی گئی تھی اور چار مرتبہ اس کو کامیابی کے ساتھ کیا گیا۔ سکھوں نے کئی بار حملے کئے لیکن ہر بار وہ پسپا کر دیئے گئے۔ ایک مرتبہ تو ان کے 1800 آدمی ضائع گئے۔ قلعے کا دروازہ اڑا دیا گیا لیکن قلعے کے اندر کی فوج نے ان کے روبرو دھس بنا کر سکھوں سے دست بدست لڑائی کی' قلعے کی مدافعت کرنے والوں کی تعداد گھٹتے گھٹتے اب دو تین سو رہ گئی جس میں سے اکثر تو مظفر خاں کے قبیلے یا خاندان کے تھے باقی یا تو ہلاک ہو گئے یا دشمن سے جا ملے کیونکہ انہیں اپنے آقا کا ساتھ چھوڑنے کے لئے بہت کچھ رشوت دی گئی تھی۔

بالآخر 2- جون کو ایک اکالی نے جس کا نام سادھو سنگھ تھا یہ ارادہ کر کے کہ 1816ء میں پھولا سنگھ نے جو کام انجام دیا تھا اس پر فوقیت لے جائے اپنے چند جری رفقاء کے ساتھ قلعے کی فصیل پر حملہ کر کے افغانوں کو اچانک جا لیا اور وہ اس پر قابض ہو گیا سکھ فوج ایسی کامیابی کو دیکھ کر دھاوے میں شریک ہو گئی اور خضری دروازے کے شگاف تک جا پہنچی۔ یہاں بڈھا نواب مع اپنے آٹھوں بیٹوں اور پسماندہ فوج کے تلوار ہاتھ میں لئے کھڑا رہا اور مرتے دم تک مقابلے کے لئے آمادہ تھا۔ افغان کی تیغ براں کی زد

نے کشتوں کا ڈھیر لگا دیا۔ سکھوں نے پیچھے ہٹ کر اپنی توڑے دار بندوقوں سے باڑ مارنا شروع کیا۔ افغان سردار نے للکار کر کہا "مردوں کی طرح سامنے آ کر لڑو۔" لیکن بھلا سکھ اس دعوت کو کب قبول کرنے والے تھے۔ اس طرح سفید ریش مظفر خان نے پناہ مانگنے سے تنفر کرتے ہوئے اپنے پانچ بیٹوں سمیت داعی اجل کو لبیک کہا۔ چھٹے لڑکے کے چہرے پر سخت زخم آیا باقی دو نے امان طلب کر لی اور بچ گئے۔ محصور فوج میں سے بھی صرف چند ہی آدمیوں کی جان بچی (25) اور تمام شہر میں لوٹ مار مچ گئی۔ قلعہ شجاع آباد بھی مسخر کر لیا گیا اور اس میں سے پانچ توپیں لے لی گئیں۔ بعد ازاں ملتان کے شہر پناہ کی مرمت کی گئی۔ چھ سو سپاہی قلعے میں متعین کئے گئے اور سکھ فوج لاہور واپس چلی گئی۔ مشہور یہ تھا کہ ملتان میں بہت دولت ہے۔ مہاراجہ کو صرف دو لاکھ روپے کا حصہ لوٹ میں ملا۔ اس لئے اس نے یہ حکم دیا کہ تمام عہدیدار اور سپاہی مال غنیمت واپس کر دیں ورنہ ایک تاریخ معینہ تک واپس نہ کیا گیا اور اس کے بعد بھی ان کے قبضے میں رہا تو اس کی سزا موت ہے۔ اس حکم سے 5 لاکھ ریاست کے خزانے میں داخل ہوئے لیکن ملتان کی غنیمت کا اندازہ بیس لاکھ پونڈ کیا جاتا ہے۔ عام لوگوں کا خیال یہ تھا کہ جس کے پاس اس لوٹ کا مال تھا وہ اسے راس نہ آیا۔ بہت سے ایسے لوگ یا محتاج مرے یا لڑائی میں مارے گئے۔ (26)

دوسرے سال 1819ء کے موسم بہار میں مہاراجہ نے کشمیر کو اپنے ملک میں شامل کر لیا۔ ایک عرصے سے اس ملک پر اس کا دانت تھا اور متعدد بار اس پر حملے بھی کئے گئے مگر بے سود ہوئے تھے۔ اس کی فتح سے اس کے مقبوضات کی مقدار دگنی ہو گئی۔ پہاڑیوں اور وادیوں کا یہ عجیب خوشنما قطعہ ملک جو جموں اور پنجاب کی چھوٹی چھوٹی پہاڑیوں کے سلسلے سے آغاز ہو کر اس بڑے پہاڑ تک پہنچتا ہے جس کی بلندی آلپس سے دوگنی ہے اور جہاں ہمیشہ برف جمی رہتی ہے صدیوں سے مختلف فاتحین کا انعام فتح یابی رہا ہے۔ خصوصاً اس کی قدر و منزلت اس لئے ہوتی رہی کہ یہ موسم گرما کے لئے ایک خوشگوار مقام ہے جبکہ ہندوستان کی سرزمین دوزخ کا نمونہ بن جاتی ہے۔ جو لوگ

شمالی جانب سے حملہ آور ہوتے رہے انہیں اپنے وطن طہران و کابل کی خنکی اور خوشنمائی کی یاد ہمیشہ ستاتی رہی اور اس یاد کو وہ کشمیر رہ کر پورا کیا کرتے تھے۔

13 ویں صدی کے آغاز تک کشمیر میں ہندو راجاؤں کی حکومت رہی اس کے بعد 250 سال تک مسلمان خاندان فرمانروا رہا۔ متعدد ناکامیاب مہمات کے بعد 1588ء میں اکبر اعظم نے یہاں مغلوں کی حکومت قائم کی جو ڈیڑھ صدی تک قائم رہی۔ یہی زمانہ تھا کہ منجملہ دوسرے پہاڑی اقطاع عالم کے کشمیر کی شہرت اپنی خوشنمائی کی وجہ سے تمام دنیا میں پھیل گئی۔ ذی اقتدار شہنشاہ جو اس زمانے کے یورپ کے حکمرانوں سے کہیں زیادہ متمول اور عیش پسند تھے۔ اکبر' جہانگیر' شاہ جہاں اور اورنگ زیب سال بہ سال اس کی خوشنما وادیوں میں پہنچا کرتے تھے اور اپنے تمام دربار کو ہمراہ لے جاتے تھے۔ اس تمام قافلے کی سربراہی میں ملک کی تمام آمدنی صرف ہو جاتی تھی۔ کشمیر میں انہوں نے محلات اور تفریح گاہیں بنائی تھیں۔ ان میں سے بعض اب تک موجود ہیں جن سے ان بادشاہوں کی شان و شوکت اور خودغرضی کا ثبوت ملتا ہے جنہوں نے رعایا سے تو اس قدر تمتع حاصل کیا لیکن اس کا بدلہ بہت کم دیا۔

مغلوں کا خاندان گزر گیا تو اس کے جانشین افغان ہوئے جنہوں نے احمد شاہ درانی کی سرکردگی میں 1752ء میں کشمیر فتح کر کے اس پر حکومت کی۔ اس کی اور اس کے جانشینوں کی حکومت اس درجہ جابرانہ اور ظالمانہ تھی کہ مغلوں کی حکومت اس کے مقابلے میں رحمت معلوم ہوتی تھی۔ 70 سال بعد سکھ اس قطعہ ملک کے حاکم بن گئے اور ان کے بعد یہ ملک راجپوتوں کے ہاتھ لگا۔ جموں کے راجہ گلاب سنگھ کو جو رنجیت سنگھ کا ملازم و مشیر تھا کشمیر اور اس کے مضافات کی حکومت انگریزوں کی جانب سے 1846ء میں دی گئی۔

یہ یاد رہے کہ جموں کا تعلق سکر چاکیا خاندان کی قسمت کے ساتھ وابستہ تھا۔ مہاراجہ کے باپ نے اس شہر کو جو اس وقت اس کے بدنصیب رفیق راجہ برج لال دیو کے قبضے میں تھا لوٹ کر غارت کر دیا تھا۔ اس زمانے میں جموں کا کوئی تعلق کشمیر سے

نہ تھا۔ کئی ہزار سال سے یہاں کی حکومت راجپوت نسل کے ہندو خاندان میں چلی آ
رہی تھی اور اگرچہ یہ مغل بادشاہوں کا خراج گزار تھا لیکن ان کی سلطنت کے انحطاط
کے وقت اس نے ان کی حکومت سے سبکدوشی حاصل کر لی اور تھوڑے عرصے تک
اس آزادی کو برقرار رکھا لیکن سکھوں کی روز افزوں قوت نے اسے مغلوب کر دیا۔
سب سے پہلے بھنگی سرداروں نے اس پر چھاپا مارا اور راجہ رنجیت دیوان کو خراج دینے
پر مجبور ہوا اور اس کے بعد سکر چاکیا والوں نے مہان سنگھ کی سرکردگی میں اس کو لوٹا۔
رنجیت دیو کا نام اب تک پہاڑی قطعات ملک میں عزت کے ساتھ لیا جاتا ہے۔ وہ
منصف مزاج اور غیر متعصب منتظم تھا اور یہ امر اس کی رعایا کی بدقسمتی پر محمول کیا جاتا
ہے کہ اس میں مدافعت کی اتنی قوت نہ تھی کہ سکھوں کے مطالبات سے انکار کرتا جو
نئے مذہب کے جوش میں کٹر ہندوؤں کے لوٹنے میں بھی اسی قدر سرگرم تھے جس قدر
وہ مسلمانوں سے متنفر تھے۔ تین بھائی راجگان گلاب سنگھ' دھیان سنگھ' سچیت سنگھ جو
مہاراجہ کے آخری زمانے میں دربار لاہور کے ذی اقتدار اراکین تھے اسی خاندان کے
تھے یا کم از کم انہوں نے اپنا شجرہ جو پیش کیا تھا اس سے یہ ان پڑھ فرمانروا مرعوب ہو
گیا تھا۔ جموں کی وراثت کے متعلق ان کا حق مرجح سمجھا گیا۔ ان کے راجہ نسل سے
ہونے یا نہ ہونے کے قطع نظر ذاتی اوصاف و فراست کے اعتبار سے یہ لوگ ممتاز تھے
اور ایسے فرقے میں کامیابی کے زیادہ مستحق تھے جہاں اوصاف حمیدہ حماقت اور صرف
مکر و دغا یقینی ذرائع کامیابی تھے۔

1811ء میں مہاراجہ نے کشمیر فتح کرنے کی تیاری کی اور پہلے بھمبر اور راجوڑی
کی پہاڑی ریاستوں کو مغلوب کیا جہاں راجپوت نسل کے مسلمان خاندان حکمران تھے
اس کے بعد دوسرے سال کلو کو مغلوب کیا بعدازاں اس نے کابل کے شاہ محمود کے
وزیر فتح خان کے ساتھ اتحاد کیا جو کشمیر کی تسخیر اور وہاں کے صوبیدار عطا محمد خان کو شہر
بدر کرنے کے ارادے سے دریائے سندھ کو عبور کر آیا تھا۔ یہ معاہدہ صرف اس لئے
کیا گیا تھا کہ جب ایسا موقع جاتا رہے تو اس کو فتح کر دیا جائے۔ مہاراجہ اور فتح خان

دونوں کی نیت یہ تھی کہ جس قدر جلد موقع مل سکے ایک دوسرے کے ساتھ چالبازی کرے لیکن فی الواقع اس معاہدے کی ضرورت تھی کیونکہ دونوں میں کوئی ایک بھی دشمن کی فوج کو پیچھے چھوڑ کر پہاڑیوں میں سے گزر نہ سکتا تھا۔ جنرل محکم چند سکھ فوج کا سپہ سالار مقرر کیا گیا جس کو کشمیر کے مال غنیمت میں سے ایک ثلث دیئے جانے کا وعدہ کیا گیا۔ محکم چند نے فتح خان کے ساتھ جہلم سے کوچ کیا جب فتح خان پیر پنجال پہنچا تو اس نے یہ خیال کر کے کہ مہاراجہ کی عدم مداخلت کے بارے میں کافی احتیاط عمل میں آ چکی ہے اپنی پہاڑی طاقتور فوج کے ساتھ کوچ پر کوچ کرنا شروع کیا اور محکم چند کو اپنے ارادے سے بے خبر رکھا۔ سکھ پہاڑوں میں سے کوچ کرنے کے کبھی عادی نہ تھے اور برف باری کی وجہ سے وہ اور بھی بسرعت نہ چل سکے۔ دیوان محکم چند فتح خان کی نیت سے واقف ہو گیا لیکن اس کی وجہ سے اپنے منصوبے سے باز نہ آیا۔ اس نے راجوڑی کے ایک سردار کو 25 ہزار روپے اس شرط سے دینے کا وعدہ کیا کہ وہ کوئی ایسا راستہ بتا دے جس پر سے ہو کر وہ فتح خان کے پہنچتے ہی وادی میں پہنچ جائے۔ وہ جودھ سنگھ کلیسا اور نہال سنگھ اٹاری اور ایک مختصر فوج کو ساتھ لے کر اس راستے پر روانہ ہوا اور اپنے ارادے میں کامیاب ہوا۔ شیر گڑھ اور ہری پربت پر قبضہ کرنے اور وادی کی تسخیر کے عین موقع پر وہ جا پہنچا۔ وادی اور قلعے کی تسخیر کوئی دشوار امر نہ تھا کیونکہ صوبہ دار بھاگ گیا تھا اور کسی قسم کی مزاحمت نہ ہوئی۔ لیکن محکم چند کی فوج بہت مختصر تھی اور اس سے کوئی کام نہیں لیا جا سکتا تھا۔ فتح خان نے اس امر کا اعلان کیا کہ سکھ مال غنیمت میں کوئی حصہ پانے کے مستحق نہیں ہیں۔

شاہ شجاع سابق فرمانروائے کابل جو کشمیر میں بطور قیدی رکھا گیا تھا دیوان محکم چند کے حوالے کیا گیا جو اسے لاہور لے گیا۔ مہاراجہ یہ سن کر بہت ناراض ہوا کہ وزیر فتح خان نے مال غنیمت میں حصہ دینے سے انکار کیا اور اس نے مصمم ارادہ کر لیا کہ اس سے اس کا بدلہ لے۔ اس نے کشمیر کے سابق صوبیدار کے بھائی جہانداد خان سے نامہ و پیغام شروع کیا جو اٹک کے قلعے پر قابض تھا جہاں سے وہ دریائے سندھ کے راستے کی

نگرانی بخوبی کر سکتا تھا۔ مہاراجہ نے جہانداد خان کو اس بات پر آمادہ کر لیا کہ قلعہ سکھوں کے حوالے کر دیا جائے۔ اب فتح خان کو ناخوش ہونے کی باری آئی اس نے قلعہ حوالے کر دینے کے لئے مطالبہ کیا لیکن رنجیت سنگھ نے کہلا بھیجا کہ جب تک کشمیر کے مال غنیمت کا حصہ اسے نہ دیا جائے گا اس وقت تک قلعہ حوالے نہیں کیا جا سکتا۔ اپریل 1813ء کو فتح خان کشمیر سے روانہ ہوا اور اپنے بھائی عظیم خاں کو صوبیدار مقرر کر گیا۔ اب اس نے اٹک کا محاصرہ کیا لاہور سے بعجلت کمک روانہ کی گئی اور پھر محکم چند سپہ سالار بنایا گیا۔ عرصے تک فوجیں ایک دوسرے کے مقابل پڑاؤ ڈالے رہیں وقتاً فوقتاً جنگ ہوتی رہی جس میں سکھوں کا زیادہ نقصان ہوا۔ سکھ کھلم کھلا مڈبھیڑ کرتے ڈرتے تھے۔ قلعے کے اندر کی تمام رسد ختم ہو گئی اور اس وقت اس امر کی ضرورت ہوئی کہ یا تو اس محصور فوج کی مدد کی جائے یا قلعہ بالکل دشمن کے حوالے کر دیا جائے۔ محکم چند نے اب مقابلے کا مصمم ارادہ کر لیا۔ حیدرو پر جو اٹک سے چند میل کے فاصلے پر تھا وہ مقابلے کے لئے صف آراء ہوا۔

لڑائی کا آغاز دوست محمد خان نے کیا جو بعد میں کابل کا مشہور فرمانروا ہوا۔ اس نے سواروں کا دستہ لے کے بڑی بہادری سے حملہ کیا جس سے سکھوں کا پرا توڑ دیا۔ سکھوں کی فوج کے ایک بازو میں بالکل بدنظمی پھیل گئی چند توپیں ہاتھ سے نکل گئیں۔ افغان یہ سمجھ کر کہ کامل فتح حاصل ہو گئی ہے لوٹ مار کرنے کے لئے منتشر ہو گئے۔ اس وقت دیوان محکم چند نے خود محفوظ فوج کی سرکردگی کر کے دشمن کو ہر مقام سے بڑے نقصان کے ساتھ پسپا کر دیا۔ فتح خان اس سے قبل ہی بھاگ گیا تھا کیونکہ اسے یہ خیال ہو گیا تھا کہ دوست محمد خان مارا گیا ہے۔ افغان فوج کابل کی جانب واپس گئی جہاں پہنچ کر وزیر فتح محمد خان نے ہرات پر فوج کشی کی تاکہ اٹک کی ناکامیابی کا دھبہ مٹائے۔ حیدرو کی مہم 13 جولائی 1813ء کو سر ہوئی یہ پہلا موقع تھا کہ مہاراجہ نے افغانوں کا مقابلہ میدان مصاف میں کیا۔ اس کا نتیجہ اہم اور آئندہ کے لئے نہایت مفید ہوا۔ لیکن سکھوں کو جو اعتماد اس موقع پر اپنی ذات پر حاصل ہو گیا تھا اس سے وہ اگلے برس کی

شکست سے محفوظ نہ رہ سکے۔ اگلے سال رنجیت سنگھ نے یہ خیال کر کے کہ فتح خان موجود نہیں اور افغان فوج درہم برہم ہے کشمیر پر آسانی سے قبضہ ہو جائے گا سیالکوٹ میں جموں کے نیچے میدان میں فوج کثیر فراہم کر کے وادی کی جانب کوچ کرنے کی تیاری کی۔ دیوان محکم چند سپہ سالار اعظم بیمار تھا اور چند ہی مہینوں کے بعد اس کا انتقال ہو گیا۔ اس نے مہاراجہ کو باصرار باز رکھنے کی کوشش کی اور یہ سمجھایا کہ موقع مناسب نہیں ہے کیونکہ پہاڑی راجہ دشمن ہو رہے ہیں اور رسد اور بار برداری کافی نہیں ہے لیکن مہاراجہ نے اس کی ایک بات نہ مانی۔ اس نے خود ایک حصہ فوج کو کمان میں لیا اور دوسرا حصہ دیوان رام دیال کی سرکردگی میں دیا جو محکم چند کا پوتا اور ایک دلیر نوجوان تھا اور اس سے پہلے کئی مہمات میں کارہائے نمایاں انجام دے کر نام پیدا کر چکا تھا۔ راجہ اگر خان نے جو راجوڑی کا راجہ تھا جہاں رنجیت سنگھ نے پہلا پڑاؤ کیا مہاراجہ کو یہ صلاح دی کہ اپنی فوج کو دو حصوں میں تقسیم کر کے ایک حصے کو اپنے ہمراہ پونچھ کے راستے سے لیجائے اور دوسرے کو رام دیال کی سرکردگی میں بہرام گلا کے راستے سے روانہ کر دے۔ یہ تجویز پہاڑی راستوں کی دشواریوں کے لحاظ سے گو ضروری ہو لیکن بدقسمتی سے اس کا نتیجہ برعکس نکلا۔ ایک حصہ دوسرے حصے کی مدد نہ کر سکتا تھا اور کارگزار دشمن دونوں کو یکے بعد دیگرے برباد کر سکتا تھا۔ کشمیر کے صوبیدار نے ایسا ہی کیا اور عین اس وقت جبکہ سکھ کوچ اور سفر سے بالکل تھکے ماندے پیر پنجال کے درے سے نیچے وادی میں اترے ہی تھے اس نے اپنی تمام فوج سے رام دیال کے دستہ فوج پر حملہ کر دیا۔ رام دیال گو بڑی بہادری سے لڑا لیکن دشمن کی فوج کثیر تھی کچھ بس نہ چل سکا اور اس کے بہت سے سپاہی مارے گئے۔ بہرحال وہ لڑتا بھڑتا وادی کے ایک محفوظ مقام تک جا پہنچا اور وہاں کمک کا منتظر رہا۔ مہاراجہ نے بھائیا رام سنگھ کی سرکردگی میں کمک روانہ کی۔ یہ سردار بہت کارگزار تھا مگر رام دیال کی کسی قسم کی مدد نہ کر سکا اور مہاراجہ کے پاس واپس آیا رنجیت سنگھ نے یہ دیکھ کے کہ دشمن کی اس سے بہتر اور فتح مند فوج کے مقابلے میں آگے بڑھنا ناممکن ہے واپسی کا قصد کیا۔ عقب

میں پہاڑی راجہ اٹھ کھڑے ہوئے۔ کثرت بارش سے ندی نالوں کے چڑھنے سے راستہ ناقابل گزار ہو گیا۔ سخت دشواریوں اور بھاری نقصان اٹھا کے رنجیت سنگھ پہاڑی راستوں سے نکل کے لاہور واپس آیا۔ رام دیال تنہا رہ گیا تھا مگر اس نے اپنے بل بوتے پر وہ مردانگی دکھائی کہ عظیم خان کو مجبوراً اس دشمن کے ساتھ تصفیہ کرنا پڑا جس کو وہ ہلاک نہ کر سکا۔ اس نے اسے صحیح سلامت پنجاب واپس جانے دیا۔

اس مہم کا انجام تباہی تھا اور رنجیت سنگھ کی فوجی قابلیت نے کوتاہی کی لیکن اس کا استقلال فوجی قابلیت سے کہیں زیادہ عجیب و غریب تھا۔ دوسرے سال وہ پھر کشمیر پر قبضہ کرنے کا موقع ڈھونڈ رہا تھا۔ یہ موقع اسے فوراً نہ مل سکا کیونکہ وزیر فتح خان ہرات و کابل سے واپس آ کر اپنے بھائی صوبیدار عظیم خان کے ساتھ مل گیا اور دونوں کی متحدہ قوت پر حملہ کرنا مشکل تھا۔ بہرحال رنجیت سنگھ نے راجوڑی راجہ سے اس کی دغا بازی کا بدلہ لیا اور اس کے محل و شہر میں آگ لگا دی۔ آخرکار 1819ء میں اسے موقع ہاتھ لگ گیا۔ صوبیدار کی عدم موجودگی میں اس نے مشر دیوان چند کی سرکردگی میں ایک بڑی فوج کشمیر کی جانب روانہ کی۔ دیوان چند نے اس سے ایک سال قبل ملتان پر فتح پائی تھی۔ رام دیال کو عقب کے فوج کی کمان دی گئی۔ مگر وہ کثرت بارش کی وجہ سے نہ فوراً آگے بڑھ سکا اور نہ لڑائی میں کوئی کام کر سکا۔ لیکن اس وقت مقابلہ بھی کچھ زیادہ نہ ہوا۔ جبار خان جو قائم مقام تھا بھاگ نکلا اور کشمیر کا صوبہ رنجیت سنگھ نے اپنے ملک میں شامل کر لیا۔ موتی رام دیوان محکم چند کا بیٹا اور رام دیال کا باپ پہلا صوبیدار مقرر کیا گیا۔

اس وقت سے اس زمانے تک جب انگریزوں نے گلاب سنگھ کو یہ صوبہ عطا کیا یہاں کے حالات سکھوں کے دوسرے اضلاع سے کچھ علیحدہ نہ تھے بجز اس کے کہ صوبہ لاہور سے دور تھا اس وجہ سے صوبیدار رعایا کے ساتھ معمول سے زیادہ جبر و تعدی کرتے تھے۔ کیونکہ وہ ہر قسم کے مواخذے سے بالکل مطمئن تھے بعض اوقات ان لوگوں کی جبر و زیادتی اس حد تک ناقابل برداشت ہو جاتی کہ رعایا بغاوت کرتی جو

عوام الناس کی جانب سے حکام کے ظلم و زیادتی کا جواب ہوتا ہے۔ مہاراجہ متنبہ ہو کر ظالم نائب کو بدل کے کسی اور کو مقرر کر دیتا جس کا لالچ اس سے کمتر ہو۔ دیوان موتی رام اور اس کا چھوٹا لڑکا کرپا رام بہ ہیت مجموعی اس سخت زمانے کو مدنظر رکھتے ہوئے سب سے اچھے صوبیدار تھے اور ان کا دور حکومت 1831ء تک رہا۔ جس میں صرف دو مرتبہ وقفہ پڑا۔ پہلا تو ایک کاہل شخص تھا جو نظم و نسق کے جھگڑوں میں کم پڑتا تھا دل سے نیک تھا اور لوگ اس سے محبت کرتے تھے۔ جب 1820ء میں اس کا بڑا بیٹا رام دیال ہزارہ میں مارا گیا تو اس نے ملازمت کو استعفیٰ دیا تاکہ بنارس جا کر بودوباش اختیار کرے۔ مہاراجہ نے ہری سنگھ نلوا جنگجو سردار کو اس کا جانشین مقرر کر کے روانہ کیا۔ لیکن اس شخص کے خیالات اصول سلطنت کے بارے میں اس قدر دقیانوسی تھے کہ کشمیریوں نے بغاوت کی اس لئے موتی رام کو پھر بھیجنا پڑا جو 1826ء تک وہاں صوبیدار رہا جبکہ راجہ دھیان سنگھ کی افترا پردازیوں سے اس خاندان کی عزت و وقعت مہاراجہ کے دربار میں کم ہو گئی تھی اور اس کی جگہ دیوان چنی لال ایک معمولی شخص ڈیڑھ سال تک کام انجام دیتا رہا۔ اس کے بعد دیوان کرپا رام صوبیدار مقرر کیا گیا۔ یہ شخص ذی فہم تھا اور باوجودیکہ ویش تھا لیکن اس کے خیالات بہت عالی تھے۔ اس نے راجدھانی میں عمدہ عمدہ عمارتیں اور تفریح گاہیں بنا کے اسے بہت آراستہ کر دیا۔ سری نگر کا رام باغ جہاں مہاراجہ گلاب سنگھ کی یادگار قائم ہے اسی کا لگایا ہوا ہے۔

1828ء میں کشمیر کو زلزلوں کی وجہ سے بہت کچھ نقصان پہنچا بہت سے سرکاری اور رعایا کے مکانات برباد ہو گئے اور بکثرت جانیں تلف ہوئیں۔ زلزلے کے بعد ہیضہ آیا۔ یہ وبا اس وبا سے زیادہ مہلک تھی جس نے موتی رام کے زمانے میں ملک کو ویران کر دیا تھا۔ 1831ء میں پھر دیوان کرپا رام کو راجہ دھیان سنگھ کی دشمنی کے باعث نقصان اٹھانا پڑا اس نے ٭ بھمبر کے راجہ فیض طالب خان کو اپنی حفاظت میں رکھا تھا جس سے دونوں ڈوگرا راجہ متنفر تھے اور اس کو قید کر لینا چاہتے تھے اور کرپا رام نے اس کے حوالے کرنے سے قطعی انکار کیا تھا۔ اسے کشمیر سے بلا لیا گیا اور اس کے بعد

ہی وہ پنجاب سے نکل کر اپنے باپ کے پاس بنارس چلا گیا۔ تین پشتوں تک اس کے خاندان نے مہاراجہ کی خدمت گزاری میں کارہائے نمایاں انجام دیئے تھے لیکن اس کی وجہ سے وہ رنجیت سنگھ کی ناقدری کے سلوک سے محفوظ نہ رہ سکا۔ رنجیت سنگھ کو ایسے لوگوں کی کوئی پروا نہ ہوتی تھی جو اپنا کام کر چکتے تھے یا جن سے اس کا کوئی نیا منظور نظر برسرِ پرخاش ہوتا تھا۔ رنجیت سنگھ کی یہ خودغرضی اور وفادار اشخاص کے ساتھ بدسلوکی کرنے کے بہت ہی بدنما دھبے اس کے دامن پر ہیں۔ دیوان محکم چند جو دیوان خاندان کا بانی تھا اس کا بہترین فوجی افسر تھا جسے ہمیشہ کامیابی حاصل ہوتی رہی اور زیادہ تر اسی کی فوجی قابلیت کی بدولت مہاراجہ پنجاب کا بلا شرکت غیرے حاکم بنا۔ لیکن یہ تمام خدمات اس کے بیٹے موتی رام یا اس کے پوتے کرپا رام کو تذلیل' تاوان' ضبطی جائیداد اور بالاخر انہیں برباد ہونے سے نہ بچا سکیں۔

1809ء میں مہاراجہ نے کانگڑا اور اس کے گردونواح کے پہاڑی اضلاع کو مسخر کر لیا تھا۔ یہ واقعہ بھی اس کی فطرتی دغا بازی کی یادگار رہے گا۔ راجہ سنسار چند کٹوچ راجپوتوں کے شریف ترین خاندان کا سرگروہ تھا اور اس کی ذاتی قابلیت اور قدامت خاندانی کی وجہ سے اس کی بڑی تعظیم کی جاتی تھی۔ اٹھارہویں صدی کے ربع آخر میں جب کہ ہلچل مچی ہوئی تھی اس نے آس پاس کی راجپوت ریاستوں پر اپنی حکومت قائم کر لی اور کئی بار اس کے دشمن باہم متحد ہو کر برسر مقابلہ ہوئے لیکن وہ مدافعت میں کامیاب رہا۔ 1784ء میں اس نے سردار جے سنگھ کنہیا سے کانگڑا کا مشہور قلعہ حاصل کیا جسے اس زمانے کی فوج اور توپ خانہ مسخر نہ کر سکتا تھا اور جس پر قبضہ ہونے سے آس پاس کے ملک پر اس کی دھاک بیٹھ گئی۔ مہاراجہ عرصے سے اس کارآمد جگہ سے اس کو بیدخل کرنے کی تاک میں لگا ہوا تھا۔ یہ موقع اسے اس وقت نصیب ہوا جبکہ کہلور راجہ مان سنگھ کے بلانے پر گورکھوں نے کانگڑا پر حملہ کر کے قلعہ کا محاصرہ کر لیا۔ محاصرے نے کئی سال تک طول کھینچا اور سنسار چند مستقل مزاج دشمن کو آخر تھکا دیتا لیکن کیسی بری گھڑی تھی کہ اس نے رنجیت سنگھ سے مدد چاہی جس نے طرفین

سے سازش کر کے قلعے پر قبضہ کر لیا۔ اپنی فوج کو نیپال کے جنرل امر سنگھ تھپہ کی امدادی فوج ظاہر کیا۔ قلعے میں داخل ہوتے ہی اس نے دونوں راجپوت اور گورکھوں پر قہقہہ لگایا اور خود قلعے پر قابض ہو گیا۔ یہ دھوکے کی چال بہت کامیابی کے ساتھ انجام دی گئی اور ویسی ہی اس تحسین کی اور قدر کی سزاوار ہے جو تواریخ میں ایسی غداریوں کی ہوتی رہی ہے۔

اس واقعے کے کئی سال بعد مہاراجہ رنجیت سنگھ نے کانگڑا کی تمام ریاستوں پر قبضہ کر کے ان کو اپنے ملک میں شامل کر لیا۔ راجہ سنسار چند مر چکا تھا۔ اس کا بیٹا انرودھ چند اپنی ریاست میں باج گزار کی حیثیت سے تھا راجہ دھیان سنگھ نے جو مہاراجہ رنجیت سنگھ کو ہمیشہ برائی کی ترغیب دیتا اور اپنے آپ کو جموں کے قدیم خاندان کا جائز وارث ثابت کرنے کی کوشش کرتا رہتا تھا مہاراجہ کو اس بات پر آمادہ کر لیا کہ انرودھ چند کی بہن کی شادی اس کے بیٹے ہیرا سنگھ کے ساتھ کرا دی جائے جو ایک خوبصورت نوجوان اور دربار میں ہردلعزیز تھا۔ غیور راجپوت نے جو کٹوچھ خاندان کی اولاد ہونے کی وجہ سے ڈوگرا راجہ کو نودولت سمجھ کے نظر حقارت سے دیکھتا تھا اس نسبت سے قطعاً انکار کیا اور اپنے خاندان کو ہمراہ لے کر لاہور سے ستلج عبور کر کے سرکار انگریزی کی حفاظت میں چلا گیا۔ مہاراجہ نے اس دو ٹوک جواب سے ناراض ہو کر اس کی تمام جائیداد ضبط کر لی اور اگلے سال 1829ء میں اس راجپوت راجہ کا سر نیچا کرنے کے خیال سے اس نے خود انرودھ کی دو ناجائز سوتیلی بہنوں سے شادی کر لی جن میں سے ایک تو اس کی زندگی میں مر گئی اور دوسری اس کے مرنے پر ستی ہوئی۔

مہاراجہ کے پشاور اور ہزارہ کے پہاڑی ملک کی فتح کا مختصر ذکر مناسب ہے یہ بڑی طولانی اور دشوار مہم تھی جس میں اس کا بہت سا روپیہ افسر اور فوج ضائع ہوئی نیز پنجاب کے اسلامی قبائل کے مغلوب کرنے کا حال جو ویسے ہی جنگ جو اور بہادر تھے جیسے سکھ۔ ان فرقوں میں جس چیز کی کمی تھی وہ صرف یہ تھی کہ ان میں باقاعدہ انتظام اور ایکا نہ تھا اور یہی اوصاف تھے جو مہاراجہ میں نمودار تھے اور جس کی وجہ سے وہ ان

زقوں سے ہر ایک کو جداگانہ مغلوب کر سکتا تھا اگر یہ باہم متفق ہو جاتے تو بڑی کامیابی سے ہٹا سکتے تھے۔ کوئی مسلمان ایسا قابل نہ تھا جو اپنے پیغمبر (صلی اللہ علیہ وسلم) کے سبز نشان کے نیچے اپنے ہم مذہبوں کو جمع کر کے شمالی پنجاب میں ایسی اسلامی سلطنت قائم کر سکتا جو لاہور کی سکھ حکومت کی حریف اور مدمقابل ہوتی۔ چند اشخاص نے جن میں مجنونانہ مذہبی جوش تھا مثلاً سید احمد شاہ نے پہاڑی جنگجوؤں کی متضاد جماعتوں کو اکٹھا کر کے بے انتہا سراسیمگی پیدا کر دی اور سکھوں اور دوسرے کافروں کے خلاف جہاد کرنے کا وعظ کیا لیکن ان کا جوش پھوس کی آگ کے مثل بھڑک کے رہ گیا۔ انہوں نے صرف بگاڑ دیا مگر کچھ بنا نہ سکے۔ موٹی سمجھ والے قوی اور اپنی ہٹ کے پورے سکھوں کو لازمی طور پر فتح نصیب ہوئی اور وہ اس کے مستحق تھے جن کی رہنمائی پر ان کا مستقل مزاج مہاراجہ تھا جس کا عمل دریا کے چڑھاؤ کی طرح آہستہ مگر یقینی اور ناقابل مزاحمت تھا۔

سکھوں اور ان کے راجہ کے حالات سے انگریز قارئین کو غلط فہمی ہو گی اگر یہ خیال ذہن نشین ہو جائے کہ پنجاب ایسا صوبہ ہے جس میں خصوصاً ہندو لوگ بستے ہیں اور انہی میں سے گورو گوبند سنگھ کا مروجہ مذہب کے خلاف قائم کردہ گروہ دفعتہً "غیر معمولی اہمیت حاصل کر گیا۔ پنجاب آج بھی اور رنجیت سنگھ کے زمانے میں بھی ہندو مسلمان دونوں میں تقریباً مساوی طور پر منقسم ہے۔ جنوبی اور وسطی اضلاع کے بڑے شہروں میں مسلمانوں کی تعداد زیادہ ہے لیکن عموماً یہ کہا جا سکتا ہے دریائے چناب کے مشرقی اضلاع میں ہندو ہیں اور مغرب میں مسلمان' جس قدر ہم سرحد اور پہاڑی سلسلوں کی طرف بڑھتے چلے جائیں ہندو آبادی کی مقدار فیصدی برابر کم ہوتی جاتی ہے یہاں تک کہ سرحدی اضلاع کی آبادی میں قریب قریب مسلمان ہی پائے جاتے ہیں بجز تجارت پیشہ یا ساہوکاروں کے جو اکثر ہمیشہ ہندو ہوتے ہیں' یہاں تک وسط ایشیا کے شہروں میں جہاں تعصب زیادہ ہے یہ لوگ آباد اور خوش حال ہیں۔ مسلمانوں کے بہت سے فرقے قدیم ہیں اور بہت اہمیت رکھتے ہیں جن میں گکھڑ' جودرے' جنجوعے' اعوان'

ٹوانے، سیال، کھرل، سیال، کھرل، کھتر، گھیبے اور کھوکھر خاص طور پر قابل ذکر ہیں جو لاہور کے مغربی سمت کے غیر کوہستانی ملک یا دریائے سندھ اور چناب دریاؤں (27) کے درمیان بیھڑاور کوہستانی ملک میں آباد ہیں۔ ان میں سے بعض اپنے آپ کو پردیسی نسل سے بیان کرتے ہیں مثلاً گکھڑ فارس سے۔ اعوان افغان یا باختری یونانیوں سے۔ لیکن اس دعویٰ کو کوئی خصوصی اہمیت حاصل نہیں۔ کیونکہ یہ بات ہندوستان میں آباد تمام آریائی نسلوں کے بارے میں درست ہو سکتی ہے جو غیر ملکی فاتحین کے مسلسل حملوں کے باعث معرض وجود میں آئیں۔ ان فرقوں کے گزشتہ حالات سے یہ ثابت ہو سکتا ہے کہ ان کے ماقبل کے واقعات راجپوت اور جاٹوں سے کسی خصوصیت کے ساتھ مختلف تھے۔ دوسری اور ہندو ذاتوں کی طرح ان پر بھی صحیح اور حقیقی طور پر ہندی الاصل کا اطلاق ہوتا ہے۔ ان کے ابتدائی زمانے میں اسلام قبول کرنے سے ان کی قومی خصوصیات کو تغیر یا نقصان پہنچنے کے بجائے اور مستحکم کر دیا۔ ان فرقوں میں سے اکثر کا باہمی تعلق عام آشکارا ہے۔ ٹوانے، سیال، گھیبے اور بھاولپور کے داؤد پترے سب کے سب یکجدی ہیں گو مؤخرالذکر اپنا سلسلہ نسب حضرت عباس (رضی اللہ عنہ) سے ملا کے دل خوش کرتے ہیں جو حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے عم بزرگوار تھے۔ لیکن یہ لوگ اور پنجاب کی دوسری قدیم ذاتوں کی طرح راجپوت نسل کے ہیں۔ غالباً پنجاب پر راجپوتوں نے تین مرتبہ چڑھائی کی پہلے تو اس زمانے میں جبکہ تاریخ کی بنیاد ہی نہ پڑی تھی تقریباً ڈھائی ہزار سال قبل مسیحؑ، کوٹچھ اور چمبہ اور جالندھر کی پہاڑیوں کے راجگان جن کے آباؤ اجداد باری اور چنا کے دوآب پر حکمران تھے اب ان لوگوں کے یادگار ہیں۔ دوسرا نقل مکان اس کے ایک ہزار سال بعد واقع ہوا اس وقت او جمیدا نے جو ہستناپور کی ریاست کے بانی کا فرزند تھا۔ اپنے یا دو راجپوتوں کو جہلم کے شمالی جانب لے جا کر ایک خاندان کی بنیاد ڈالی جس کی حکومت اس قطعہ ملک پر رہی جو راولپنڈی سے لے کر ملتان تک پھیلا ہوا ہے۔ سب سے آخر تارک وطن جنوب کی سمت سے آئے جن کا سلسلہ عرصے تک دسویں صدی عیسوی سے لے کر پندرہویں

صدی عیسوی تک جاری رہا۔ اس وقت مختلف اقوام کے راجپوت پنجاب میں آئے۔ انہیں کی اولاد جاٹ' ٹوانے' سیال' کھیپے' کھوکھر اور دوسرے مشہور فرقے ہیں۔

ہندوستان کی دیسی فوج کا ممتاز حصہ پنجابی مسلمان ہیں۔ اگرچہ میں نے اس سے قبل یہ بیان کیا ہے کہ بحیثیت مجموعی صلح و جنگ' امن چین کے زمانے میں چھاؤنیوں کی مخرب اخلاق زندگی یا لڑائی کے ہولناک جوش و خروش میں سکھ بہترین فوجی مواد تصور کئے جاتے ہیں لیکن پنجابی مسلمان بھی ان سے کچھ ہیٹے نہیں ہیں۔ لڑائی کے مواقع پر ان کا جوش و خروش اور بھی زیادہ ناقابل مزاحمت ہوتا ہے اور ان کی بہادری اور جنگ کا شوق ویسا ہی بڑھا ہوا ہے جیسا کہ سکھوں کا لیکن لڑائی کے رک جانے سے انقلاب یا شکست کے موقعوں پر ان کا استقلال سکھوں کا سا نہیں اور نہ وہ امن کے زمانے میں اپنے وطن سے دور فوج میں رہ کر کام کرنا پسند کرتے ہیں۔ وہ سکھوں کی طرح عام طور پر مفید نہیں ہیں' نہ تو وہ پیشہ ور ہیں اور نہ ہی مزاجاً" فوجی خدمت کی خوبیوں اور برائیوں کو یکسر قبول کرتے ہیں۔ لیکن وہ بہترین جنگ جو ہیں۔ چنانچہ ٹوانوں' سیالوں اور ملتانیوں نے 1849ء و 1857ء میں انگریزوں کی طرف جنگ میں کارہائے نمایاں انجام دے کر امتیاز حاصل کیا۔

مہاراجہ نے پہلے ان فرقوں پر حملہ کر کے مغلوب کیا جو لاہور کے گرد و نواح میں تھے۔ سب سے پہلے کھرلوں سے اس کی مڈبھیڑ ہوئی جن کے 40 مواضعات شیخوپورہ اور جھنگ کے قریب تھے۔ یہ لوگ بہت شورہ پشت اور چور تھے اور کسی کی ماتحتی انہیں گوارہ نہ تھی۔ دوسرے مسلمان فرقوں کی بہ نسبت ان میں مذہبی غلو زیادہ تھا۔ انہوں نے ہندوؤں کی حکومت کو بڑے اکراہ سے مانا اور دیوان ساون مل اور دوسرے سکھ سرداروں کو ان کی روک تھام کرنے میں اپنی تمام قوت صرف کرنی پڑی کیونکہ جب کبھی کوئی باقاعدہ فوج ان کے مقابلے پر روانہ کی جاتی تو یہ لوگ گھنے جنگلوں اور وادیوں میں جا چھپتے اور وہاں ان کا تعاقب کرنا دشوار ہوتا۔ 1803ء میں مہاراجہ نے ان کا علاقہ اپنے ملک میں شامل کر لیا اور اس کے بعد ان کے پڑوسی سیالوں کی جانب رخ کیا جو

جھنگ' لیہ اور چنیوٹ کے قریب رہتے تھے اس نے ان کے سردار احمد خاں سے ساٹھ ہزار سالانہ خراج وصول کیا اور تین سال کے بعد ان کا ملک چھین کر سردار فتح سنگھ کلیان والا کو زراعت کے لئے دیدیا۔ ٹوانہ اس وقت اس قدر قوی تھے کہ ان پر کھلم کھلا حملہ کرنا دشوار تھا گو کہ 1803ء میں مہاراجہ نے ان کے سردار خاں بیگ خاں کو عیاری سے گرفتار کر کے اس کے بھائی کے پاس بھیج دیا جس نے اسے قتل کر دیا۔ رنجیت سنگھ کو اس کے معاوضے میں ایک لاکھ روپے مل گئے۔ 1817ء سے قبل وہ ٹوانہ کے سردار پر بمقام نور پور حملہ کر کے اس کا قلعہ فتح نہ کر سکا گو احمد یار خاں نے جو اس وقت سردار تھا پھر اپنا ملک واپس لے لیا لیکن یہ قبضہ عارضی تھا۔ منکیرہ کے نواب کی مدد سے جو اس کا رقیب و دشمن تھا رنجیت سنگھ کی اطاعت قبول کرنے پر وہ مجبور کیا گیا۔ 1821ء میں جب مہاراجہ نے منکیرہ کے نواب حافظ احمد خاں پر حملہ کیا تو اس وقت ٹوانوں کو بدلہ لینے کا موقع ہاتھ آیا۔ یہ لوگ بہت جوش و خروش سے اس مہم میں شریک ہوئے منکیرہ عین صحرا میں واقع تھا اور اس کے گرد 12 قلعے تھے جن سے باہر ملک میں کہیں ایک بھی کنواں نہ تھا۔ اس لئے اس کام میں بہت دشواریاں تھیں۔ مہاراجہ بذات خود فوج کی کمان کر رہا تھا۔ اس کا استقلال تمام قدرتی دشواریوں پر غالب آیا۔ وہ آہستہ آہستہ آگے بڑھتا اور راستے میں کنویں کھدواتا چلا گیا اور بالآخر قلعے کا محاصرہ کر لیا جو 25 دن کے بعد حوالے کر دیا گیا۔ نواب کو ڈیرہ اسمٰعیل خاں کی صوبہ داری پر بحال رکھا جو نہایت شورش انگیز ضلع تھا جس کو سکھ قابو میں نہ رکھ سکتے تھے۔

اس مہم میں ٹوانوں نے اس درجہ بہادری ظاہر کی کہ مہاراجہ نے ان میں سے 50 اشخاص کو اپنے ہمراہ لیجا کر اپنے ذاتی محافظ دستہ فوج میں مامور کیا۔ یہ لوگ درحقیقت بڑے خوش رو ہوتے ہیں۔ مجھے اب تک فتح شیر خاں اور شیر محمد خاں دو ٹوانہ سرداروں کی صورتیں یاد ہیں جو ایک دوسرے کے رقیب تھے اور جنہیں میں نے 1864ء میں لارڈ لارنس کے دربار کے موقع پر لاہور میں دیکھا تھا۔ اس مشہور تاریخی موقع پر یہ دونوں تمام مجمع میں سب سرداروں سے زیادہ وجیہ نظر آتے تھے۔ قصور کا شہر جو لاہور

سے تقریباً 50 میل جنوب میں ہے ایک مسلمان پٹھان خاندان کا صدر مقام تھا جس نے اٹھارویں صدی کے نصف اواخر میں سکھوں کی مدافعت نہایت کامیابی کے ساتھ کی اور جو 1800ء میں رنجیت سنگھ کے لاہور لینے کے موقع پر اس کے خلاف اتحاد میں شریک ہو گیا تھا۔ مہاراجہ نے کئی مرتبہ اس خاندان پر حملہ کیا اور 1807ء میں اس نے اپنی تمام فوج لے کر قصور پر چڑھائی کی اور نواب قطب الدین کو نکال باہر کیا۔ نواب قطب الدین اپنی ریاست واقع ممدوٹ میں چلا گیا جو ستلج کے جنوبی کنارے پر تھی اور جس پر اب تک اس کی نسل کے لوگ قابض ہیں۔

گھکڑوں کا شجاع فرقہ جس نے ہندوستان کی تاریخ میں کارہائے نمایاں انجام دیئے ہیں کئی سال تک کشمیر پر حکومت کرتا رہا اور ہندوستان کے حملہ آور شہنشاہوں کے ساتھ شان و شوکت سے شریک کار زار رہا۔ سلطان مقرب خاں کی شکست کے بعد جو 1765ء میں گجرات کی فصیل کے نیچے سردار گجر سنگھ بھنگی کے مقابلے میں ہوئی تھی سکھوں سے عہدہ برآ نہ ہو سکا۔ اس وقت اضلاع گجرات' راولپنڈی کا ایک حصہ کثیر اور جہلم گھکڑوں کے قبضے میں تھے۔ مہاراجہ کے نائب بدھ سنگھ سندھانوالیہ اور جموں کے گلاب سنگھ کے جبر و تعدی نے انہیں پامال کر دیا۔ 1818ء میں ان کا رہا سہا اقتدار بھی جاتا رہا۔ سرکار انگریزی ہی کا حصہ تھا کہ اس خاندان کی گم شدہ دولت کسی قدر پھر اس کے ہاتھ لگی۔

اعوان فرقہ اس قدر پراگندہ تھا کہ سکھوں کا مقابلہ کامیابی کے ساتھ نہ کر سکتا تھا۔ ان کا خاص گاؤں شمس آباد جنرل محکم چند نے 1813ء میں اس پاداش میں برباد کر دیا کہ ان لوگوں نے اٹک کے محاصرے کے وقت کابل کی فوج کی مہمانداری بہ جبر و اکراہ کی تھی۔ لیکن ان کے موروثی مقبوضات سے جو راولپنڈی جہلم اور شاہ پور میں واقع تھے کوئی تعرض نہیں کیا گیا صرف انہیں ان اضلاع کے سکھ صوبہ داروں کو خراج ادا کرنا پڑا۔ جنجوعوں کے ساتھ بھی یہی پیش آیا جن کی دوستانہ شرکت مہاراجہ کے والد مہان سنگھ کے ساتھ تھی۔

جب ایک قدیم راجپوت فرقہ کانگڑا' جموں اور گجرات کے پہاڑی اضلاع میں منتشر تھا۔ اس میں سے اکثر مسلمان ہو گئے تھے لیکن کانگڑے میں یہ لوگ اپنے اصلی مذہب کے پابند تھے۔ بھنگی سرداروں و نیز مہان سنگھ سکر چاکیا نے اکثر ان پر چڑھائی کی لیکن ان کا ملک بہت دشوار گزار تھا اور ان کو مغلوب کرنا مہاراجہ کے نصیب میں تھا۔ 1810ء میں سردار صاحب سنگھ سے گجرات لینے کے بعد رنجیت سنگھ نے راجہ عمر خاں چب سردار کے دو مستحکم قلعوں چونیاں اور منگھا کی طرف رخ کیا وہ اطاعت پر مجبور ہوا اور اس کی وفات کے بعد جو چند ہی ماہ کے بعد واقع ہوئی اس کے تمام مقبوضات ضبط کر لئے گئے۔

اسی سال مہاراجہ ساہیوال کے بلوچ سردار فتح خان کے مقابلے کے لئے روانہ ہوا۔ فتح خان بڑی ذی اقتدار تھا اس نے کامیابی کے ساتھ بھنگی سرداروں سے مقابلے کئے اور ان سے بہت سے مفتوحہ اضلاع واپس چھین لئے۔ مہاراجہ کے باپ نے اسے خفیف رقم بطور خراج ادا کرنے پر مجبور کیا تھا۔ 1804ء میں رنجیت سنگھ نے اس رقم میں بہت کچھ اضافہ کر دیا۔ یہ رقم باقاعدگی سے ادا نہ کی جاتی تھی۔ یہ ایک بہانہ الحاق کے لئے مل گیا اور مہاراجہ نے بڑی آمادگی سے اس سے فائدہ اٹھایا۔ 1810ء میں اس نے فتح خان پر چڑھائی کر کے یکبارگی قلعے پر قبضہ کر لیا اور فتح خان کو اپنے ہمراہ لاہور لے گیا جہاں اس کو معقول جاگیر عطا کی گئی۔ فتح خان چند سال تک تو رہا لیکن بیکاری سے تنگ آ کر وہاں سے بھاگ گیا اور ادھر ادھر پناہ ڈھونڈتا پھرا۔ بالآخر 1820ء میں بہ حالت جلاوطنی بہاولپور میں اس کا انتقال ہو گیا۔

اس طور پر یکے بعد دیگرے تمام مسلمان سردار مغلوب ہو گئے اور مہاراجہ کو سب پر فوقیت حاصل ہو گئی۔ 1820ء میں تو اس کی قوت گویا تمام پنجاب میں قطعی طور پر ستلج سے لے کر دریائے سندھ تک مستحکم ہو گئی جنوب میں انگریزوں کے زیر حفاظت ریاستیں اس کو روکے ہوئے تھیں اور شمال میں کابل کا افغان فرمانروا حق فتح اور احمد شاہ درانی اور تیمور کے نام سے شمالی ہند کی حکومت کا دعویدار تھا۔

حیدرو کی لڑائی کا ذکر اس سے پہلے کیا جا چکا ہے جس میں سکھ فوج نے وزیر فتح خان اور دوست محمد خان کو جو آخر میں امیر کابل ہو گیا اٹک کی فصیل کے نیچے شکست دی تھی۔ اس کے بعد دیوان رام دیال کی کشمیر سے پسپائی' مہاراجہ کے بربادی کے ساتھ ہزیمت کرنے اور 1819ء میں بالاخر اس صوبے کو مطیع کرنے کے واقعات پیش آئے۔ ہزارہ کے شورہ پشت مسلمان فرقوں کا مغلوب کرنا بڑا مشکل کام تھا۔ انگریزی فتوحات کے بعد بھی انہوں نے اس قدر شورشیں برپا کیں کہ اکثر فوجی مہمات ان کے مقابلے پر روانہ کرنا پڑیں۔ سکھ پہاڑی لڑائیوں کو پسند نہ کرتے تھے۔ بخلاف اس کے افغان اور یوسف زئی میدانوں کے مقابلے میں پہاڑی مقامات میں زیادہ اطمینان لڑ سکتے تھے اور ان کے حملہ کرنے کے قومی طریقے نے جنگی و پہاڑی قطعات ملک میں نشوونما پایا تھا جہاں وہ برسرپیکار رہا کرتے تھے۔ ہزارے کا صوبیدار حکما سنگھ چمنی بہادر سپاہی لیکن ظالم منتظم تھا۔ 1814ء میں وہ اٹک و ہزار کی کمان پر مقرر کیا گیا تھا جبکہ اس نے فوجی کارگزاری نمایاں طور پر انجام دے کر اٹک کے قلعے سے افغانوں کو نکال دیا تھا (جس کو افغانوں نے پھر دفعتہ" فتح کر لیا تھا)۔ اس کی خودسری اور بالخصوص اس کے ایک ذی اقتدار اور متمول سردار سید خان کے پھانسی دینے سے تمام ملک میں اشتعالک پیدا ہو گئی اور مہاراجہ 1819ء میں پھر اسے واپس طلب کرنے اور دیوان رام دیال کو اس کے بجائے مامور کرنے پر مجبور ہوا۔

نوجوان و ناعاقبت اندیش جنرل بہ معیت شیر سنگھ جو برائے نام کمیدان تھا اور فتح سنگھ اہلووالیہ پہاڑی راستے سے ہو کر گند گڑھ تک پہنچا جہاں یوسف زئی اور سوات جرگے مقابلے کے لئے مجتمع تھے دشمنوں کی تعداد سکھوں سے زیادہ تھی اور ان جرگوں کو سابق صوبیدار پر متعدد بار فتح حاصل ہونے کی وجہ سے اپنے اوپر اعتماد ہو گیا تھا۔ سورج غروب ہونے تک لڑائی جاری رہی۔ سکھ تھک کر اپنے مورچے پر واپس آ گئے دیوان رام دیال مع اپنے مختصر محافظ دستے کے سب سے آخر میدان سے واپس آیا اور دشمن نے اسے فوج سے علیحدہ دیکھ کر اس پر دھاوا کر دیا اور سخت مقابلے کے بعد اس

کو اور اس کے تمام ساتھیوں کو مار ڈالا۔ سکھوں نے جب دیکھا کہ ان کا جنرل مارا گیا تو وہ بہت پریشان ہوئے اور دوسرے روز بھاگ کھڑے ہوئے۔ واپسی میں جس قدر مواضعات ان کے راہ میں پڑے ان سب میں آگ لگاتے گئے۔ رام دیال کی موت کا فوج کو بہت صدمہ ہوا لیکن اور بہت سے قابل عہدیدار اس کی جگہ کام کرنے کے لئے موجود تھے جن میں سے ہری سنگھ نلوا اور بدھ سنگھ سندھانوالیہ مہاراجہ کا رشتے کا بھائی زیادہ ممتاز تھے۔ رام دیال کی جگہ ہزارے کی صوبیداری پر مجیٹھیا سرداروں میں سے ایک سردار امر سنگھ مامور کیا گیا۔ اس پر بھی وہی گزری جو رام دیال پر گزری تھی۔ اسے بھی اسی طریقے سے دھند اور ترین جرگوں نے ہلاک کیا کیونکہ جب ایک گھسان معرکہ آرائی کے بعد یہ اپنے محافظ دستہ فوج کے ساتھ آرام کر رہا تھا کہ اس پر یورش کی گئی اور وہ قتل ہو گیا۔

1823ء میں پشاور کا شہر اور صوبہ مہاراجہ کا باج گزار ہو گیا۔ اس وقت اس پر افغان حکمران کی جانب سے یار محمد خان مامور تھا۔ یار محمد خان کا بھائی محمد عظیم خان فتح خان کے بجائے برائے نام وزیر لیکن دراصل کابل اور شمالی افغانستان کا حکمران ہو گیا تھا۔ محمد عظیم خان اپنے بھائی پشاور کے صوبیدار سے اس وجہ سے ناراض ہو کر کہ اس نے مہاراجہ سے دوستی اور اطاعت کا معاہدہ کیا کابل سے کثیر فوج لے کر روانہ ہوا اور راستے میں یوسف زئیوں کے وحشی جرگے کو سکھوں کے خلاف جہاد پر آمادہ کیا۔ نوشہرہ کے قریب ٹھیری کے مقام پر جو اٹک اور پشاور کے درمیان میں تھا سکھوں سے اس کی مڈبھیڑ ہوئی۔ یہ ایک معرکتہ الارا مقابلہ تھا اور اس سے ہمیشہ کے لئے یہ فیصلہ ہو گیا کہ خیبر کے شمال اور شمال مغربی سرحد پر سکھوں کی حکومت رہے یا افغانوں کی۔ مہاراجہ بذات خود دریائے کابل کے بائیں جانب فوج کی کمان کرتا تھا جہاں یوسف زئی ٹھہرے ہوئے تھے۔ سکھ فدائی اکالیوں اور مسلمان غازیوں کی باہم دست بدست لڑائی ہوئی۔ اس مقابلے میں اکالیوں کو بالآخر ہزیمت نصیب ہوئی ان کا سردار پھولا سنگھ جس سے لوگ عام طور پر خائف تھے مارا گیا۔ لیکن مہاراجہ نے ان جرگوں کو بھگا دیا۔ دریا

کے. دوسری جانب سردار ہری سنگھ نلوا نے جو سکھوں کی اصل فوج کا کمیدان تھا جنرل ونٹورا' جمعدار خوشحال سنگھ اور سردار بدھ سنگھ سندھانوالیہ کے ساتھ افغان فوج کا مقابلہ کیا جو عظیم خان کے زیر کمان تھی۔ عظیم خان نے عرصے تک مقابلہ نہ کیا بلکہ پشاور کی طرف روانہ ہو کر دروں میں چلا گیا۔ مہاراجہ نے شہر کو لوٹ لیا اور اس کے بعد وہ واپس چلا گیا۔ جاتے وقت وہ یار محمد خان کو اس شرط پر صوبیدار مقرر کر گیا کہ وہ سالانہ خراج ادا کیا کرے۔

اس وقت سے ہزارہ' پشاور اور سرحدی اضلاع ہمیشہ مہاراجہ کے لئے باعث تکلیف رہے جہاں اس کو بہت کچھ مصارف برداشت کرنا پڑے۔ بارک زئی سرداروں اور غیر تربیت پذیر و مذہبی دیوانہ جرگوں سے متواتر برسر مقابلہ ہونے کی وجہ سے اس کے بہت سے بہترین عہدیدار اور فوجیں ضائع ہوئیں۔ سرحد کی طویل اور ایک ہی نوعیت کی لڑائیوں کے ذکر کی اس مختصر مسودے میں گنجائش نہیں ہے۔ اس صورتحال میں سید احمد شاہ کی وجہ سے اور بھی شدت پیدا ہو گئی۔ یہ صاحب نصیر آباد کے رہنے والے تھے جو شمال مغربی صوبے میں واقع ہے۔ سید احمد شاہ نے اپنے مذہب اور ہم مذہبوں کی دینی حمایت میں سکھوں کی مدافعت پر آمادہ ہو کر پشاور کے پہاڑی ملک میں تبدیل وطن کر کے سکونت اختیار کی۔ انہوں نے کافروں کے برخلاف جہاد کرنے کا وعظ شروع کیا۔ یہ ہندوستانی وہابی فرقے کے بانی تھے۔ اس فرقے کی وجہ سے مختلف مواقع پر حکومت ہند کو بہت کچھ پریشانیاں لاحق ہوئیں گو اس کے بہت سے افراد وفادار اور پابند قانون ہیں جو دوسرے مسلمانوں سے عبادت کی سادگی کی وجہ سے ممتاز ہیں۔ دیگر افراد جو تند خو باغی تھے اور جن میں مذہبی دیوانگی تھی ہمیشہ سرکار سے برسر مقابلہ رہے اور شورش کے زمانے میں بددلی اور تنفر پھیلانے میں ساعی رہے۔ اگرچہ ہندوستانی مسلمانوں نے سرکار انگریزی کے خلاف جہاد کو ناجائز تسلیم کیا ہے کیونکہ اس نے دوسری اسلامی حکومتوں سے زیادہ مسلمانوں کو مذہبی آزادی دے رکھی ہے لیکن 1823ء میں سکھوں کے خلاف جو جہاد ہوا تھا وہ اس سے کہیں مختلف تھا۔ مسلمانوں نے اپنے

عروج کے زمانے میں سکھوں پر بہت مظالم کیئے تھے۔ ان کے بزرگوں کو قتل اور ان کی عبادت گاہوں کو نجس کر دیا تھا۔ اب بدلے کا وقت آیا تھا اور اسلام کے پیروؤں کو گوبند سنگھ کے تابعین پامال کر رہے تھے۔

سردار ہری سنگھ نلوا ہزارے کا صوبیدار مقرر کیا گیا۔ اس کی درشتی اور مسلمانوں سے نفرت و حقارت سے پیش آنے کی وجہ سے لوگ مذہبی جوش میں آکر اکثر ہنگامہ آرائیاں کیا کرتے تھے۔ 1824ء میں دربند میں ہنگامہ برپا ہوا۔ اس کے دوسرے سال یوسف زئیوں نے سکھوں سے پانچ گنی تعداد میں جمع ہو کر اسے گھیر لیا لیکن اس نے بڑے استقلال و بہادری سے لڑ کر انہیں شکست دی۔ اس کی مدد کے لئے سردار بدھ سنگھ سندھانوالیہ جیسا کار آزمودہ سپاہی روانہ کیا گیا۔ رنجیت سنگھ اپنے رشتے کے بھائی سے مشتبہ ہو گیا تھا اور اس لئے اسے سرحد پر اس امید پر بھیج دیا تھا کہ وہاں کی مہمات سے دربار میں واپس آنا نہ نصیب ہو۔ اس کے تنزل کی بنا یہ ہوئی کہ 1825ء میں جب مہاراجہ امرتسر میں بہ مقام رام باغ بیمار پڑا تو طبیب اس کی زندگی سے بالکل مایوس ہو گئے بدھ سنگھ نے جو ایک ذی اقتدار سردار تھا اپنے بے باک اور ناعاقبت اندیش بھائی عطر سنگھ اور لہنا سنگھ کے ساتھ آئندہ خطرے کی پیش بندی کے خیال سے قلعہ گوبند گڑھ پر رات کے وقت دفعتہ" قبضہ کرنے کی کوشش کی اس کا یہ خیال صحیح تھا کہ رنجیت سنگھ کی وفات کے بعد ملک گیری کے لئے جو تنازات ہوں گے اس وقت وہی شخص فائدے میں رہے گا جو اس قلعہ پر قابض ہو گا۔ اس نے قلعے کے محافظین کو بہت سی رشوت دی اور مہاراجہ کے دستخط سے ایک جعلی حکم نامہ مرتب کیا جس میں قلعہ اس کے حوالے کیئے جانے کا حکم تحریر تھا۔ لیکن جمعدار خوشحال سنگھ کو جو قلعہ دار تھا جعل کا شبہ ہوا اور اس نے یہ جواب کہلا بھیجا کہ اگر خود مہاراجہ بھی آ جائے تو شب کے وقت قلعے کا دروازہ نہ کھولا جائے گا۔ اس طور پر اسے سازش میں ناکامیابی نصیب ہوئی۔ مہاراجہ نے صحت پانے کے بعد جب اس واقعے کو سنا تو اس نے بدھ سنگھ کو تبدیلی آب و ہوا کے لئے کچھ دنوں ہزارہ بھیجنا مناسب سمجھا۔ یہاں اس نے

نمایاں خدمات انجام دیئے۔ اکوڑہ پر اس نے سید احمد شاہ کا مقابلہ کر کے انہیں شکست دی لیکن خود اس کے پانچ سو آدمی ضائع ہوئے۔ دوسرے دن وہ جگیرا کی جانب بڑھا جہاں ڈوگرے اور اٹاری کے سردار آکر اس کے ساتھ شامل ہو گئے۔ اب کل فوج کی تعداد دس ہزار نفوس اور 12 توپیں ہو گئیں۔ ان کے مورچوں کو سید احمد شاہ کی کثیر مگر غیر تربیت یافتہ فوج نے گھیر لیا جس میں کابلی' یوسف زئی اور افغان شامل تھے۔ کچھ دن تک تو سکھ مورچوں میں دشمنوں کے متواتر حملے ہوتے رہے لیکن جب رسد ختم ہو گئی اور بدھ سنگھ کو تاب نہ رہی تو اس نے دشمنوں پر حملہ کر دیا اور سخت و خونخوار لڑائی کے بعد انہیں شکست دی۔ سید احمد شاہ نے یوسف زئی کی پہاڑیوں میں پناہ لی اور دو سال دم لینے کے بعد اس میں اس قدر سکت ہوئی کہ پھر میدان میں آیا۔

مہاراجہ اور ہری سنگھ نلوا دونوں بدھ سنگھ کی مدد کو نکل کھڑے ہوئے لیکن یہ دیکھ کر کہ اب اس کو مدد کی ضرورت باقی نہ رہی انہوں نے افغان صوبیدار کو سید احمد شاہ کو کمک دینے کی پاداش میں سزا دینے کے ارادے سے پشاور کا رخ کیا۔ شہر کو تاخت و تاراج کیا۔ بالا حصار میں آگ لگا دی گئی۔ مسجدوں کی بے ادبی کی گئی اور بہت سے اشجار جن کے لئے پشاور کی وادی مشہور تھی کاٹ ڈالے گئے۔ مہاراجہ خراج کی رقم میں اضافہ کر کے صوبیدار یار محمد خان کے فرزند کو بطور یرغمال اپنے ہمراہ لے کر واپس لاہور روانہ ہوا۔

پشاور اور سرحد میں سکھوں کے تعلق کا اظہار ان ہی متواتر لڑائیوں' حملوں اور محاصروں سے ہوتا رہا تاآنکہ 1833ء میں شاہ شجاع نے جس کا حقیقی اقتدار گو برائے نام تھا لیکن اب تک وہ بادشاہ کے لقب سے موسوم تھا ملتان' ڈیرہ جات اور پشاور رنجیت سنگھ کے حوالے کر دیئے۔ اس عطیے پر قبضہ کرنے کے لئے دغا بازی یا زبردستی سے کام کرنا ضروری تھا۔ شہزادہ نونہال سنگھ اور سردار ہری سنگھ نلوا آٹھ ہزار سپاہیوں کے ساتھ اضافہ شدہ خراج طلب کرنے کے بہانے سے شہر پر قبضہ کرنے کی غرض سے روانہ کئے گئے۔ نونہال سنگھ نے دیواروں کے دیکھنے کے بہانے سے قبضہ حاصل کر لیا۔

بارک زئی سردار خفیف مقابلے کے بعد بھاگ گئے اور سکھوں کو وہ جگہ نصیب ہو گئی جس پر عرصے سے ان کا دانت تھا۔ لیکن افغانوں نے بغیر مقابلے کے قبضہ دینا گوارا نہ کیا۔ 1835ء میں امیر دوست محمد خان نے اس ضلع پر اس ارادے سے حملہ کیا کہ اس شہر کو پھر واپس لے لیکن فقیر عزیزالدین نے جو اس غرض سے فوج کے آگے روانہ کیا گیا تھا کہ امیر کو بڑھنے سے روکے رہے ایسی کامیابی سے اس خدمت کو انجام دیا کہ سکھ فوج کثیر کے ساتھ آ پہنچے اور افغانوں کو ایسا محصور کر لیا کہ امیر کو دروں کے اس طرف بعجلت تمام فرار ہونا پڑا۔

سرحد کا مطیع کرنا سکھوں کی طاقت سے باہر تھا۔ پشاور پر قبضہ کرنے کے بعد نونہال سنگھ نے زبردستی ضلع بھر میں فوجی دورہ کیا۔ راستے بھر میں وہ آگ لگاتا' لوٹ مار کرتا اور جس قدر محاصل دستیاب ہوئے انہیں وصول کرتا گیا دیوان حاکم رائے جو 1869ء میں باغیوں کا سرغنہ تھا بنوں' ٹانک' ڈیرہ اسماعیل خان اور عیسیٰ خیل کا صوبیدار مقرر کیا گیا۔ سکھوں کو اس وحشی ملک پر حقیقی حکومت کبھی حاصل نہ ہوئی اور ان کا اقتدار قلعوں کی چار دیواریوں سے متجاوز نہ ہو سکا۔ انہیں کبھی بغیر مسلح فوج کے لگان وصول نہ ہوا۔ ہر دوسرے تیسرے سال بقایا وصول کرنے کے لئے فوج کا گزر اس ملک میں ہوا کرتا تھا۔ اس امر کی اطلاع جس طور پر ہوئی وہ بھی ایک لطیفہ ہے۔ لڑائی کے بعد 1847ء میں وزیر خزانہ راجہ دینا ناتھ نے انگریزی ریذیڈنٹ کرنل لارنس کی توجہ ٹانک کے بقایا لگان کی جانب مبذول کراتے وقت بیان کیا کہ "تقریباً دو سال کا لگان بقایا میں ہے اور اب فوج بھیجنے کا وقت آ گیا ہے۔"

سردار ہری سنگھ نلوا پشاور میں سپہ سالار کی حیثیت سے ٹھہرا رہا۔ 1836ء میں اسے جمرود میں قلعہ تعمیر کرنے کا حکم دیا گیا جس سے درہ خیبر کے دہانے کی حفاظت ہو سکے۔ یہ کام بہت جلد انجام پا گیا۔ گو یہ مستحکم نہ تھا لیکن آفریدیوں پر کافی طور پر دھاک بیٹھ گئی اور کابل سے آنے والی فوج کی روک تھام اس سے ہو گئی۔ امیر اس بات سے بہت برافروختہ ہوا اور اس کی کوہستانی سرحد پر اس طرح تعمیر کرنے سے جو چھیڑ چھاڑ کی

گئی تھی اس پر وہ آمادہ جنگ ہو گیا۔
اس نے سات ہزار سوار دو ہزار بندوقچی اور 18 توپیں جلال آباد سے اپنے فرزند محمد اکبر خاں کی سرکردگی میں روانہ کیں۔ اس کے اور تین فرزند بھی ساتھ ہو لئے اور راستے میں بیس ہزار جرگے والے شریک ہو گئے۔ اپریل 1837ء کو یہ لوگ جمرود پہنچے جہاں صرف آٹھ سو سکھ بے سامان و رسد محافظت پر مامور تھے۔ ہری سنگھ پشاور میں بخار میں مبتلا پڑا تھا اس نے کوئی نقل و حرکت نہ کی۔ چھ دن تک بڑے سکون کے ساتھ محاصرہ برقرار رہا۔ اس عرصے میں دیوار میں اس قدر سوراخ ڈال دیئے گئے کہ سواروں کا دستہ اس میں سے گزر سکتا تھا۔ ایسے وقت میں جبکہ امید بالکل منقطع ہو چکی تھی ہری سنگھ اپنی تمام فوج چھ ہزار پیادے' ایک ہزار باقاعدہ اور تین ہزار بے قاعدہ سوار ہمراہ لے کر پشاور سے بغرض امداد چل کھڑا ہوا۔
کئی دن تک تو مخالف افواج آمنے سامنے پڑاؤ ڈالے رہیں اور کسی نے لڑائی کا آغاز کرنے کی خواہش نہ کی۔ بالآخر ہری سنگھ نے لڑائی کی ٹھانی پہلے پہل تو اس کا حملہ ناقابل اندفاع ثابت ہوا اور افغانوں میں بے ترتیبی اور بھاگڑ پھیل گئی۔ لیکن جب سکھوں نے دور تک تعاقب کیا اس وقت افغان سواروں نے شمس الدین خان کی سرکردگی میں اسے گھیر لیا۔ ہری سنگھ یہ دیکھ کر کہ سخت جدوجہد کے بغیر میدان ہاتھ سے جا رہا ہے اپنے خاص خاص سرداروں کے ساتھ فوج کے آگے آ کھڑا ہوا اور اپنی موجودگی و طرز عمل سے سکھوں کی ہمت افزائی کر کے اس نے مقابلہ جاری رکھا۔ ایسی صورت میں فتح حاصل ہونے کی پوری توقع تھی لیکن ہری سنگھ کے پیٹ اور پسلیوں میں دو گولیاں ایسی لگیں جس سے وہ زخمی ہو کر گر پڑا۔ اس کے لشکر نے بددل ہو کر جمرود کی فصیل کی جانب راہ لی اور وہاں پہنچ کر امداد کا منتظر رہا جب کھانا پانی بالکل ختم اور محصورین بالکل بے دم ہو گئے تو اس وقت مدد پہنچی۔ محصورین کو اب اس کے سوا اور کوئی چارہ نہ رہا تھا کہ جس طرح سے ہو سکے دشمن کی صفیں چیر کر باہر نکل جائیں افغانوں کے حملے کی خبر جب پہلے پہل لاہور پہنچی تو ایک کثیر فوج جو شہزادہ نونہال سنگھ

کی شادی کی تقریب میں جمع ہوئی تھی بعجلت تمام شمال کی جانب روانہ کی گئی خود نونہال سنگھ اس کا باپ کھڑک سنگھ' جنرل ونٹورا' جمعدار خوشحال سنگھ اور سکھ بہادر اس فوج کے ساتھ ہو لئے اور یہ لشکر اس درجہ مہیب نظر آنے لگا کہ اس کے پشاور میں بروقت پہنچنے پر بارک زئی سردار محاصرہ اٹھا کر بغیر کسی مقابلے کے جلال آباد کی جانب چلے گئے۔

اس پریشانی و مصیبت کے زمانے میں مہاراجہ نے انگریزوں کے ساتھ اتحاد پورے طور پر قائم رکھا انگریزی حکومت خود ناقص مشورے کی بنا پر افغانستان میں اس غرض سے مداخلت کرنا چاہتی تھی کہ اس بہادر و قابل خاندان کو معزول کریں جس نے بہت زور پکڑ رکھا تھا اور اس کے بجائے سدو زئی خاندان کو جو نہایت کمزور اور اس میں کسی قسم کی انتظامی صلاحیت نہ تھی مامور کرے۔ اس سے قبل لاہور کے نامہ و پیام سے رنجیت سنگھ اور شاہ شجاع کے ساتھ جو انتظام کیا گیا۔ اس مہم کی کامیابی کے ساتھ آغاز اور اس کے انجام کے مصائب و آلام کا تفصیلی حال بیان کیا جا چکا ہے اب یہاں اس کے اعادے کی ضرورت نہیں۔ مہاراجہ کو یہ مہم بالخصوص ناگوار تھی۔ اسے یہ معلوم ہو گیا کہ اس سے مقصود یہ ہے کہ جس طرح اس سے قبل ستلج میں اس کا اقتدار محدود کیا گیا تھا اسی طرح اب سندھ و افغانستان میں محدود کر دیا جائے۔ لیکن پھر بھی اس نے سرکار انگریزی کی ان تجاویز کی تکمیل میں حتی الامکان امداد دی۔ جن کو سر ولیم میکناٹن نے مئی 1838ء میں اس کے سامنے بیان کیا تھا۔ وہ خود بھی اس مہم میں شریک ہونے پر تیار تھا بشرطیکہ اس کے سردار جنہیں انگریزوں کی اعانت بالخصوص ناگوار تھی اسے شرکت کی اجازت دیں کیونکہ اس وقت مہاراجہ کا ذاتی اقتدار بر سر انحطاط تھا اور جموں کے راجاؤں دھیان سنگھ اور گلاب سنگھ کا اقتدار لاہور کے دربار میں بر سر عروج تھا۔

موسم سرما 1838ء میں جبکہ سرکار انگریزی کا فوجی مرکز افغانی مہم کے لئے فیروز پور میں قائم ہوا اور گورنر جنرل لارڈ آکلینڈ بڑے تزک و احتشام سے لاہور میں مہاراجہ سے ملاقات کے لئے گیا تھا۔ رنجیت سنگھ پر کثرت مے نوشی' ہجوم افکار و انتشار کی وجہ

ـے فالج کا دوسرا حملہ ہوا۔ جس نے گویا اسے اس امر سے متنبہ کیا کہ اب وہ وقت آ گیا ہے کہ ہمیشہ کے لئے فتوحات سے رخصت ہو۔ فالج کے حملے کے دوسرے ہی سال اس کا انتقال ہو گیا۔ اس دورے کے بعد سے دم واپسیں تک وہ گویا ادھ موا ہو گیا تھا۔ لیکن پھر بھی وہ کاروبار انجام دینے کی کوشش کرتا رہا اور بعض اوقات فوجی پریڈ کے مواقع پر لاہور کے ثمن لرج کے نیچے کے میدان میں پالکی میں پڑ کر جایا کرتا تھا۔ سب لوگ جانتے تھے کہ اب اس کا آخری وقت ہے اور تمام طاقتور سردار جو اب تک اپنے آقا کے خوف سے ایک دوسرے کی گردن دبانے سے باز رہتے تھے اس کشمکش کے لئے آمادہ ہو رہے تھے جس کا اس کی موت کے بعد پیش آنا لازمی تھا۔

انگریز ڈاکٹر متعدد بار اس کا معالجہ کر چکے تھے۔ 1826ء میں مرے اور 1834ء میں فالج کی شکایت ہونے کے بعد مگریگر نے اس کا علاج کیا تھا۔ لیکن ان کے نسخوں سے اسے کچھ فائدہ نہ معلوم ہوا کچھ تو بیماری کے علاج پذیر نہ ہونے کی وجہ سے اور کچھ اس وجہ سے کہ اس نے شراب کی کثرت ترک نہ کی۔ بجلی کے دونوں طریقوں سے بھی اس کا علاج کیا گیا۔ مارچ 1837ء میں نونہال سنگھ کی شادی کی تقریب کے موقع پر سر ہنری فین کمانڈر انچیف انگریزی عہدیداروں کے ساتھ شریک دعوت ہوا۔ اس ملاقات سے بجائے فائدہ کے نقصان پہنچا کیونکہ مہمانداری کے خیال سے اس نے کثرت سے مے نوشی کی جس کی وجہ سے 1838ء میں اسے دوبارہ فالج کا دورہ ہوا۔ اس کی علالت کے زمانے میں فقیر عزیزالدین جو اس کا معتمد اور خاص حکیم تھا بڑی دلدہی سے مصروف علاج ہوا۔ وہ اپنے ہاتھ سے اسے دوا پلاتا اور تمام خبریں سنایا کرتا تھا۔ دوسرے مشہور اطباء بھی طلب کئے گئے لیکن گورنر جنرل نے جس ڈاکٹر کو روانہ کیا تھا اس کے زیر علاج ہونے سے اس نے قطعاً" انکار کیا۔ دوا سے اس کا علاج ناممکن تھا جس طرح یونانی حکما کے مشک' عنبر' پسے ہوئے موتی' صندل و بادام جو ہندوستانی قرابا دین کی عمدہ اور ضروری دوائیں ہیں روک تھام ہو رہی تھی اس نے اپنے اکلوتے صلبی فرزند کھڑک سنگھ کو اپنے بستر مرگ کے قریب بلا کر اس کی جانشینی کا اعلان کیا اور دھیان

سنگھ کو اس کا مدار المہام نامزد کیا یہ بہت بڑی کامیابی تھی لیکن اس روباہ فطرت کے نصیب میں اس سے متمتع ہونا نہ بدا تھا۔ ننکانہ کے پوجاریوں اور غریبوں کو جہاں پہلا گرو پیدا ہوا تھا اور ڈیرہ بابا نانک کے پروہتوں کو جہاں بابا نانک کا انتقال ہوا تھا 25 لاکھ روپے خیرات دینے کے بعد ہندوؤں اور سکھوں کی رسم کے مطابق اسے چارپائی سے اتار کر فرش پر لٹا دیا گیا اور 27 جون 1839ء کو وہ راہئی عدم ہوا۔

اس کے بعد چھ سال کی مدت فتنہ و فساد اور ہنگامہ آرائیوں میں گزری جس میں قتل کا بازار گرم رہا اور غربا نہایت بے رحمی سے پامال کئے گئے۔ خاندان کا جائز وارث کھڑک سنگھ جو نہایت بزدل اور کمزور تھا اور اس کا خوبصورت بے پروا اور اوباش فرزند نونہال سنگھ دونوں جائز وارث قتل کئے گئے اور اس کے بعد جھوٹے مدعیوں کی باری آئی۔ مہاراجہ شیر سنگھ کو جو ہمیشہ مخمور و مدہوش رہتا تھا مع اس کے فرزند کے سندھانوالیہ نے قتل کر ڈالا۔ دلیپ سنگھ کا بھی جو ایک کسبی کا بیٹا تھا بہت جلد قتل ہی انجام ہوتا لیکن قسمت نے یاوری کی اور سکھ فوج کے شکست ہو جانے سے اسے سرکار انگریزی کا دامن عاطفت نصیب ہوا جس کی مکافات اچھی نہ ہوئی۔

رنجیت سنگھ کے کشت عمل کا ثمرہ ملا۔ آباؤ اجداد نے کھٹے انگور کھائے اخلاف کے دانت کھٹے ہوئے جس مملکت کی بنیاد ظلم' دغا بازی اور خونریزی سے ہوئی وہ اپنے بانی کے بعد عرصے تک قائم نہ رہ سکی اس کی بنیاد ایک شخص کی فوجی و ملکی قابلیت اس کی جان تھی۔ اس جان کے نکلتے ہی ریزہ ریزہ ہو کے خاک ہو گئی اور خالصہ کی وراثت انگریزوں کو نصیب ہوئی۔ اگر انگریز انصاف' سخاوت اور قوت سے حکومت کریں جو اوصاف بقائے سلطنت کے لئے لازمی ہیں تو وہ دوسرے حملہ آوروں سے اسے ہمیشہ کے لئے محفوظ رکھ سکیں گے۔

حوالہ جات

1- یہ وہ مالوا نہیں ہے جو دکن میں ہے یعنی وہ زرخیز حصہ ملک جو نربدا کے شمال میں ہے

اور جس کا وسطی ملک اندور ہے۔

2- تھوڑا عرصہ پہلے انتظامی تقسیم میں توسیع کر کے مزید اضلاع شامل کر لئے گئے' لیکن اس انتظام کو قائم رکھنا آسان ہے جو الحاق کے بعد بیس سال تک رائج رہا۔

3- پنجاب کی 1881ء کی مردم شماری رپورٹ سول سروس کے مسٹر ڈینزل ایبٹ سن نے مرتب کی تھی۔ یہ کام بے پناہ صلاحیت اور شوق کا مظہر ہے' اور صوبے کی ترقی اور سماجی تاریخ کے حوالے سے بیش قیمت حقائق کا ایک خزانہ ہے۔

4- ایک تار برقی ہندوستان سے 7 فروری 1892ء سکھ آبادی کی تعداد 1891ء کی مردم شماری 19,07,836 کل نفوس تمام ملک میں بتاتی ہے۔

5- ساکھی 98 میں گرو گوبند سنگھ نے کبیر کی بہت تعریف کی ہے اور اس کے متعلق کہا ہے کہ خدا کے نزدیک ہے اور دنیاوی بادشاہوں سے اس کا درجہ بلند تر ہے۔ اس کا نام ایک مدت مدید تک دنیا میں جاری رہے گا۔

6- ڈاکٹر ٹرمپ نے لفظ خالصہ یعنی سکھ سلطنت کے نام کے اشتقاق کے متعلق دوسرے علماء سے اختلاف کیا ہے۔ ان کا خیال ہے کہ خالصہ دراصل عربی لفظ ہے۔ اور اس کے معنی کسی شخص کی ذاتی جاگیر کے ہیں۔ چنانچہ اس کا مفہوم یہ ہے کہ وہ گرو یا خدا کی ذاتی جاگیر تھی۔

7- میرے ایک دوست سردار عطر سنگھ نے جو ماوراء ستلج کے سرداروں میں ہیں اور بھدوڑ کے جاگیردار ہیں ساکھیوں کے ایک نہایت دلچسپ مجموعے کا ترجمہ شائع کیا ہے۔ ان میں گرو تیج بہادر سنگھ اور ان کے بیٹے گرو گوبند سنگھ کے دیس بہ دیس آوارہ پھرنے اور جو واقعات ان کو پیش آئے ان کا ذکر ہے۔

8- یہ تعلیم مذہب اسلام کے بالکل خلاف ہے' خداوند تعالیٰ عالم کی علت مادی نہیں ہے جو کہ اس تعلیم کا منشاء ہے بلکہ وہ مادے کا خالق ہے خدائے تعالیٰ کا ارادہ علت فاعلی ہے۔ (مترجم)

9- معاذ اللہ خدا کی ذات پاک کھیل کود سے مبرا ہے۔ (مترجم)

10- تناسخ کا عقیدہ بھی مذہب اسلام کے خلاف ہے۔ (مترجم)

11- یہ فقرہ کیسا دل آزار ہے۔ (مترجم)

12- یہ رانی راجپوت تھی اور راجہ سنسار چند کٹوچ کی ناجائز بیٹی تھی۔ غالباً ستی ایک رضاکارانہ رسم تھی کیونکہ غیور راجپوت عورتیں اپنے خاوندوں کے ساتھ جلنے کی قبیح و ناگوار رسم کی پابندی کرنے کو اپنی شرافت کا تمغہ تصور کرتی تھیں۔ جب سچیت سنگھ مہاراجہ کشمیر کے دادا کا بھائی جو بڑا خوبصورت تھا لاہور میں مارا گیا تو اس کی دس بیوائیں اور اس کے محل کی تین سو آشنائیں ستی ہو گئیں۔ بعض لاہور میں' ایک سو پچاس رام نگر میں جہاں اس کا سر لایا گیا تھا اور باقی جموں یا اپنے اپنے مکانوں میں۔

13- "دی راجاز آف دی پنجاب۔"

14- اس بارے میں صرف میری تصنیفات "دی پنجاب چیفس" اور "دی راجاز آف دی پنجاب" میں اس زمانے کے واقعات کا بالتفصیل بیان کیا گیا ہے۔ پہلی میں ستلج کے شمال کے مختلف مثلوں کے پورے واقعات رام گڑھی' بھنگی اور کنہیوں کے زیر عنوان مندرج ہیں اور اخیر میں پھلکیاں واہلو والا مثلوں کے تاریخی حالات۔

15- پنجاب میں اناج رکھنے کے بڑے بڑے ٹوکروں اور مٹی کی ناندوں کو پڑولا کہتے ہیں۔

16- رنجیت سنگھ کی تمام بیویوں اولاد جائز و ناجائز۔ اس کے فرزند' پوتے اور جانشینوں کا پورا حال "دی پنجاب چیفس" میں تحریر کیا گیا ہے۔

17- "دی پنجاب چیفس۔"

18- سفیر کی تربیت یافتہ محافظ دستہ فوج نے جس مستعدی سے اکالی ہنگامہ آراؤں کو مار بھگایا اس سے رنجیت سنگھ پر بڑا اثر پڑا۔ اس کی وجہ سے نہ صرف اس کا رجحان صلح کرنے کے لئے ہوا بلکہ اس نے مستقل ارادہ کر لیا کہ اپنی فوج کو بھی اسی طرح ترتیب دے۔

19- کرنل گارڈنر کو مرے ہوئے عرصہ ہوا۔ جب میں اس سے ملا تو وہ مہاراجہ کشمیر کا وظیفہ خوار تھا اور ہمیشہ مخمور رہتا تھا۔ اس نے مجھے اپنا مسودہ پڑھنے کے لئے دیا جس میں مہاراجہ کے آخر عمر کے حالات اور اس کے مرنے کے بعد کے واقعات تحریر تھے۔ یہ دلچسپ

تحریر جو مسٹر فریڈرک کوپر سی بی متوفی کے تفویض کی گئی تھی تلف ہو گئی۔ تاریخی لحاظ سے اس کا تلف ہونا نقصان عظیم تصور کیا جاتا ہے۔ تاہم میجر کار مائیکل سمتھ نے لاہور کے حکمران خانوادوں کے متعلق اپنی ایک کاوش میں اس سے استفادہ کیا ہے' اگرچہ اس نے اس کا اقرار نہیں کیا۔ ہو سکتا ہے ایسا کرنل گارڈنر کے بچاؤ اور مرتبے کے لئے پائے جانے والے مصلحت اندیشانہ لحاظ کی خاطر کیا گیا ہو۔

20- پنجاب کی بندوبست اراضی کی رپورٹوں میں تمدنی' مالی اور تاریخی امور کے متعلق دلچسپ معلومات کا بڑا ذخیرہ موجود ہے اور یہ رپورٹیں انگریزی عہدیداروں کی جاں فشانی و قابلیت کی عمدہ یادگاریں ہیں اور ہمیشہ رہیں گی۔ ضلع کانگڑا کے متعلق مسٹر بارنس کی اصل رپورٹ ایک بلند پایہ ادبی تصنیف ہے اور ویسی ہی اسی ضلع کی دوسری رپورٹ سر جے بی لائل کی مرتب کی ہوئی۔ پشاور کی رپورٹ مرتبہ کیپٹن جیمس قابل قدر معلومات سے مملو ہے۔ پنجاب یا ہندوستان کے دوسرے حصے میں اس بارے میں جو کوشش کی گئی ان میں سے کوئی پائیدار دلچسپی' فلسفیانہ استخراج' جاں فشانی اور ادبی لحاظ سے ہمارے بعض نوجوان سویلینوں مثلاً پرسر' تھاربرن' ایبٹ سن' ولسن اور اوبرائن وغیرہ کی مرتبہ رپورٹوں پر سبقت نہیں لے جا سکتی۔

21- یعنی اس بارے میں ذرا بھی شک نہیں کہ دیوان کی کارروائی کے جو واقعات یہاں بیان کئے گئے ہیں وہ بالکل صحیح ہیں لیکن میرا یہ خیال ہے کہ اس کے انتظام کے بارے میں میں نے اپنی کتاب میں جو واقعات اس کی اور اس کے ظالم بیٹے دیوان مولراج کی سوانح عمری کے بیان کئے ہیں زیادہ وضاحت سے کام لیا ہے۔ اس کے بیٹے کی دغا بازی دوسری سکھ جنگ کا زیادہ تر باعث ہوئی۔ مسٹر اوبرائن نے انتظامات کے جو خصوصیات بیان کئے ہیں وہ ہندوستانیوں کی نگاہ میں قابل عفو ہیں اور دیسی انتظام کی عموماً یہی حالت ہے میرا بیان ذاتی تجربے کی بنا پر ہے کیونکہ مجھے کم از کم شمالی اور وسطی ہند کے 100 ریاستوں کے انتظامات سے پوری پوری واقفیت ہے۔ دیوان ساون مل بہ ہیت مجموعی دانشمند و نیک نہاد صوبیدار تھا اور گو وہ رشوت لیتا تھا لیکن جابر نہ تھا۔ اس نے ویرانے کو عمدہ کھیتوں کی شکل میں مبدل کر

دیا۔ لوگ اب تک اس کو وقعت کے ساتھ یاد کرتے ہیں۔ اس کا بیٹا کرم نارائن بھی بہت ہردلعزیز تھا لیکن مولراج سے عموماً لوگ نفرت کرتے تھے۔ "زبان خلق کو نقارہ خدا سمجھو۔" عام طور پر یہ کہا جاتا تھا کہ ملتان میں ساون (مینہ کا مہینہ) لیہہ من کرم (نوازش) اور جھنگ میں جو مولراج کا ضلع تھا مولا (اناج برباد کرنے والا کیڑا) تھا۔

22- یہ مشہور توپ جس کے تفصیلی حالات "پنجاب چیفس" کے صفحات 88-387 میں بیان کئے گئے ہیں احمد شاہ نے 1761ء میں لاہور میں ڈھلوائی تھی' اب یہ توپ لاہور کے عجائب خانے کے روبرو رکھی ہوئی ہے۔

23- ان واقعات کے تاریخی حالات کی تصریح "دی راجاز آف دی پنجاب" کی اشاعت دوم صفحہ 83 و 130 میں کی گئی ہے۔

24- مہاراجہ کے ملتان کی لڑائیوں کے پورے حالات "سدو زئی چیفس آف ملتان" اور دیوان ساون مل کی سوانح عمریوں کے صفحات 475-489 اور "پنجاب چیفس" کے صفحات 272-285 میں اور حالات محاربہ کشمیر مندرجہ سوانح عمری محکم چند کے صفحات 551-560 میں درج ہیں۔

25- مہاراجہ رنجیت سنگھ نے مور کرافٹ سے جو ایک سیاح تھا یہ بیان کیا تھا کہ 5 سو فوج باقی بچی تھی جسے امان دی گئی۔ لیکن یہ بیان صحیح نہیں ہے حملے کے وقت قلعے میں صرف 300 سے زائد لڑنے والے نہ تھے اور ان میں سے بھی بہت سے فصیل کے شگاف میں لڑتے ہوئے مر گئے تھے۔

26- "دی پنجاب چیفس" صفحہ 487۔

27- ان فرقوں کے تفصیلی تاریخی حالات "دی پنجاب چیفس" صفحات 502 سے 606 میں درج ہیں۔

ماہنامہ نیا زمانہ

ایڈیٹر: محمد شعیب عادل

31 سیکنڈ فلور' حفیظ سنٹر' مین گلبرگ لاہور

فون : 5764674-5762601 فیکس : 5764674

☆

کتابی سلسلہ

دنیازاد

مدیر: ڈاکٹر آصف فرخی

155/B بلاک نمبر5 گلشن اقبال' کراچی

☆

ماہنامہ بدلتی دنیا کراچی

ایڈیٹر: ہدایت حسین' جوائنٹ ایڈیٹر: پروفیسر ریاض صدیقی

رابطہ آفس : 513 یونی شاپنگ سینٹر عبداللہ ہارون روڈ صدر' کراچی

☆

سنگت

چیف ایڈیٹر: عبداللہ جان جمالدینی

اسسٹنٹ ایڈیٹر: شاہ محمد مری

مری لیب- فاطمہ جناح روڈ' کوئٹہ

☆

مزدور جدوجہد

ایڈیٹر: شعیب بھٹی

جدوجہد سینٹر- 40 ایبٹ روڈ' لاہور

☆

جفاکش

ایڈیٹر: توقیر چغتائی
رمپا پلازہ۔ ایم اے جناح روڈ، کراچی

☆

عوامی منشور

چیف ایڈیٹر: طفیل عباس
ایڈیٹر: ذکی عباس
261-C/II سینٹرل کمرشل ایریا
طارق روڈ پی ای سی ایچ ایس، کراچی

☆

طبقاتی جدوجہد

ایڈیٹر: منظور احمد
105 منگل مینشن سیکنڈ فلور رائل پارک
لکشمی چوک، لاہور۔ فون: 6316214

☆

ماہانہ ادبی اخبار روداد

نگران اعزازی: ڈاکٹر انعام الحق جاوید
734- اسٹریٹ 102، G-9/4 اسلام آباد
فون: 252899

☆

فکشن ہاؤس کی شائع کردہ نئی کتابیں

کتاب	مصنف	قیمت
پاکستان: ریاست اور اس کا بحران	حمزہ علوی	230/-
تاریخ اور تحقیق	ڈاکٹر مبارک علی	180/-
تاریخ اور مورخ (ڈاکٹر کے ایم اشرف کی تحریریں)	ترتیب وتعارف: ڈاکٹر مبارک علی	100/-
عروج آدم	جے برونوسکی/منصور سعید	120/-
بھگت کبیر: فلسفہ وشاعری	تالیف: ہری اودھ	240/-
ہندو فلسفہ مذہب اور نظام معاشرت	ڈاکٹر سید حامد حسین	80/-
مہاراجہ رنجیت سنگھ	پروفیسر سیتارام کوہلی	150/-
مشرق میں 35 سال	جون مارٹن ہونگ برگ	140/-
مطالعہ تاریخ	ہنری سٹیل کومیجر	150/-
شیخ ایاز کے خطوط	ترجمہ: کرن سنگھ	120/-
بگ بینگ سے کلوننگ تک	طفیل ڈھانہ	120/-
وہائٹ ہاؤس کے مکین	سویدا حنا	250/-
پرتو نقش خیال (شاعری)	سمیع اللہ قریشی	100/-
غزل وشت سگاں (غزلیات)	خالد علیگ	100/-

فِکشن ہاؤس

18- مزنگ روڈ لاہور

ماہنامہ نوائے انسان

مدیر : شیراز راج
2- گارڈن بلاک گارڈن ٹاؤن لاہور
زیر اہتمام : ڈیموکریٹک کمیشن فار ہیومن ڈویلپمنٹ
فون : 5869042-5864926

☆

ماہنامہ سوشلسٹ کراچی

زیر ادارت : زین العابدین' ریاض احمد' محمد عامر
سرتاج خاں' محمد ندیم' امام شامل' ہارون خالد
پتہ : پی او بکس نمبر 8404 کراچی

☆

تحریر

علمی و ادبی کتابی سلسلہ
ترتیب : رفیق احمد نقش
پیشکش : ڈاکٹر محمد یوسف میمن
زیر اہتمام : 115-116 جمنا داس کالونی میرپور خاص
رابطہ کے لئے : A-87 بلاک این شمالی ناظم آباد' کراچی